

وَأَعَدُّوا لَهُمْ فِيهَا سِجِّينًا
(الانشاء) 2:8

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نبی اکرم

بجنتیت

سیرت سالار

سیرت نبویؐ کا جہادی پہلو

www.KitaboSunnat.com

تالیف:

فقیر شاہ مولانا عبدالرحمن کیلانی



مکمل سیرت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

*** توجہ فرمائیں! ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب.....

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ

لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔

متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی

نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

*** تنبیہ ***

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (الأنفال) ٦/٨

تجارتکم
پیغام
سید اللہ

www.KitaboSunnat.com

تالیف:

فضیلہ شیخ مولانا عبدالرحمن کیلانی

مکملہ اسلامیہ
سٹریٹ ۲۰ سن پتھر لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	نبی اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار
زیر سرپرستی	ڈاکٹر حبیب الرحمن کیلانی
طبع دوم	جون 2010ء
کیوزنگ	قائم گرافکس حبیب پارک منصورہ لاہور
تعداد	1100
طابع	ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمن کیلانی
	انجینئر حافظ عتیق الرحمن کیلانی
زیر اہتمام	پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی
قیمت	150/- روپے

www.KitaboSunnat.com

ناشر:

مکتبۃ السلام

کلی نمبر 20 دارالسلام دکن پورہ لاہور

فون: 37844157 - 0321-8869902

ڈسٹری بیوٹرز

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ



36۔ نوزل۔ یکونڈہ ٹھاپ۔ لاہور فون: 7240024 - 7232400 فیکس: 7354072

عزنی سٹریٹ، ارنو بازار، لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
	جہاد فی سبیل اللہ بنی نوع انسان	3	فہرست مضامین
26	کی سب سے بڑی خدمت ہے	10	پیش لفظ
28	شہید کی فضیلت	13	عرض ناشر
29	فرضیت جہاد		(پہلا باب)
33	فرضیت جہاد کا دائرہ	14	جہاد اور اس کی غرض و غایت
	(دوسرا باب)	14	(۱) انفرادی جہاد کی قسمیں
35	رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار	14	۱۔ جہاد بال نفس یا جہاد بالقلب
35	پس منظر	15	۲۔ جہاد باللسان
35	قبائل عرب کی وحشت و بربریت	16	۳۔ جہاد بالقرآن
36	قریش دشمنی کی وجوہات	17	۴۔ جہاد بالقلم
37	مدینہ کی ریاست	17	۵۔ جہاد بالمال
	(۱) جہاد کی تیاری اور آپ کی حربی	18	(۲) اجتماعی جہاد اور اس کی اہمیت
37	مہارت	18	جہاد بالسیف اور اس کی ضرورت
38	(۱) داخلی استحکام	19	طریق کار
38	۱۔ تعمیر مسجد نبوی ﷺ	19	جہاد اور قتال کا فرق
38	۲۔ رشتہ مواعظ	20	جہاد بالسیف کی فضیلت
38	۳۔ میثاق مدینہ	22	فضیلت کی وجہ
39	۴۔ حرم نبوی ﷺ کا تعین	22	جہاد بالمال کی اہمیت
40	(۲) ہمسایہ قبائل سے تعلقات	23	جہاد فی سبیل اللہ کیا ہے؟
		25	جہاد فی سبیل اللہ ایک دائمی ضرورت

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
71	(۳) جنگ اور تعلقات خارجہ	41	(۳) ملاقات جنگ سے متعلق پوری واقفیت
71	۱۔ دوستانہ تعلقات	42	(۴) طلائیہ گردی اور جاسوسی نظام
72	۲۔ معاہدات	45	(۵) عسکری تنظیم قیادت کا نظام
73	۳۔ سفارتی تعلقات	48	(۶) قیادت کا نظام
	(تیسرا باب)	49	(۷) کمانڈروں کا انتخاب
	(۱) میدان کارزار اور فوج کو	52	(۸) رازداری اور خفیہ اطلاعات
74	لڑانے کی مہارت	54	(۹) فوجی تربیت
74	۱۔ میدان جنگ کا صحیح انتخاب	56	(۱۰) فوج میں بھرتی کے قواعد
75	۲۔ صف بندی اور طریق کار	56	۱۔ مسلمان ہو
77	۳۔ جنگی نقشہ کی فوری تبدیلی	57	۲۔ مرد ہو
78	۴۔ اقدام	58	۳۔ بالغ اور سلیم العقول ہو
79	۵۔ دعا و مناجات اور نزول ملائکہ	59	۴۔ قد و قامت اور جسمانی صحت
82	(۲) دشمن کی تدابیر کو ناکام بنانا	59	۵۔ صحت مند اور اعضاء و جوارح
82	۱۔ تجارتی ناکہ بندی	60	سالم ہوں
85	۲۔ دشمن کی فوجوں میں انتشار ڈالنا	60	۶۔ والدین کی اجازت
87	۳۔ جنگی چالیں یا خدع فی الحرب	61	۷۔ تعلیم اور کردار
89	۴۔ گوریلا جنگ	61	(۱۰) فوجیوں کی جہاد میں بالواسطہ شمولیت
90	کعب بن اشرف	64	حضرت صفیہؓ کی بہادری کا کارنامہ
92	ابورافع عبد اللہ بن ابی الحقیق	64	ام غمارؓ کی بہادری کا کارنامہ
	(چوتھا باب)	64	(۱۱) آلات حرب کی مسلسل
94	ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف	65	مشقیں
		69	(۱۲) سرحدوں کی حفاظت

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
119	مقتولین کی تعداد	94	(۱) شجاعت اور بہادری
122	فتح مکہ کی سرگزشت	95	جنگ احد
126	جہاد اور دوسری جنگوں کا تقابل	96	جنگ حنین
126	مذہبی جنگیں		دشمن کا تلوار سونت کر آپ کے سر
126	۱۔ صلیبی جنگوں کے مقاصد	97	کھڑا ہونا
127	۲۔ فتح کے بعد بے دریغ کشت و خون	100	(۲) فوج سے ہمدردی اور مساوات
128	۳۔ عہد شکنی اور پاپائے روم کا کردار	101	۱۔ خندق کی کھدائی
128	۴۔ امان کے بعد قتل و غارت	102	۲۔ بھوک کی شدت
129	جنگ مہابھارت	103	۳۔ سواری میں مساوات
130	عصر حاضر کی مہذب اقوام کی جنگیں	103	۴۔ کام کاج میں شرکت
	(پانچواں باب)	105	(۳) جوہر شناسی
134	اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۱)	106	(۴) باہمی مشاورت
	(۱) جنگ کن صورتوں میں ضروری	107	مشورہ کے فائدے
134	یا جائز ہے؟	108	مشورہ اور آزادی رائے
134	۱۔ جان و مال کی حفاظت	109	حکم کے بعد مشورہ ہے نہ اجتہاد
135	۲۔ مدافعت جنگ	109	(۵) حربی فراست
135	۳۔ مظلوم مسلمانوں کی فریاد	110	۱۔ محاصرہ طائف
	۴۔ احکام شرعیہ کی تعمیل میں	111	۲۔ یشاق مدینہ
135	رکاوٹ	112	۳۔ صلح حدیبیہ (فتح یمین)
136	۵۔ عہد شکنی	113	صلح کیوں کی گئی؟
136	۶۔ دفعیہ فتنہ و فساد	115	شرائط صلح کے نتائج
137	۷۔ قتل سفراء		(۶) حصول مقصد کے لیے کم از
138	داخلی انتشار	118	کم جانی و مالی نقصان

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
	۴۔ امیر اور بنیادی حقوق کا	138	۸۔ ارتداد
154	احترام	138	۹۔ بغاوت
156	۵۔ امیر کی اطاعت	139	۱۰۔ رہزنی اور ڈکیتی
	۶۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں	140	۱۱۔ تخریب کاریا منافع
157	کے قتل کی ممانعت	142	منافقوں کی فتنہ انگیزیاں
159	۷۔ مقاتل اور غیر مقاتل		(۲) جنگ کن صورتوں میں ناجائز ہے
	۸۔ جنگ کے دوران ہر وقت مسلح	144	۱۔ دنیوی اغراض و مقاصد
159	رہنا چاہیے	144	۲۔ عہد کی پابندی
	۹۔ میدان جنگ سے فرار گناہ عظیم	144	۳۔ غیر جانبدار اقدام
160	ہے	145	۴۔ صلح کی پیش کش
161	۱۰۔ معرکہ کارزار میں نماز کی ادائیگی	145	۵۔ سیاسی پناہ یا امان
	۱۱۔ کھیتوں باغات اور درختوں کی	146	۶۔ اظہار اسلام یا کوئی علامت
162	تباہ کاری کی ممانعت		دیکھنے پر
163	۱۲۔ صبر و شہادت اور ذکر الہی	147	(۳) جنگ سے قبل
164	۱۳۔ پابندی عہد	150	۱۔ لوٹ مار اور تباہ کاری کی ممانعت
164	۱۴۔ میدان جنگ اور جزیرہ اشعار	150	۲۔ دشمن پر جنگ کی شرائط پیش کرنا
165	۱۵۔ شان و شوکت کا مظاہرہ	151	(۴) معرکہ کارزار میں
166	(چھٹا باب) اسلامی جھنڈا	153	۱۔ شہنوں کی ممانعت
167	اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۲)	153	۲۔ دشمن سے مذہبی کی آرزو نہ
	فتح کے بعد رنگ رلیوں کے بجائے		کرنی چاہیے
167	سجدہ تشکر	153	۳۔ اسلحہ بیکار نہ ضائع کیا جائے
167	اموال قیمت پر حدود و قیود	154	

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
188	۴۔ مفتوح قوم سے سلوک	168	۱۔ اموالِ غنیمت اور لوٹ مار کا فرق
188	یہود سے غزوات اور نتائج	۲۔ اموالِ غنیمت سے کچھ چھپا	
189	غزوہ بنو قینقاع	169	لینا بدترین خیانت ہے
189	۵۔ غزوہ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ	171	۳۔ ۴۔ ۵۔ سب، شمس، اموال نے
190	غزوہ بنو قریظہ، غزوہ خیبر	173	دور حاضر اور اموالِ غنیمت
192	۶۔ قوانین صلح	173	عصمت کی پاسبانی
192	پہلی، دوسری اور تیسری صورت	174	لوٹ لیاؤں کا مسئلہ
193	جزیہ اور خراج	175	فاتحین کا جوش انتقام
194	زکوٰۃ اور خراج کا فرق	176	۱۔ دشمن کی لاشوں کی بے حرمتی
194	جزیہ کی شرط کی مختلف شکلیں	177	۲۔ قتل عام
	جزیہ اور خراج کی شرح اور وصولی	177	۳۔ نذر آتش کرنا
196	میں نرمی	178	۴۔ عبادت گاہوں کی بربادی
197	مسلمان اور شکست	179	۵۔ اسیرانِ جنگ سے برتاؤ
198	مسلمانوں کی طرف سے صلح	179	۱۔ اسیر بنانے سے پہلے آزاد کر دینا
198	غیر مسلم کی اطاعت	179	۲۔ ازراہ احسان چھوڑ دیا جائے
	(ساتواں باب)	180	۳۔ فدیہ لے کر چھوڑا جائے
	اسلامی اور بین الاقوامی قوانین	181	۴۔ تبادلہ
202	جنگ کا تقابل	181	۵۔ قیدی کو غلام بنانا یا تہ تیغ کرنا
202	بین الاقوامی قانون کا آغاز	182	غلامی کا مسئلہ
203	بین الاقوامی قانون کے ماخذ		اسلام سے پہلے کے اسیر اور قتل و
	اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون	186	صبر
204	کا بنیادی فرق	187	غلامی اور مستشرقین

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
	۲۔ فنون سپہ گری سے سابقہ	204	تقابل
220	واقفیت	205	(الف) متصادم قوانین
221	۳۔ سابقہ فوج	205	جنگ کے اغراض و مقاصد
222	۴۔ مادی وسائل		جزیہ اور خراج کے بجائے اقتصادی
223	۵۔ فتح و شکست	206	تباہی
225	۶۔ جنگی تدابیر میں جدت		(ب) نظری اعتبار سے موافق
	۷۔ سپہ سالار اور فوج کے باہمی	208	قوانین
226	تعلقات	208	۱۔ ایفائے عہد اور خفیہ معاہدات
228	۸۔ کشور کشائی	212	۲۔ مہلک آلات جنگ کا استعمال
230	کشور کشائی کی وجوہ	214	۳۔ مفتوحین سے سلوک
231	۹۔ فتح کے بعد قتل و غارت	214	(ج) موافق قوانین
	۱۰۔ مفتوح علاقوں میں نظام عدل	214	۱۔ غیر مقاتل افراد کے حقوق
233	کا قیام	215	۲۔ زخمی اور بیمار افراد کی نگہداشت
237	۱۱۔ ایفائے عہد	215	۳۔ اسیران جنگ
240	۱۲۔ امان یا پناہ		(آٹھواں باب)
240	غلام کی امان و دھوکہ کی امان		رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ
241	۱۳۔ فراست یا دور اندیشی	218	سالار کیوں تھے؟
242	۱۴۔ تربیت یافتہ جانشین	218	سکندر اعظم
	(نواں باب)	219	چنگیز خان
245	چند ضمنی مباحث	220	نیپولین بونا پارٹ
	۱۔ اسلام اور بانی اسلام پر چند	220	ماہرین حرب جرنیلوں کا مقابل
245	اعتراضات کا جائزہ	220	۱۔ زندگی کا صرف ایک پہلو

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
258	انجام کار جنگ کافرق	245	۲۔ اشاعت اسلام اور تلوار
259	نتائج میں فریق	245	اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر
260	اسلام اور جنگ جوئی	246	عقل کی کسوٹی پر
261	۱۔ مشرکین اور اہل کتاب کافرق	247	تاریخی حقائق کی کسوٹی پر
262	اقامت پذیری	248	اشاعت اسلام کے اسباب
263	سابقین الاولین کی امن پسندی	248	۱۔ معاشرتی مساوات
264	جارحانہ اقدامات	250	۲۔ قانونی مساوات
265	دارالاسلام اور دارالحرب	252	۳۔ کردار کی پاکیزگی
267	پیغمبر اسلام پر اعتراضات کا جائزہ	253	۴۔ معاملات کی صفائی
267	۱۔ لوٹ مار کا سبق	254	۵۔ عفو و درگزر
268	۲۔ دوسرا اعتراض خفیہ سازشیں	255	قول فیصل
270	۳۔ تیسرا اعتراض عہد شکنی	255	اشاعت اسلام میں تلوار کا حصہ
272	غیر مسلموں کا اعتراف حقیقت		جہاد فی سبیل اللہ اور عام جنگوں
279	انسان کامل	256	میں فریق
282	کتابیات	257	۱۔ مقاصد کافرق
		258	۲۔ طریق کار میں فریق



پیش لفظ

www.KitaboSunnat.com

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ آدمی حیات مستعار ختم کر کے بھی اس سے مکمل طور پر استفادہ نہیں کر سکتا سیرت کے ان پہلوؤں میں سے ایک موضوع جہاد کا بھی ہے۔ یہ موضوع جتنا پرانا ہے اتنا ہی نیا بھی ہے۔ جتنا زیادہ اس پر لکھا جا چکا ہے اسی قدر یہ ابھی وضاحت کا محتاج ہے۔ دراصل جب تک یہ دنیا قائم ہے تب تک لوگوں کے لئے دین ہی نجات کا ضامن ہے اور جب تک اس دنیا کی احتیاج باقی ہے اس دین کو لانے والے پیغمبر کی سیرت بھی محتاج تفصیل رہے گی۔ کیونکہ اسوہ حسنہ پر چلنا ہی راہ نجات ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے انداز سے لکھتا اور اپنے انداز سے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ سیرت کا فلاں فلاں پہلو نکھر کر سامنے آنا چاہئے۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ اور اس پہلو پر کیوں قلم اٹھایا۔ اس بارے میں تو فاضل مصنف ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ مگر اتنا تو مجھے بھی علم ہے کہ فاضل مصنف کو جہاد اور مجاہدین سے خصوصی دلچسپی تھی۔ 1985ء میں پیرانہ سالی کے باجوہ ایک قافلے کے ساتھ نورستان گئے۔ جہاں توحید و سنت کی حکمرانی ہے۔ حالانکہ ان دنوں سفر اتنا آسان نہ تھا۔ کئی گھنٹوں تک سخت سردی میں پیدل بھی چلنا پڑا۔ مگر انہوں نے ذرا بھی ہمت نہ ہاری۔ اس قافلے کے امیر بھی وہ خود ہی تھے۔ اس سفر میں مجھے بھی ان کی رفاقت کی سعادت حاصل ہے۔ اس سفر کی روئیداد انہوں نے اپنی کتاب ”سفر نامہ نورستان“ میں بیان کی ہے۔

آج کل ذہنی پسماندگی اور مروجہ بیت اپنے عروج پر ہے۔ خواندگی کے نام پر فقط غلامی کا جو سبق پڑھایا جاتا ہے۔ اس نے اچھے اچھے مسلمان گھرانوں کا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ وہ گھرانے کہ بھلے وقتوں میں اہل حدیث کی علمی و عملی قیادت جن کے ہاتھ میں تھی۔ آج کل ان کی اولادیں دین سے فقط اتنا تعلق رکھتی ہیں۔ کہ بے دین ان پر دین داری کی تہمت رکھ سکیں۔ اور وہ رواداری

اور لبرٹی کا اس بری طرح پرچار کرتے ہیں کہ ان کی کمپری اور بے بسی پر محض ترس ہی دکھایا جاسکتا ہے۔

جہاد کا موضوع مستشرقین کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہے۔ یورپ کا پروپیگنڈا کچھ اس طرح کا ہے کہ خواہ مخواہ اسلام کے نام لیوا اسلام کے پھیلنے پھولنے پر شرمندہ نظر آئیں۔ نعوذ باللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رحمت للعالمین نہیں بلکہ جلاد بنا کر بھیجے گئے ہوں۔ اور ہمارا جدید ذہن صفائیاں دیتا ہے۔ نہیں جی جہاد کا وہ مطلب تو نہیں جو یورپ والے بیان کرتے ہیں بلکہ جہاد تو جہد سے نکلا ہے۔ جس کا معنی ہے انتہائی کوشش یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو پھیلانے کے لئے اپنی انتہائی کوشش کی ہے جانی و مالی ہر قسم کی قربانی دی ہے۔ بس یہی جہاد ہے۔ اگر کبھی زیادہ جہاد کا پوچھا کرنا پڑ جائے۔ تو پھر جہاد کی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔ جہاد بالنفس بالمال اور باللسان۔ ویسے بھی افضل جہاد تو جہاد بالنفس ہی ہے۔ یعنی شیطانی خواہشات کو کچلنا، من کو مارنا اصل میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ہی تربیت دیتے رہے ہیں۔ اور اگر کبھی مجبور میدان جنگ میں ہونے والے جہاد یعنی قتال کے بارے بات کرنی پڑ جائے تو پھر اس قدر مجبوریاں اور معذرتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہ جی ہم تو پھر بھی کبھی تلوار نہ اٹھاتے اگر قرآن میں حکم نہ آ جاتا۔ یہ بزدلانہ اور مرعوبانہ ذہن دراصل اپنی حالت پر مطمئن رہنا سکھاتا ہے۔ جس ذلت اور نکتہ میں آج کل کا ایک ارب مسلمان گرفتار ہے۔ اس کو کاتب تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرنا سکھاتا ہے۔ اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنے دیتا ہے۔

جہاد ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ امام ابن القیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ جہاد کے چار مراتب ہیں۔

- (۱) جہاد بالنفس۔ یعنی نفس کے خلاف جہاد۔
- (۲) جہاد الشیطان، یعنی شیطان اور شیطانی اعمال کے خلاف جہاد۔
- (۳) جہاد الکفار والنافقین، کافروں اور منافقین کے خلاف جہاد۔
- (۴) جہاد باب الظلم والمنکرات والبدعات، یعنی ہاتھ زبان اور دل کے ساتھ ظلم اور بدعات کی خلاف جہاد۔

رسول ﷺ کو تورات میں نبی الملاحم والجبہاد کہا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی مدنی زندگی ۲۷

سے زائد عز و کرامت اور تکریمات ۶۶ ہزار یا پچھتر سو تیس ہی جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا جہاد کے سبب تعلق تھا۔ اور اسلام میں اس کی اہمیت و حیثیت بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

مصنف مرحوم جو کہ مترادفات القرآن، خلافت و جمہوریت، شریعت و طریقت، آئینہ پرویزیت، الشمس والقمر بحسان جیسی شہرہ آفاق کتب کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اتنی تفصیل سے تمام شبہات اور اعتراضات پر بحث کی ہے کہ قاری کا ہر طرح سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ انہوں نے یہ کتاب اپنی وفات سے قبل لکھی۔ زندگی نے آپ کو مہلت نہ دی کہ وہ یہ کتاب خود چھپواتے۔ بہر حال یہ کتابیں ان کے لیے تاقیامت صدقہ جاریہ ہیں۔ مولانا نے مختصر وقت میں ایسی قابل قدر کتابیں لکھیں ہیں کہ دیکھ کر اور مطالعہ کے بعد عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ایک عدیم الفرصت آدمی نے جو ایک مدرسہ البنات کے منتظم بھی تھے۔ کس طرح وقت نکال کر اتنی دقیق، ضخیم اور عام فہم کتب لکھیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک تفسیر قرآن ”تیسیر القرآن“ بھی ہے جو کہ چار جلدوں میں ہے۔ اور طبع ہو کر قارئین سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ دوران مطالعہ اگر آپ کتاب میں کوئی غلطی دیکھیں تو ضرور مطلع فرمائیں۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درست کی جاسکے۔ اور کتاب کے مطالعہ کے بعد مرحوم کے لئے دعائے خیر بھی ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کتب کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ (آمین)

(السلام)

پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی

جامع مسجد الایمان، شاہ فرید آباد ملتان روڈ، لاہور



عرض ناشر

یہ کتاب محترم والد صاحب طبع کروانے کی کوششوں میں تھے کہ ان کے بارے اللہ تعالیٰ کا حکم آپہنچا اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے اسے طبع کروایا۔ کتاب چھپ گئی تو قارئین نے کئی جگہ غلطیوں کے بارے مطلع کیا۔ اب جبکہ کتاب دوبارہ چھپوانے کا مرحلہ تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ کتاب کی جدید انداز میں کمپوزنگ کروائی جائے۔ اب اس کی اغلاط بھی ممکنہ حد تک درست کر دی گئی ہیں۔ اس کا ٹائٹل بھی نیا بنوایا گیا ہے۔ اب یہ کتاب ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے امید ہے اب قارئین کو پسند آئے گی۔ آپ کی آراء و تجاویز کا انتظار رہے گا۔

(ذرا ملا)

پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی

جامع مسجد الایمان شاہ فرید آباد ملتان روڈ لاہور

محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

باب اول

جہاد اور اس کی غرض و غایت

www.KitaboSunnat.com

جہاد کا لفظ جہد ”بمعنی کوشش کرنا“ سے مشتق ہے۔ جہاد کے لغوی معنی کسی کام میں اپنی انتہائی کوشش کرنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں یہ لفظ خود کو برے کاموں سے بچنے اور دوسروں کو برے کاموں سے روکنے کے لئے سعی و تبلیغ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

برے کاموں یا ظلم و فساد سے بچنے اور دوسروں کو روکنے کی یہ کوشش انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس لحاظ سے جہاد کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی گئی ہیں:-

انفرادی جہاد کی قسمیں

انفرادی جہاد کو ہم پر امن ذریعہ تبلیغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:-

جہاد بالنفس یا جہاد بالقلب:

جہاد کا دائرہ عمل سب سے پہلے انسان کی اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ اپنی ذات کی اصلاح یا اپنی خواہشات کو احکام و رضائے الہی کے تابع بنادینے کے لئے جو کوشش کی جائے اسے جہاد بالقلب یا جہاد بالنفس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری ہے:-

﴿ اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْهَوَاۗءَ ﴾
 کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے
 خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔
 (۲۳:۲۵)

گویا احکام خداوندی کے مقابلہ میں اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے لگ جانے کو اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

(نسائی۔ کتاب العید۔ باب فضل من تکلم بالحق) کسی ظالم قوت کے سامنے سچی بات کہہ دینا افضل الجہاد ہے۔

اور یہ افضل الجہاد اس لحاظ سے ہے کہ کسی ظالم قوت کے منہ پر سچی بات کہہ کر اسے ظلم سے روکنا بڑی جرأت ایمانی کا ہی کام ہو سکتا ہے اور بسا اوقات یہ کام اپنی جان پر کھیلنے کے مترادف ہوتا ہے۔

جہاد بالقرآن:

جہاد باللسان کا طریقہ صرف یہی نہیں کہ انسان کسی کو برا کام کرتے دیکھے تو اسے روکے بلکہ یہ بھی ہے کہ شریعت کے احکام اور اوامر و نواہی سے عوام الناس کو آگاہ کرتا رہے۔ قرآن میں ہے:-

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مِنْ بَعْثِ وَعِيدٍ﴾ پس جو کوئی ہمارے (عذاب کے) وعید سے ڈرے اسے قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔ (۲۵:۵۰)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

((بَلِّغُوا عَنِّي وَ لَوْ آيَةً))۔ (بخاری کتاب بدء الخلق۔ باب ما ذكر عن اسرائيل)

خواہ تم نے مجھ سے ایک آیت ہی سیکھی ہو تو اسے بھی دوسروں تک پہنچاؤ۔

بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انفرادی جہاد پر امن ذریعہ تبلیغ خواہ کتنے ہی بہتر طریقہ سے سرانجام دیا جائے۔ جب مخاطب کے نظریات و عقائد سے ٹکراتا ہے۔ تو وہ اسے وقار کا مسئلہ بنا کر مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور مبلغ کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو کسی زندگی میں ایسے ہی مخالفین سے پالا پڑا تھا۔ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے۔ اور بالآخر انہیں اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور خود ان صحابہ کرام کی جائیدادوں پر غاصبانہ قبضہ بھی کر لیا۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر اپنے جان و مال کی حفاظت میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ گویا جب پر امن ذریعہ تبلیغ موثر ثابت نہ ہو تو تشددانہ طریقہ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جسے عرف عام میں جہاد بالسيف اور شرعی اصطلاح میں جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

جہاد بالقلم:

معاشرے میں بگاڑ اور بدکرداری کا سلسلہ صرف عملی طور پر واقع نہیں ہوا کرتا، بسا اوقات اس میں ایسے عقائد و نظریات بھی حلول کر جاتے ہیں۔ جو اسلام کے عقائد و نظریات سے یا تو مختلف ہوتے ہیں یا متضاد۔ اس صورت حال میں اہل علم اور اہل قلم حضرات کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ قلم کے ذریعہ غیر شرعی عقائد و نظریات کا دلائل و براہین کے ذریعہ ابطال پیش کر کے اسلام کی حقانیت کو ثابت کریں۔ اور اسلامی نظریات کا دفاع کر کے انہیں اس میدان میں شکست دیں۔ جہاد کی یہ قسم بھی جو جہاد بالقرآن میں شامل ہے۔ تاہم اس کا دائرہ جہاد باللسان سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں بے عملی، بدکرداری اور فساد کی عام فضا کا پیش خیمہ عموماً یہی باطل نظریات ہوا کرتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع کے لئے قرآن کریم نے کہیں تو یہ فرمایا:۔

﴿ادْفَع بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّنِيَةِ﴾ اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔ (۹۶:۲۳)

اور کہیں فرمایا:۔

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (۱۲: ۱۲۵)

(اے پیغمبر ﷺ) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے رب کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انداز تقریر و تحریر ہٹ دھرمی اور کج بخشی کے طور پر نہیں بلکہ مدافعت اور تہمیدانہ ہونا چاہئے۔ اور اپنے نظریات کو بہتر طور پر یعنی دلائل و براہین سے پیش کرنا چاہئے۔

جہاد بالمال:

یہ تو ظاہر ہے کہ جہاد بالقرآن اور بالخصوص جہاد بالقلم کے لئے بھی سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ اگر اس کام کو کاروباری ذہن کے تحت سرانجام دیا جائے تو اس کا دائرہ انتہائی محدود ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت یہ ایک پاکیزہ کاروبار تو سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے جہاد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ جہاد اسی صورت میں ہوگا جبکہ نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر اعلائے کلمۃ الحق کے لئے یہ فریضہ سرانجام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں جہاد بالنفس کا ذکر آیا

ہے تو ساتھ ہی جہاد بالمال کا ذکر بھی آیا ہے۔

اجتماعی جہاد اور اس کی اہمیت

جہاد بالسیف اور اس کی ضرورت:

پھر کبھی ایسا بھی وقت آ جاتا ہے۔ کہ معاشرہ میں بگاڑ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جہاد کی انفرادی کوششیں اس بگاڑ کو درست کرنے کے سلسلہ میں غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سمجھنے سمجھانے کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ اور بقول شاعر۔

وَفِي الشَّرِّ نَجَاتٍ حِينَ لَا يُنْجِيكَ إِحْسَانٌ

”اور جب بھلائی سے کام نہ چلے تو لڑائی کے ذریعہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ یعنی

جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔“

انسان فطرتاً جنگ جو اور لڑائی پسند پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ امن اور صلح کا خواہاں ہوتا ہے۔ اور اسلام بھی چونکہ فطری مذہب ہے لہذا اپنی اصلیت کے لحاظ سے جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے..... امن پسند اور صلح جو واقع ہوا ہے۔ مگر جب معاشرہ میں فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو تو اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ایسے سرکش لوگوں سے ٹکر لینا ہی پڑتی ہے۔ بالفاظ دیگر مسلمان کو یہ ناگوار فریضہ اس لئے سرانجام دینا پڑتا ہے کہ دنیا میں پھیلا ہوا فساد ختم ہو کر امن و آشتی کی فضا پیدا ہوا۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۱۶:۲)

تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو لیکن وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ انسان کو یا کسی دوسرے جاندار کو زخم لگانا اور اسے چیر پھاڑ کر رکھ دینا کسی درندہ صفت انسان کا کام ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی جراحی کا عمل جب ایک ڈاکٹر کسی ایسے پھوڑے پر کرتا ہے۔ جس کا زہر تمام جسم میں پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تو ڈاکٹر کی یہی چیر پھاڑ اور فاسد گوشت کو کاٹ کر جسم سے الگ پھینک دینے کا عمل شفقت رحم دلی اور ہمدردی پر محمول سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اس عمل سے مریض کی زندگی بچ جاتی ہے۔ اسلام میں ایسے ہی ناگزیر

حالات کے لئے جنگ فرض قرار دی گئی ہے۔

اس کی دوسری مثال یوں سمجھیے کہ ہر ملک میں فتنہ اور قتل و غارت کو ختم کرنے کے لئے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ یہ عدالتیں مجرموں کو قتل، قید، جرمانہ، بدنی سزا، غرض ہر طرح کی سزائیں دیتی ہیں۔ گویا وہ مجرموں کو اس لئے قتل کرتی ہیں کہ ملک سے قتل و غارت ختم ہو۔ عدالتوں کے اس طرز عمل کو ظلم نہیں بلکہ عدل کا نام دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کا یا عدالت کا یہ طرز عمل بہر حال انفرادی قسم کے فتنہ اور ظلم کا علاج تو ہے مگر پورے معاشرہ کے بگاڑ کا علاج عدالتوں کے بس کا روگ نہیں۔ اندریں صورت حال فتنہ و فساد کے خاتمہ کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ فتنہ و فساد کے اساطین کو قوت سے کچل دیا جائے۔ قرآن حکیم نے اس فتنہ و فساد کا یہی علاج تجویز فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے۔ (۱۹۳:۲)

اور اسی ناگزیر ضرورت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے

فرمایا:-

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيَّ الْقِتَالِ﴾ (۶۵:۸)

طریق کار:

اندریں صورت ایک مصلح کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے پیش نظر اپنے ساتھ معاشرہ میں سے ان افراد کو اپنے ساتھ ملاتا ہے جو عقائد و نظریات میں اس سے متفق ہوتے ہیں۔ پھر یہ جماعت اجتماعی شکل میں باطل قوتوں سے بھڑ جاتی ہے۔ ایسی جنگ اگر دنیوی اغراض و مقاصد کے تحت لڑی جائے تو اسے قتال یا جنگ کہتے ہیں۔ اور اگر اس سے مقصد دنیا سے فتنہ و فساد کو ختم کرنا ہو۔ جسے شرعی زبان میں اعلیٰ کلمتہ الحق یا ”اللہ تعالیٰ کے حکم کا بول بالا کرنا“ کہتے ہیں۔ تو اسے جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔

جہاد اور قتال کا فرق:

مندرجہ بالا تصریحات سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) جہاد فی سبیل اللہ کی بہت سی اقسام پر انفرادی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اس میں دماغی و جسمی حصہ لیتا رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا ایمان ہی مشکوک ہوتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ صرف اجتماعی شکل میں ہوتا ہے۔

(۲) جہاد فی سبیل اللہ وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ اس کی ایک آخری شکل ہے اور محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم نے بھی ان دونوں الفاظ کو الگ الگ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

(۳) ”جہاد“ صرف فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ قتال فی سبیل اللہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور دنیوی اغراض و مقاصد کے ماتحت بھی۔ قتال دنیوی اغراض کے ماتحت ہو تو اس صورت میں یہ قتال فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔ خواہ لڑنے والے دونوں فریق مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔

جہاد بالسیف کی فضیلت:

گو جہاد کی سب اقسام اپنے اپنے مقام پر بنیادی اہمیت کی حامل ہیں تاہم جو فضیلت جہاد بالسیف کو حاصل ہے وہ دوسری کسی قسم کو نہیں۔ کیونکہ اس میں انسان کو جان، مال اور وقت ہر چیز کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ مزید برآں عسکری تنظیم اس کے نتائج کو مفید ترین بنانے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:-

((جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھنے والے ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے وہ اور جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مال اور جان سے جہاد والوں کو بیٹھنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجے میں فضیلت بخشی ہے اور گونیک وعدہ سب کے لئے لیکن اجر عظیم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔))

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرَ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً، وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۹۵:۴)

آیت بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

- (۱) جہاد کی تمام تر انفرادی کوششیں ”قاعدین“ کے زمرہ میں آتی ہیں۔
- (۲) ان انفرادی کوششیں کرنے والوں (قاعدین) اور قتال فی سبیل اللہ میں جان و مال سے حصہ لینے والوں (مجاہدین) سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے اچھا وعدہ کر رکھا ہے۔
- (۳) تاہم مجاہدین کو ان کے اجر عظیم کی وجہ سے قاعدین پر کہیں زیادہ فضیلت ہے اور یہی بات

اس ایک آیت میں تین بار دہرائی گئی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ؟ (رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ”لوگوں
فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: میں کون شخص سب سے افضل ہے۔ آپ
”مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِنَفْسِهِ نے فرمایا ”وہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں
وَمَالِهِ“))

(بخاری کتاب الجہاد والسیر - باب افضل الناس

مومن يجاهد بنفسه و ماله في سبيل الله)

ایک دوسرے مقام پر حضور اکرم ﷺ نے اپنی ذات سے متعلق فرمایا:-

((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي أَقْتُلُ (قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھوں
فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أَحْيَا ثُمَّ أَقْتُلُ ثُمَّ أَحْيَا میں میری جان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ
ثُمَّ أَقْتُلُ ثُمَّ أَحْيَا ثُمَّ أَقْتُلُ -)) (بخاری کی راہ میں مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں
کتاب الجہاد والسیر - باب معنى الشهادة) پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا
جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں۔)

مندرجہ بالا حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے تین بار شہادت کی آرزو کو دہرا کر سب اعمال پر اس کی فضیلت کا مکمل ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا:-

((وَأَعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلِّ الشُّوْفِ ﴿﴾ (لوگو! جان رکھو کہ بہشت تلواروں کے
سائے تلے ہے۔))

(السیر - باب الجنة تحت بارقة السيف)

اس حدیث میں جہاد اور بہشت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو کوئی جہاد کرے

گا ضرور بہشت میں جائے گا۔ آج کے دور میں تلوار سے مراد ہر وہ اسلحہ لیا جائے گا جو موجودہ جنگوں میں استعمال ہوتا ہے۔

جہاد بالسیف کی فضیلت کی وجہ:

ہر ذی حیات میں ”تحفظ خویش“ کا جذبہ فطری طور پر ودیعت کیا گیا ہے۔ گویا جان ہی وہ متاع عزیز ہے جسے انسان اور اسی طرح ہر حیوان ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تو جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتا اس کی نجات اور جنت کے حصول میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

جہاد بالمال کی اہمیت:

جان سے دوسرے درجہ پر مال کی باری آتی ہے۔ مال ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی ذات کے لئے سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ اور بسا اوقات مال اس کی جان کے تحفظ کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے پھر کچھ لوگ حصول زر کے معاملہ میں ایسے حریص واقع ہوتے ہیں کہ وہ اس کے لئے اپنی جان تک نثار کر دیتے ہیں۔ گویا انسان کے لئے سب سے قیمتی متاع یہی دو چیزیں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کا مسلمان سے مطالبہ کیا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں تو ”جان“ کا لفظ ”مال“ سے پہلے استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ
وَأَمْوَالَهُمْ بِأَن لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۱۱۱:۹)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں۔ اور اس کے عوض ان کے لئے بہشت تیار کی ہے۔

اور بہت سے مقامات پر مال کا لفظ جان سے بھی پہلے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر ”جہاد بالسیف کی فضیلت“ کے عنوان کے تحت درج شدہ آیت میں دو بار مال کا لفظ نفس سے پہلے استعمال ہوا ہے۔ نیز قرآن کریم میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

مال کا لفظ جان سے بھی پہلے استعمال کرنے کی بھی چند وجوہ درج ذیل ہیں:-

(۱) بعض لوگوں کے نزدیک جان کی قیمت مال سے کم تر ہوتی ہے۔ اور وہ حصول زر کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔

(۲) مال سے جہاد ہر وقت اور کئی صورتوں میں ہو سکتا ہے جس کی تفصیل اوپر نثر چکی۔ جبکہ

جان کا جہاد صرف قتال فی سبیل اللہ کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ جو امام وقت کے اعلان اور اس کی ماتحتی میں ہی ہو سکتا ہے۔

(۳) اللہ کی راہ میں اپنی جان پیش کر دینا بھی (جو دراصل جہاد بانفس یا اصلاح خویش ہی کی آخری اور ترقی یافتہ شکل ہے) مال کی قربانی کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا۔ اسلحہ کے حصول اور زاد سفر کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر قتال فی سبیل اللہ کا تصور ناممکن ہے۔

(۴) بعض مجبور اور معذور لوگ جہاد بالسیف میں عملاً حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن وہ مالی تعاون کر سکتے ہیں پھر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان تو پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن مالی ضروریات کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور مالی تعاون کرنے والوں کی امداد اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا مالی تعاون بھی جہاد میں بالفضل شامل ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

((مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَقَدْ غَزَا
مَنْ خَلَّفَ غَازِيًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِخَبْرٍ فَقَدْ
غَزَا)) (بخاری، کتاب الجہاد والسیر - باب
فضل من جهز غازیاً)
جو کوئی جہاد کے لئے کسی غازی کو سامان مہیا کرے تو گویا اس نے خود جہاد کیا (اسے اتنا ہی ثواب ملے گا) اور جس نے غازی کے گھر کی اس کے بعد خبر رکھی اس نے بھی گویا خود جہاد کیا۔

انہی وجوہات کی بنا پر قرآن کریم اور احادیث میں جہاں کہیں بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر آیا ہے۔ تو جان و مال کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہی چیزیں انسان کے نزدیک سب سے قیمتی متاع ہیں۔ لہذا جہاد بالسیف کی باقی تمام اعمال پر فضیلت ثابت ہو جاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کیا ہے؟

گو جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ قتال فی سبیل اللہ سے زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم اور احادیث میں بیشتر مقامات پر جہاد فی سبیل اللہ سے اس کی سب سے اہم قسم قتال فی سبیل اللہ ہی مراد لی گئی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت و احادیث سے بھی واضح ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کی تعریف کیا ہے؟ یہی بات آپ ﷺ

سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھی تھی جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے:-

((جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرَى مَكَانَهُ فَمَنْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِيَكُونَ كَلِمَةَ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ)) (بخاری کتاب الجہاد و السیر - باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا)

(ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ: کوئی لوٹ کے لئے لڑتا ہے، کوئی ناموری کے لئے اور کوئی اپنی بہادری جتانے کو لڑتا ہے۔ تو ان میں کون اللہ کی راہ میں لڑتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اس نیت سے لڑے کہ اس سے اللہ کا بول بالا ہو وہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عوام الناس میں لڑائی میں شرکت کے لئے مندرجہ ذیل تین قسم کے محرکات ہوتے ہیں:-

(۱) بعض لوگ اس لئے لڑتے ہیں کہ لوٹ مار سے مال ہاتھ آئے گا۔ اموال غنیمت یا دوسرے دنیوی مفادات حاصل ہوں گے۔

(۲) کچھ اس وجہ سے لڑتے ہیں۔ کہ ان کا نام تاریخ میں ثبت ہوگا۔

(۳) اور کچھ اس لئے کہ لوگ ان کے بہادری کے کارنامے فخریہ طور پر بیان کیا کریں گے۔ مندرجہ بالا حدیث کے راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہی سے ایک دوسری روایت یوں ہے:-

((جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ؟ وَإِنْ أَحَدُنَا يُقَاتِلُ غَضَبًا وَ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسُهُ فَقَالَ: "مَنْ قَتَلَ لِيَكُونَ كَلِمَةَ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ.")) (مسلم- کتاب الجہاد - باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا)

(ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ ہم میں سے کوئی شخص جوش غضب میں لڑتا ہے اور کوئی حمیت قوی کی بنا پر"۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ "جو شخص اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے لڑتا ہے

اسی کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے۔")

اس حدیث سے لڑائی کے دو اور محرک سامنے آئے:-

(۱) کچھ لوگ اپنے کسی خون یا پہلی شکست کا بدلہ لینے کے لئے انتقام کے طور پر لڑتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اپنے وطن، قوم یا قبیلہ کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں بھی انسان کی ذہنی سطح اس مقام سے ذرہ بھر بھی بلند نہیں ہو سکی۔ صرف انداز و اطوار ہی بدلے ہیں۔ مقاصد میں انہی مندوبہ بالا باتوں میں سے کوئی ایک بات نظر آئے گی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ان سب مقاصد کے علاوہ ایک بالاتر مقصد کا پتہ دیا اور فرمایا۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ صرف وہ کہلا سکتا ہے جو محض اعلائے کلمتہ الحق یا اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑا جائے۔ بالفاظ دیگر دنیا سے فتنہ و فساد ختم کر کے اسے احکام و فرامین الہی کے سامنے جھکا دینے کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے جس میں انسان کی اپنی کسی ذاتی خواہش کا ذرہ بھر بھی دخل نہ ہونا چاہئے۔

جنگ کے متعلق یہ تصور دنیا بھر کے لئے ایک انوکھا تصور تھا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ابتدا میں اس تصور جہاد پر بہت متعجب ہوئے۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر پوچھا۔ یا رسول اللہ! جو شخص مالی فائدے یا ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے اسے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”الاشیء اءلء۔“ یعنی ایسے شخص کو کچھ نہیں ملے گا۔“ سائل اس سوال پر بہت متعجب ہوا۔ آ کر دوبارہ یہی سوال کیا۔ حضور نے دوبارہ یہی جواب دیا۔ اس کا اطمینان اب بھی نہ ہوا۔ سہ بارہ اور چوبارہ پلٹ کر آیا اور یہی سوال کرتا رہا۔ حضور ﷺ نے اس کے تعجب کی وجہ کو بھانپ کر فرمایا:-

((إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا وَابْتِغَىٰ بِهِ وَجْهَهُ -)) (نسائی۔ تک وہ خاص اس کی خوشنودی اور رضا کے کتاب الجہاد و سباب من غزا بليتس الاجر) لئے نہ کیا جائے۔)

جہاد فی سبیل اللہ ایک دائمی ضرورت:

جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ امن کے ساتھ جنگ کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ جہاں کہیں انسانوں کے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

پھر یہ سلسلہ قبائل اور ملکوں تک وسیع ہوتا ہے۔ کوئی نسلی تباہی بنا پر جنگ میں کود پڑتا ہے۔ کوئی ہوس ملک گیری کی تسکین کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اور کسی کو فاتح اعظم بننے کی خواہش اس میدان میں لے آتی ہے۔ بہر حال یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اور اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

بعینہ یہی صورتحال حق و باطل کی آویزش کی بھی ہے۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی شیطان کی ان سے ٹھن گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اور آئندہ یہ سلسلہ لگا تار جاری رہا تا آنکہ حضور اکرم ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی۔ دوسری طرف شیطان اور اس کی ذریت اسی وقت سے آدمؑ اور اس کی اولاد کو حق سے بہکا دینے میں پوری قوت سے سرگرم عمل ہے۔ اور یہ آویزش آج تک جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ لہذا جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت بھی تا ابد باقی رہے گی اگرچہ انبیاء کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((لَا هَجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَ نِيَّةٌ وَإِنْ اسْتَفْرَطُمْ فَأَنْفِرُوا)) (بخاری)

کتاب الجهاد والسير - باب فضل الجهاد

اس کی نیت رکھنا باقی ہے۔ تو جب تمہیں (جہاد کے لئے) بلایا جائے تو نکل کھڑے ہو۔ (والسير)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ آج قتال فی سبیل اللہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ انسان کی ذہنی سطح کافی بلند ہو چکی ہے۔ لہذا جہاد بالقلم کے ذریعہ ذہنی تبدیلی لانے سے ہی فتنہ و فساد کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ ہم اس خیال سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتے اور نہ ہی سردست اس بحث میں الجھنا چاہتے ہیں۔ البتہ قارئین کی توجہ اس بات کی طرف ضرور مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ کہ حدیث بالا میں استغفرتم اور فانفروا کے الفاظ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ قتال فی سبیل اللہ بھی جہاد کی دوسری اقسام کی طرح باقی رہے گا اور اسے رہنا بھی چاہئے۔

جہاد فی سبیل اللہ نبی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاد فی سبیل اللہ کی ضرورت اور غرض و غایت کو بہت سے مقامات پر واضح طور پر بیان فرمایا۔

مثلاً ایک جگہ فرمایا:-

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمُ بَعْضٍ
لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ﴾ - ﴿٢٥١:٢﴾

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:-

﴿إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَ
فَسَادٌ كَبِيرٌ﴾ - ﴿٤٣:٨﴾

اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد مچے گا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:-

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمُ بَعْضٍ
لَهَدَمْتُ صَوَامِعَ وَبِيَعَ وَصَلَوَاتٍ وَ
مَسَاجِدٍ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا
وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ﴾ - ﴿٢٠:٢٢﴾

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو (راہبوں کے) صوامع، (عیسائیوں کے) گرجے، (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مساجد جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ گرائی جا چکی ہوتیں۔ اور اللہ اس کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ یہ بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی قوم ظلم و فساد میں تبادلاً کر جاتی ہے تو اللہ اس پر کسی دوسری قوم کو مسلط کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی اور شریف لوگوں کی زندگی وبال جان بن جاتی، مسجدیں اور دوسرے عبادت خانے مسمار کر دیئے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے کمزور بندوں پر مسلسل ظلم و ستم ڈھائے جاتے رہیں۔ ان کے امن و چین پر ڈاکے پڑتے رہیں۔ طاقتور کمزوروں کو کھجا جائیں۔ ظلم و بے انصافی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم رہے۔ لہذا جو لوگ اس اجتماعی فتنہ و فساد کے خلاف، اپنی کسی ذاتی غرض و لالچ کے بغیر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہی لوگ دراصل انسانیت کے سب سے بڑے محسن سمجھے جاتے ہیں۔

نبوت سے پہلے بھی حضور اکرم ﷺ کی طبیعت میں یہ بات داخل تھی کہ کسی شخص پر ظلم ہوتے دیکھ کر برداشت نہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی نبوت سے چند سال پہلے 'حرب بنی نضیر' کے بعد چند درمند اشخاص یعنی ہاشم زہرہ اور تیم عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے۔ ان میں یہ معاہدہ ہوا کہ مکہ میں کسی مظلوم کو پائیں گے تو اسکی مدد کے لئے کھڑے ہوں گے۔ خواہ وہ مظلوم مکہ کا باشندہ ہو یا باہر کا۔ جس نے بھی ظلم کیا اس کا مقابلہ کریں گے یہاں تک کہ ظالم مظلوم کا حق لوٹا دے۔ (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۱)

شہید کی فضیلت:

جو مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتا ہے اس کے

متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

(جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جا رہے ہیں۔)

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (۱۶۹:۳)

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:-

(جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اور لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔)

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (۱۵۳:۲)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شہید کا پہلا قطرہ خون کرنے کے ساتھ اس کے گناہ

معاف کر دیئے جاتے ہیں اور وہ سیدھا جنت میں پہنچ جاتا ہے۔

ایک دفعہ جنگ کے دوران ایک شخص رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے لگا۔ اگر میں اللہ کی راہ

میں مارا جاؤں تو سیدھا جنت میں جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”بلا شک“ وہ کھجوریں کھا رہا تھا۔ اس نے کھجوریں پھینک دیں اور کہنے لگا اب میں کھجوریں بھی جنت میں ہی جا کر کھاؤں گا۔ یہ کہا اور لڑتے لڑتے اللہ کی راہ میں جان دے دی۔

(بخاری کتاب المغازی۔ باب غزوة احد۔ مسلم کتاب الجہاد۔ باب ثبوت العنة للشہید)

شہید کا خون قوم کی زندگی کے لئے آب حیات ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ خالصتاً اللہ کی

خوشنودی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہو تو پھر اس کے مرتبہ و مقام کے کیا ہی کہنے۔ مگر جب اس شہادت جیسے عمل میں بھی کوئی اور غرض شامل ہو جائے تو قوم کے لئے تو شاید آب حیات ثابت ہو مگر اللہ کے ہاں اس کی کچھ فضیلت نہیں صحیح مسلم میں مروی ہے کہ:-

(یقینہ پچھلا صفحہ) جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! ”میں ابن جدعان کے گھر جس حلف میں

شریک ہوا مجھے یہ پسند نہیں کہ سرخ اونٹ کے بدلے اس سے دستبردار ہو جاؤں۔“ (حوالہ ایضاً)

آپ ﷺ نے فرمایا کرتے تھے کہ میں اس معاہدہ میں شریک ہوا تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ اگر آج بھی مجھے کوئی ایسے معاہدہ میں شریک ہونے کو کہے تو میں تیار ہوں۔

قیامت کے دن تین شخص شہید، عالم اور سخی پیش کیے جائیں گے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ شہید سے پوچھیں گے کہ ”ہتاؤ میں نے تمہیں زندگی، صحت اور طاقت دی تھی تم نے میرے لئے یعنی دین کی سر بلندی کے لئے کیا کام کیا؟“ وہ کہے گا: ”الہی! میں نے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی جان کو تیری راہ میں قربان کر دیا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تم اس لئے شہید ہوئے تھے کہ لوگ تمہیں بہادر کہیں اور تمہیں ناموری حاصل ہو وہ ناموری تمہیں حاصل ہو چکی، اب میرے پاس تمہارے لئے کوئی اجر نہیں۔“

اسی طرح کے سوال و جواب عالم اور سخی سے بھی ہوں گے۔

(مسلم کتاب الجہاد - باب من قاتل للریاء و السمعة)

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ قومی مفادات پر جان دینے والے، ناموری اور شہرت کی ہوس میں مرنے والے، قوم و وطن یا نسل و قبیلہ پر جان نثار کرنے والے پر لفظ شہید کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شہید صرف وہ ہے جو تمام دنیوی اغراض سے بالاتر ہو کر فتنہ و فساد کو ختم کرنے اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام حیات قائم کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا ہدیہ پیش کرتا ہے۔ یہ خلوص جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر اس کی فضیلت زیادہ اور درجات بلند ہوں گے جن میں کم سے کم درجہ عذاب دوزخ سے نجات اور جنت میں داخل ہونا ہے۔

فریضیت جہاد:

جہاد فی سبیل اللہ کے فرض ہونے میں تو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ آسان الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ جہاد آیا امت کے ہر فرد پر لازم ہے یا کچھ افراد کے جہاد میں حصہ لینے سے ساری امت اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتی ہے؟

جہاد کے متعلق قرآن و حدیث میں جس قدر تاکید آئی ہے اسے دیکھ کر کئی علمائے متقدمین و متاخرین نے اسے فرض عین قرار دیا اور بعض اسے اسلام کا چھٹا رکن بھی قرار دیتے ہیں۔ جہاد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم اور آج کے دور انحطاط میں جبکہ مسلمان دنیا میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہے اس کی اہمیت اور پروپیگنڈا پر جتنا زور اور قوت آپ چاہیں صرف کیجئے لیکن حقیقت بہر حال

جہاد اور اس کی غرض و غایت

حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاد کو نہ تو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فرض عین۔ اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:-

(۱) رسول ﷺ نے فرمایا:-

((بِنِي الْإِسْلَامِ عَلَى خَمْسَةٍ)) ((مسلم۔ (اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔)

کتاب الایمان۔ بیان ارکان الاسلام)

اگر جہاد اسلام کا چھٹا رکن ہو تو آپ اس کی تصریح فرمادیتے۔

(۲) اسلام کے ارکان کا اجتماعیت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ تاہم وہ مخصوص حالات میں انفرادی

طور پر بھی بجالائے جاسکتے ہیں۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ (یعنی جہاد بالسیف) ایک ایسا فریضہ ہے جس کا اجتماعیت کے بغیر تصور ہی ممکن نہیں۔ جہاد صرف امام کے تحت ہو سکتا ہے انفرادی طور پر بجائیں لایا جاسکتا۔

(۳) جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت کی ایک شرط والدین کی اجازت بھی ہے (جیسا کہ آئندہ

تفصیل آئے گی) والدین بوڑھے اور خدمت کے محتاج ہوں تو اولاد کا یہی جہاد ہے کہ وہ ان کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ مالی کمزوری بھی جہاد کی فرضیت کو ساقط کر دیتی ہے۔ بوڑھے، بچے، معذور، بیمار اور عورت کو جہاد کی ذمہ داری سے ویسے ہی سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہو سکتا۔

(۴) کسی ماہر حرب کا مقولہ ہے کہ ایک شخص کو محاذ پر بھیجنے میں آٹھ مختلف قسم کے آدمیوں کا حصہ

ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسلحہ تیار کرتے ہیں، کچھ لباس اور خوراک مہیا کرتے ہیں اور کچھ مالی تعاون کرتے ہیں، پھر جتنی فوج محاذ پر روانہ کی گئی ہو اس کے لگ بھگ وطن میں موجود رہنا بھی ضروری ہے تاکہ مرکز کمزور ہو کر دشمن کی نظروں میں نہ آجائے۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امت کے وہ افراد جو فی الواقع لڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ بھی پورے کے پورے جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً﴾ اور مومنوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ سب کے

سب نکل کھڑے ہوں۔

(۱۴۴:۹)

اب ہم دوسری طرف آتے ہیں جس طرح بعض علماء و فقہاء نے جہاد کو اس کے اصل مقام سے بڑھا کر اسے اسلام کا چھٹا رکن اور فرض عین قرار دینے کی کوشش کی ہے اسی طرح کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو تفریط کی طرف چلے گئے اور انہوں نے جہاد کے درجہ کو اتنا پست کیا کہ جہاد بالسیف کی فرضیت کو ہی ختم کر ڈالا۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اگر جہاد کا وسیع مفہوم یعنی ”سعی بلیغ“ پیش نظر رکھا جائے تو اس سے لازماً رزم و پیکار کے معنی نہیں نکلتے اس لئے کہ اللہ کی راہ میں سعی بلیغ پر امن ذرائع سے بھی ہو سکتی ہے اور تلوار کے ذریعہ بھی۔ دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ کس دور میں میں کونسا ذریعہ زیادہ موثر ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور نبوت کا بیشتر حصہ اس پر امن ذریعہ تبلیغ میں صرف کیا تھا، آج کا دور پروپیگنڈا کا دور ہے لہذا مسلمانوں کو تمام تر توجہ اس پہلو پر صرف کرنی چاہئے۔ ہمیں ان حضرات سے قطعاً اتفاق نہیں کیونکہ:-

(۱) دور نبوی میں بھی پروپیگنڈا کا ایک موثر ذریعہ موجود تھا۔ آج پروپیگنڈا کے ذرائع اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹی وی ہیں، اس دور میں پروپیگنڈا کے وسائل گھوم پھر کر آگ لگا دینے والے شاعر اور خطیب ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے فی الواقع دور نبوت کا بیشتر حصہ پر امن تبلیغ میں نہیں بلکہ ظلم و ستم برداشت کر کے تبلیغ کرنے میں صرف کیا۔ آپ خود بھی فتح العرب و الحکم تھے اور آپ ﷺ کو ایسے ساتھی بھی میسر آ گئے تھے لیکن ان سب باتوں اور مراحل کے بعد بھی تلوار کے ذریعہ تبلیغ کی ضرورت باقی رہی۔

(۲) قرآن کریم اور احادیث میں جہاد کی اہمیت و فرضیت پر جتنا زور دیا گیا ہے ان کی موجودگی میں ایک سلیم العقل انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جہاد بالسیف کسی وقت ساقط بھی ہو سکتا ہے اور کئی احادیث صحیحہ میں یہ وضاحت بھی موجود ہے جہاد تا قیامت باقی ہے جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

ہمارے خیال میں جہاد بالسیف سے فرار کا ذہن مسلمانوں کے دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ غلامی کا طویل دور انسان میں جنم اور بزودی پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا اب اسے جہاد سے نفرت ہونے لگی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال کر لائے۔ پھر جہاد کیلئے کہا تو ان میں بزودی اس قدر گھر کر چکی تھی کہ کہنے لگے: ”موسیٰ! وہاں کے لوگ بڑے طاقتور

ہیں۔ ہم کیسے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تم اور تمہارا خدا جا کر ان سے لڑو ہم تو بس یہیں بیٹھیں گے۔“۔ بعینہ یہی ذہنی کیفیت ہمارے ان دوستوں کی ہے۔

جہاد بالسیف سے ان لوگوں کے انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستشرقین نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا تھا تو ہمارے مغرب زدہ دوستوں نے معذرت خواہانہ روش اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور آئندہ کے لئے جہاد بالسیف کا نام لینے سے بھی کانوں کو ہاتھ لگایا۔

ہندوستان میں انگریز مسلمانوں کی جہاد کی تحریک سے بہت خائف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک تو مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیا جائے دوسرے ان سے جہاد کی روح کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے۔ انہیں ایام میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نیا نیا نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے نبی کی ذات میں انگریز کو اپنی آرزو پوری ہوتی نظر آنے لگی چنانچہ انگریز نے مرزائیوں پر اپنی نوازشات کی بارش کر دی۔ مرزائیوں کو حکومت میں اعلیٰ مناصب عطا کئے گئے اور انہیں ہر طرح کی مراعات دیں جن کے خود مرزا غلام احمد دل و جان سے معترف تھے۔ مرزا صاحب نے انگریز بہادر کی نوازشات کا حق یوں ادا کیا کہ ایک تو دوسرے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر تفرقہ بازی اور انتشار کا سبب بنا دیا دوسرے جہاد جس کی فضیلت و اہمیت سے کتاب و سنت بھرے پڑے ہیں اس کو منسوخ قرار دیتے ہوئے یوں فتویٰ دیا کہ:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال اب آ گیا مسیح جو دیں کا امام ہے دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد کیوں چھوڑتے ہو لوگو نبی کی حدیث کو جو چھوڑتا ہے چھوڑ دو تم اس خبیث کو (درمیں ص ۵۳)

اس طرح اس قادیانی کی وساطت سے انگریز کے تو دونوں مقاصد پورے ہو گئے۔ مگر امت مرحومہ کے اذہان سے جہاد کی رہی اہمیت کو ختم کر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا۔

جو قوم پستی کے اس مقام پر پہنچ چکی ہو کہ جہاد کا نام سنتے ہی یا لرزنے لگ جائے یا معذرت کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی مزید اتھاہ گہرائیوں میں گر کر دم لے گی۔ مسلمانوں پر ویسے

بھی دور انحطاط کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

”ایک وقت آئے گا کہ تم مسلمانوں پر دوسری قومیں اس طرح پل پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں“ کسی نے پوچھا ”کیا ہم اس وقت تھوڑے ہوں گے؟“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں تعداد کے لحاظ سے تم بہت زیادہ ہو گے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے دل سے تمہاری مہبت اٹھالے گا اور تمہارے دلوں میں ”وہن“ ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا ”وہن کیا ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”دنیا کی محبت اور موت سے نفرت و کراہت“۔ (تفخیص مندرج ج ۶ ص ۱۶)

اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر رونق افروز ہونے کے بعد جو خطبہ دیا۔ اس کے درج ذیل الفاظ کی تاریخ نے ہر آن گواہی دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی جہاد نہ چھوڑے۔ جو قوم جہاد کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اللہ اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔“

آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو خط میں لکھا تھا۔ ”جب تم دشمن سے ملو تو موت کی خواہش کرو۔ تاکہ تمہیں زندگی عطا ہو۔“

فرضیت جہاد کا دائرہ:

جن صورتوں میں جہاد فرض ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر تو آئندہ باب چہارم میں آئے گا۔ سردست یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر مسلمان کئی ممالک اور ریاستوں میں بٹ چکے ہوں تو جس ملک پر حملہ ہو جہاد محض اسی پر فرض نہیں ہوتا بلکہ ہمسایہ ممالک پر بھی اس کی ہر طرح سے امداد و استعانت فرض ہو جاتی ہے۔ البتہ اس فرضیت کے درجات مختلف ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ روس نے افغانستان میں جارحانہ مداخلت اور فوجی کارروائیاں شروع کیں تو سب سے پہلے نمبر پر جہاد افغانستان کے مسلمانوں پر فرض ہے دوسرے نمبر پر افغانستان کے ہمسایہ ملک ایران اور پاکستان پر اور اس فرضیت کا درجہ نسبتاً کم ہوگا اور تیسرے نمبر پر سب دنیا کے مسلمان ممالک پر اور اس فرضیت کا درجہ نمبر ۲ سے بھی نسبتاً کم ہوگا اسی طرح اب مقبوضہ جموں و کشمیر کا مسئلہ ہے کہ وہاں کے مسلمان بھارتی مظالم کے شکار ہیں۔ ہندوؤں کے خلاف جہاد کرنا سب سے پہلے اہل کشمیر پر فرض ہے اور پھر پاکستانی مسلمانوں پر ان کا تعاون اور مدد فرض ہے، یہ فرضیت گو فرض کفایہ ہی کی

نوعیت کی ہوتی ہے لیکن فرضیت میں کوئی شک و شبہ نہیں کیونکہ ارشادِ بانی کے مطابق دنیا بھر کے مسلمان سب ایک امت ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم کرب و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(مسلم - کتاب البر والصلة - باب تراحم المؤمنین)

افسوس ہے کہ آج کا مسلمان اس پہلو سے انتہائی غفلت میں ہے اور یہی اس کی رسوائی

کی اصل وجہ ہے۔



باب دوم

رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار

پس منظر

دنیا سے فتنہ و فساد ختم کر کے اللہ کا دین قائم کرنے کی ذمہ داری ہی حقیقتاً وہ مقصد تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ مختلف اداوار میں انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ کو قافو قفامبعوث فرماتا رہا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو دنیا ظلم و جور سے بھر چکی تھی۔ جس کی تفصیل بیان کرنا خارج از بحث ہے۔ عرب کا وہ خاص علاقہ جہاں آپ ﷺ تشریف لائے لوٹ مار اور قتل و غارت کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ چونکہ عرب ایک بے آب و گیاہ علاقہ تھا لہذا یہاں کے اکثر وحشی قبائل کا پسندیدہ ذریعہ معاش تجارتی قافلوں کو لوٹ کر گزراوقات کرنا تھا۔ ویسے تو یہ پیشہ ہی انسان کو دوسرے انسان کے بے دریغ قتل پر بیباک اور جری بنا دیتا ہے۔ تاہم ان میں کچھ اور بھی ایسے عقائد و نظریات شامل ہو گئے تھے جن کی بنا پر فتنہ و فساد اور انسانی خون کی ارزانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور وہ مختصر اور ج ذیل ہیں:-

قبائل عرب کی وحشت و بربریت:

عرب میں طوائف الملو کی یعنی قبائلی نظام رائج تھا۔ بات بات پر جھگڑانا ان کا قومی شعار بن چکا تھا۔ رقابت اور نسلی تفاخران جھگڑوں کو مستقل جنگوں کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں ان میں ”ٹار“ کا عقیدہ رائج ہو چکا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مقتول کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے اس کی روح پرندے کی شکل اختیار کر کے مسلسل چیخ و پکار کرتی رہتی ہے۔ کہ ”میں پیاسی ہوں۔ میں پیاسی ہوں“ اور یہ پیاس صرف قاتل یا اس کے قبیلہ کے کسی فرد کا خون بہانے سے ہی بجھ سکتی تھی۔ اس عقیدہ کے تحت اگر قبائل میں جنگ چھڑ جاتی تو بعض اوقات مسلسل صدیوں تک پھیل جاتی تھی۔

ان میں فتنہ و فساد کی کثرت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ خدائے واحد کو بھول کر بت پرست بن گئے تھے۔ ہر قبیلے کا جدا جدا بت تھا۔ جو اللہ کے ہاں سفارشی سمجھا جاتا تھا۔ اس عقیدہ سفارش نے ان کو عصیان و سرکشی کی زندگی پر دلیر بنا دیا تھا۔

ان کے درمیان چوتھی وجہ مخاصمت ”عورت کی ذات تھی“۔ شراب اور عشق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ جلسوں میں عورتوں سے عشق کا برملا اظہار کیا جاتا۔ ان کی عصمت سے کھیلتا ان کا دل چمپ مشغلہ تھا۔ جب کسی قبیلہ کی عورت پر ہاتھ ڈالا جاتا یا وہ فریاد کرتی تو یہ لڑائی مسلسل قبائلی جنگ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

پھر ان لوگوں کا جوش انتقام اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ محض حریف کو قتل کر دینا ان کے جوش انتقام کو تسکین نہیں بخشتا تھا۔ وہ قتل کے بعد لاش کے ہاتھ، ناک، کان وغیرہ کاٹ کر اس کو بد شکل بنا دیتے تھے۔ کبھی اس کا پیٹ چاک کر کے اس کا کلیجہ دانتوں میں چباتے اور کبھی اس کی کھوپڑی میں شراب پینے کی نذر پوری کرتے تھے۔

قریش دشمنی کی وجوہات:

یہ تھی اس قوم کی حالت، جس میں آپ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ سرانجام دے کر فتنہ و فساد اور ظلم و جور کا خاتمہ کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے مشن کا آغاز عقیدہ تو حید اور یوم آخرت پر ایمان اور پرش اعمال پر استوار کیا۔ اور کئی زندگی کے مسلسل ۱۳ سال انفرادی اور پر امن جہاد پر صرف کیے۔ آپ ﷺ کی دعوت نے مکہ کے بت پرستوں کو اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ آپ کی جان کے لاگو بن گئے۔ علاوہ ازیں اسلام نسلی تفاخر کی جزا کاٹ کر معاشرتی مساوات کا سبق دیتا تھا۔ اور قریش مکہ جو اپنے آپ کو ہر لحاظ سے ”ایک برتر مخلوق“ سمجھتے تھے۔ انہیں یہ تعلیم کسی صورت میں قبول کرنا گوارا نہ تھی۔ پھر اسلام کمزوری کی حمایت اور ظلم سے نفرت پر زور دیتا تھا۔ لیکن ان کا قبائلی نظام صرف اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ ہر صورت اپنے ہی قبیلہ کی حمایت کی جائے۔ علاوہ ازیں اسلام لوٹ مار کے مال کو حرام قرار دیتا تھا۔ لیکن بیشتر قبائل کا ذریعہ معاش ہی یہی پیشہ تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے پیش نظر نہ صرف قریش مکہ بلکہ اکثر قبائل عرب اسلام بلکہ پیغمبر اسلام کے بھی دشمن بن گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلسل تیرہ سال کی جدوجہد سے ایک مضحی بھر جماعت تیار کر لی۔ جو اسلام کے شیدائی اور آپ کے جاٹار تھے۔ قریش مکہ نے ان لوگوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور یہ لوگ بیچارے مسلسل ان کے ظلم و ستم سہتے رہتے تھے۔ تا آنکہ ۱۳ سال بعد ان ظلم رسیدہ لوگوں کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کی اجازت مل گئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن ہجرت کی اجازت ملی جس دن قریش کے پورے قبائل آپ کو جان ہی سے ختم کر دینے کی خفیہ سازش تیار کر کے آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔

مدینہ کی ریاست:

ان حالات میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جاٹار ساتھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے یہاں آ کر ایک چھوٹی سی آزاد خود مختار ریاست کی تشکیل کی۔ اس ریاست کے باشندوں کی تعداد بشمول مہاجرین مکہ پانچ سو نفوس سے زائد نہ تھی۔ انہی حالات میں آپ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ یعنی قتال کا فریضہ سرانجام دینا تھا۔ چنانچہ پہلی آیت جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی وہ یہ تھی۔

﴿إِذْ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ
اللَّهُ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ (۳۹:۲۲) لڑیں (کیونکہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ تعالیٰ یقیناً
ان کی مدد پر قادر ہے۔)

گویا جو مسلمان آج تک کفار عرب کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ اور جنہیں آج تک صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی رہی تھی مدینہ آ کر چھوٹی سی ریاست تشکیل دینے کے بعد انہیں ظلم سے نجات حاصل کرنے اور ظالموں کو ظلم سے روکنے کے لئے جنگ کی اجازت مل گئی۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی نوزائیدہ ریاست کی مختصر سی فوج کے سپہ سالار (حضور اکرم) نے جہاد فی سبیل اللہ کا یہ فریضہ کس حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔

(۱) جہاد کی تیاری اور آپ ﷺ کی حربی مہارت

فن حرب اور سیاسی دفاع کے ماہرین کے نزدیک جنگ کی تیاری میدان جنگ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ جنگ کی تیاری ہی وہ اصل بنیاد ہوتی ہے جس پر فتح و شکست کا

دار و مدار ہوتا ہے۔ اور جنگ کی تیاری کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہوتے ہیں:-

(۱) داخلی استحکام

جنگ کی تیاری میں سب سے ضروری چیز کسی ریاست کا داخلی استحکام ہوتا ہے۔ کسی ملک کی فوجیں اسی صورت میں دلجمعی سے لڑ سکتی ہیں جبکہ اس ملک کی آبادی نظریاتی اعتبار سے ان کی ہمنو ہو۔ اور فوجوں میں بھی کسی قسم کا نظریاتی انتشار نہ ہو۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے:-

(۱) تعمیر مسجد نبوی ﷺ:

مدینہ میں تشریف لاتے ہی آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کی۔ اس میں دن بھر میں پانچ دفعہ مسلمانوں کے اجتماع نے مسلمانوں میں موافقت موافقت اور ہمدردی کی فضا پیدا کر دی۔ یہی مسجد آپ ﷺ کی فوج کا ہیڈ کوارٹر بھی قرار پایا۔ جہاں سے حرب و ضرب کے تمام احکامات صادر ہوتے تھے۔

(۲) رشتہ موآخات:

مہاجرین اور انصار میں رشتہ موآخات یا بھائی چارہ قائم کر کے آپ ﷺ نے صرف مہاجرین کی آباد کاری اور معاش کا مسئلہ ہی حل نہیں فرمایا بلکہ اس سے مہاجرین و انصار میں اس قدر ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی جو عموماً حقیقی بھائیوں میں بھی ناپید ہوتی ہے۔

(۳) میثاق مدینہ:

مدینہ کی معتد بہ آبادی یہودیوں کے تین قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سود خور اور تجارت پیشہ تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے لہذا اپنے علم و دولت کی وجہ سے اس معاشرہ میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے دشمن تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تمنا کے خلاف آنے والا نبی (حضور اکرم ﷺ) حضرت اسحاق کی اولاد سے نہیں بلکہ حضرت اسمعٰیلین کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے تمام باشندوں (بشمول یہود) سے ایک معاہدہ کیا جو ”میثاق مدینہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دنیا کی پہلی تحریری دستاویز تھی جس میں عوام اور

ریاست کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا تھا۔ یہ میثاق ۵۲ دفعات پر مشتمل ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل دفعات بالخصوص حربی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں:-

(۱) یہ کہ مدینہ کی کل آبادی کو ایک سیاسی وحدت قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مدینہ پر باہر سے حملہ ہوا جس کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا، تو مدینہ کے تمام باشندے مل کر دشمن کا دفاع کریں گے۔

(۲) مصارف دفاع میں یہودی اپنے حصہ کی رقم ادا کریں گے۔

(۳) یہود اپنے مذہبی شعاری ادا بیگی میں پوری طرح آزاد ہوں گے۔

(۴) مدینہ کے ایسے قبائل جو نہ یہودی تھے اور نہ ہی انہوں نے ابھی تک اسلام قبول کیا تھا۔ کے لئے تابعین کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ خون بہا، فدیہ، انصاف اور نیکی کے کاموں میں ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کی قبائلی روایات کا احترام کیا جائے گا۔ اس کے عوض وہ شہر کے مشترکہ دفاع اور حصہ رسدی اخراجات جنگ کو برداشت کرنے کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔

(۵) اگر اس سلسلہ میں آپس میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کیا جائے گا۔ گویا اس معاہدہ کی رو سے آپ کی بالادستی بھی تسلیم کر لی گئی۔ اور اندرونی استحکام کی طرف سے بھی کسی حد تک اطمینان ہو گیا۔

(۴) حرم نبوی ﷺ کا تعین:

چوتھا اقدام آپ ﷺ نے یہ کیا کہ مکہ کی طرح مدینہ کو بھی آپ ﷺ نے حرم قرار دیا۔ جسے آج کی سیاسی زبان میں اوپن سٹی Open City کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل شہر اس کے اندر یا اس کے گرد و نواح میں جنگ نہیں کرنا چاہتے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی اور برطانیہ نے بیت المقدس کو ”اوپن سٹی“ یا حرم قرار دیا تھا۔ اور عالمگیر جنگ میں فرانس کی استدعا پر ”پیرس“ اوپن سٹی قرار پایا۔ چنانچہ جرمن نے اس پر بمباری نہیں کی۔

حضور اکرم ﷺ کا مدینہ کو حرم قرار دینے کا مقصد یہ تھا کہ قریش مکہ جو حرم مکہ کی وجہ سے بہت حد تک محفوظ و مامون سمجھے جاتے تھے اگر مدینہ پر حملہ آور ہوں گے تو قبائل عرب میں حرم کی قدر کا وقار خود بخود گر جائے گا۔ لہذا اس خطرہ کے پیش نظر قریش مکہ مدینہ پر حملہ آور ہونے میں ایک

اخلاقی جھجک محسوس کریں گے۔

ان چند در چند اقدامات کا یہ اثر ہوا کہ مدینہ کی چھوٹی سے نوزائیدہ ریاست عرب میں متعارف ہو گئی۔ اور اندرونی استحکام کے لحاظ سے بھی یہ اقدامات اطمینان کا باعث بنے۔

(۲) ہمسایہ قبائل سے تعلقات:

مبادیات جنگ میں دوسری اہم چیز اپنے ہمسایہ ممالک سے تعلقات ہیں۔ اگر ان سے تعلقات خراب ہوں تو عین ممکن ہے کہ جنگ کے دوران یہ لوگ دشمن سے مل کر اس کے ہاتھ مضبوط کر دیں یا جنگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی پہلو سے مرکز پر حملہ کر دیں۔ لیکن اگر ان سے تعلقات اچھے ہوں تو وہ خواہ جنگ میں کوئی مفید خدمت انجام نہ بھی دے سکیں ان سے نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ اندرونی استحکام سے فراغت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلو پر بھی خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے:-

(۱) ہجرت سے تقریباً ایک سال بعد اپنے چند جاں نثروں سمیت موضع ودان کا رخ کیا۔ اس سفر کو غزوہ^۱ ودان یا غزوہ ابواء کہا جاتا ہے۔ وہاں قریش کا ایک قبیلہ بنو ضمرہ آباد تھا۔ آپ ﷺ نے اس قبیلہ کے سردار عمرو بن محشی الضمری سے مل کر درج ذیل شرائط پر معاہدہ کیا:-

(۱) یہ قبیلہ قریش کی کسی طرح سے بھی مدد نہیں کرے گا اور غیر جانبدار رہے گا۔

(ب) اپنے علاقے میں امن بحال رکھے گا۔

(ج) جنگ کے علاوہ آئندہ تنازعات میں بھی غیر جانبدار رہے گا۔

۳۔ اس واقعہ کے چند ماہ آپ ﷺ مقام ذوالعشیرہ تشریف لے گئے یہ مقام بنو ع کے پاس آباد ہے۔ یہاں قریش کا قبیلہ بنو مدح آباد تھا۔ جو بنو ضمرہ کا حلیف تھا۔ آپ ﷺ نے بنو ضمرہ کے حوالے سے اس قبیلہ کے ساتھ بھی انہیں شرائط پر معاہدہ کیا۔ آپ ﷺ کا یہ سفر غزوہ

۱۔ غزوہ یاسر کے معنی جنگ نہیں بلکہ ہم یا مہماتی سفر ہے۔ خواہ یہ سفر کسی ایک آدمی نے ہی کیا ہو۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہر وہ سفر جس میں رسول اللہ ﷺ ساتھ ہوتے غزوہ کہلاتا ہے۔ خواہ یہ سفر عسکری نوعیت کا ہو یا سیاسی نوعیت کا اور خواہ محض معلوماتی قسم کی طلباء کی رودی ہو۔ اور جس سفر میں حضور اکرم ﷺ ساتھ نہ ہوتے وہ سفر سر (یعنی سرایا) کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی زندگی میں جنگیں تو صرف سات آنحضرت کیں لیکن غزوات و سرایا کی تعداد چھتیس لعا لین کے مصنف قاضی سلیمان منصور پوری کے بیان کے مطابق ۸۲ ہے جن میں سے ۱۹ غزوات ہیں اور باقی ۶۳ سرایا ہیں۔

رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار

ذوالعشرہ کے نام سے مشہور ہوا۔

الغرض ایسی کوششوں سے آپ ﷺ کا مقصد مدینہ کے قرب وجوار میں بسنے والے قبائل کو غیر جانبدار بنانا تھا تا کہ جنگ کی صورت میں ان کا قریش سے تعاون کا خطرہ نہ رہے۔

(۳) علاقہ جنگ سے متعلق یوری واقفیت:

علاقہ جنگ سے متعلق واقفیت بھی بسا اوقات فتح کا ایک اہم سبب بن جاتی ہے۔ آپ ﷺ کو جب کبھی نقل و حرکت کی ضرورت پیش آتی تو آپ اکثر مہاجرین کو اپنے ساتھ لے جاتے اور غیر معروف راستوں سے منزل مقصود تک پہنچتے تھے۔ انصار تو کم و بیش ان علاقوں سے واقف تھے ہی۔ مہاجرین کو بھی اس آب و گیاہ علاقہ سے متعارف کرانا ضروری تھا۔ تاکہ عند الضرورت پڑاؤ کے انتخاب یا پانی کی تلاش میں دقت پیش نہ آئے۔ چنانچہ غزوہ بواط یا ودان میں ۷۰ مہاجرین آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور غزوہ ذوالعشرہ میں ۱۵۰ کے لگ بھگ، ان دونوں غزوات میں، جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، اسی مقصد سے آپ ﷺ نے غیر معروف اور طویل راستے اختیار کیے تھے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے عبیدہ بن الحارث کی سرکردگی میں ۶۰ مہاجرین پر مشتمل ایک گشتی سر یہ شوال اہ میں بھیجا تھا تا کہ قریش کے حالات کی خبر لائے۔ یہ سر یہ سر یہ رابع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قافلہ بھی غیر معروف راستوں سے ایک چشمے کے پاس پہنچا جو شیبہ المرہ نامی پہاڑی کے نیچے واقعہ تھا۔ یہاں پہنچ کر اس قافلہ کو معلوم ہوا کہ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ عکرمہ بن ابوجہل کی سرکردگی میں مکہ کی طرف جا رہا ہے گویہ دونوں قافلے دو بدو ہو گئے تاہم مد بھیڑ نہیں ہوئی۔ کیونکہ مسلمانوں کو ابھی تک جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ یہ قافلہ گشت لگا کر واپس آ گیا۔

آپ ﷺ کے اس قسم کے معلوماتی سفر سے عموماً مندرجہ ذیل تین امور کی تحقیق مطلوب ہوتی

تھی:-

- (۱) کتنے اور کون کون سے قبائل جنگ کے موقع پر حلیف یا حریف بن سکتے ہیں؟
- (۲) علاقہ کے طبعی حالات حملہ آور کے مخالف ہیں یا موافق؟
- (۳) حملہ آور کو کس جگہ روکنا چاہئے؟

جنگی اعتبار سے ایسے معلوماتی سفر کی اہمیت اس تاریخی واقعہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جرمی کے مشہور جرنیل ہینڈنبرگ نے روسی فوجوں کو ٹینبرگ نامی ایک مقام پر گھیر کر دلدلوں میں پھنسا کر فنا کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہینڈنبرگ اس سارے علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور یہ علاقہ اپنے پاؤں تلے روند چکا تھا۔

(۴) طلائیہ گردی اور جاسوسی نظام:

رسول اللہ ﷺ نے جس رات مکہ سے ہجرت فرمائی تو اس رات قریشیوں کے تمام قبائل کے سرداروں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کی غرض سے آپ کے مکان کے گرد مسلح پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ لیکن آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بحفاظت اس چنگل سے نکل آئے تو قریش کی اس ناکامی نے ان کے جوش انتقام کو اور زیادہ بھڑکا دیا تھا۔ قریشیوں نے آپ ﷺ کی گرفتاری کے صلہ میں سوانٹ انعام مقرر کیا۔ اس مہم میں بھی سخت ناکامی ہوئی تو اور بھی سخت ہو گئے۔ ادھر حضور اکرم ﷺ بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔ پھر بھی ان لوگوں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے جانثاروں کو چسپن کا سانس نہ لینے دیا۔ اور عبد اللہ بن ابی ریحس السقفین کو مندرجہ ذیل تہدید آمیز خط لکھا۔

”تم نے ہمارے آدمی کو اپنے یہاں پناہ دی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے۔ اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے“۔ (ابوداؤد ج ۲، باب خیر النصیر)

آپ ﷺ کو جب اس خط کا علم ہوا تو آپ خود عبد اللہ بن ابی کے پاس تشریف لے سمجھایا کہ ”کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے؟“

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس سوال پر عبد اللہ بن ابی پر فوراً یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اس کا بیٹا اور اس کے قبیلہ کے جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں وہ کسی قسمت پر اس کا ساتھ نہیں دے

۱۔ عبد اللہ بن ابی مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج کا سردار تھا۔ حضور اکرم کے مدینہ تشریف لانے سے پیشتر یہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ اوس و خزرج کے اکثر افراد اسلام آچکے تھے۔ لہذا بظاہر یہ بھی مسلمان ہو گیا۔ مگر کینے کی چنگاری دل میں دبی رہی۔ چونکہ مدینہ قریش مکہ کے تجارتی سفر کا ایک نہایت اہم مقام تھا۔ لہذا قریش مکہ مدینہ کی سیاست سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا انہوں نے عبد اللہ بن ابی کو اپنی سیاست کے مہرہ کے طور پر استعمال کیا۔

سکتے۔ لہذا وہ قریش کے اس تہدید آمیز خط کے باوجود کوئی اقدام کرنے سے قاصر رہا۔
 پھر یہ خبریں بھی دم بدم مدینہ پہنچ رہی تھیں کہ قریش مکہ مدینہ پر ایک بڑے حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو چند دفاعی تیاریاں کر چکے تھے تاہم ان مسلسل خبروں نے منہمی بھر مسلمانوں کی رات کی نیند حرام کر دی تھی۔ اور یہ خطرہ ہر آن لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی قریش مکہ مدینہ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور رسول اللہ خود اکثر راتوں کو جاگا کرتے تھے اور صحابہ کرام رات کو اکثر ہتھیار بند ہو کر سویا کرتے تھے (بخاری کتاب الجہاد۔ باب الحراستہ) حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک رات رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش کوئی نیک بخت میرا پہرہ دے اور میں سو سکوں۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے پہرہ دیا۔ پھر آپ ﷺ سوئے۔

(بخاری کتاب الجہاد والسیر۔ باب الحراستہ)

ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمان ہر آن کفار کی نقل و حرکت سے باخبر رہیں۔ چنانچہ اس ضرورت کے تحت آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں کئی ایسے جاسوسی دستے روانہ کیے۔ ایسے دستوں کو عربی میں طلیعہ اور اردو میں طلائیہ گردیا جاسوسی دستے (Petrol) کہا جاتا ہے اس طرح کے ایک دستے کا ذکر اوپر سریہ رافع کے نام سے گزر چکا ہے۔ یہ سریہ شوال ۱ھ میں عبیدہ بن حارث کی سرکردگی میں بھیجا گیا تھا۔ اور ۶۰ مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اس دستے کا جب قریش کے تجارتی قافلہ سے آنا سامنا ہوا تو اس بات کے باوجود کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ کر کے اسے باسانی لوٹ سکتے تھے صرف اس لیے باز رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس بات کی اجازت نہ تھی۔ البتہ ایک صحابی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک تیر چلایا۔ جو قافلہ کو مرعوب کرنے کے لیے انہوں نے چلایا تھا۔ اور یہ پہلا تیر تھا جو اسلام میں چلایا گیا۔

(۲) اسی طرح کا ایک ۸۰ نفوس پر مشتمل دستہ سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں ذی قعدہ ۱ھ میں روانہ کیا گیا۔ جو سریہ ضرار کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ دستہ حنفہ تک گشت لگا کر واپس چلا آیا۔

(۳) غزوہ بواط بھی ایسی ہی سرگرمیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ۲۰۰ افراد کی معیت میں قریش کے ایک تجارتی قافلہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے ربیع الاول ۲ھ میں روانہ ہوئے۔ یہ دستہ رضوی اور بواط سے ہو کر واپس آ گیا۔ راہ میں

۱۰۰ انفوس پر مشتمل تجارتی قافلہ امیہ بن خلف کی سرکردگی میں جاتے ہوئے ملائکن اس سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔

(۴) قریش مکہ کے بھی ایسے دستے مدینہ کے احوال کا پتہ چلانے آتے تھے۔ چنانچہ اسی ماہ یعنی ربیع الاول ۲ھ میں کرز بن جابر الفہری کی سرکردگی میں ایک دستہ مدینہ پہنچا۔ اس نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور اہل مدینہ کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ آپ ﷺ نے ۵۰ آدمیوں کی معیت میں صفوان جو بدر کے نزدیک ایک مقام ہے تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ لگا۔ یہ غزوہ صفوان یا غزوہ بدر الاولیٰ کے نام سے مشہور ہوا۔

(۵) رجب ۲ھ میں آپ ﷺ نے ۱۲ آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ حضرت عبداللہ بن جشؓ کی سرکردگی میں بھیجا۔ تاکہ قریش کے اس قافلہ کی خبر لائے جو بنو امیہ کی سرکردگی میں جا رہا تھا یہ سریہ نخلہ کے نام سے مشہور ہوا۔ دونوں قافلوں کی ٹڈ بھیز ہو گئی۔ قافلہ قریش میں ایک نامور شخص عمرو بن حضری، جو تمام قریش کے سردار عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا۔ عبداللہؓ کے ایک ساتھی واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے مارا گیا۔ دو آدمی گرفتار ہوئے اور مال غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ عبداللہ بن جشؓ نے واپس مدینہ آ کر یہ صورت حال رسول اللہ ﷺ سے بیان کی تو آپ ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا:-

((صَنَعْتُمْ مَالَكُمْ تَوْمَ رَوَابِهِ وَقَاتَلْتُمْ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَلَمْ تَوْمَرُوا الْقِتَالَ -))
(طبری ج ۱۔ غزوہ بدر کے تحت) تمہیں حکم نہ تھا۔)

نیز آپ ﷺ نے مال غنیمت قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ گو بعد میں قیدی بھی رہا کر دیئے تھے اور مقتول کا خوبہا بھی ادا کر دیا گیا (رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۱۸۷) تاہم قریش نے ماہ حرام میں لڑنے کے واقعہ کو اتنا اچھا لاکہ یہی واقعہ غزوہ بدر کا فوری سبب بن گیا۔

(۶) جنگ احزاب ختم ہونے کو تھی۔ ایک رات سردی ہو گئی۔ ٹھنڈی ہوا جسموں کو چھیدتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اس حال میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا "کوئی ہے کہ جو جا کر دشمن کی خبر لائے"۔ سردی کی شدت اور دشمن کے کیمپ میں

جانے کا ہمت آزمامر حلقہ تھا۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اس مہم کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ ﷺ بچتے بچاتے اور چھپتے چھپاتے دشمن کے کیمپ میں جانے تک کامیاب ہو گئے۔ آپ نے دیکھا کہ دشمن سخت مایوسی کے عالم میں بیٹھا ہے۔ ابوسفیان سالار قریش کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے لشکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ پہلے سب لوگ تسلی کر لیں کہ ان کے ساتھ کوئی دشمن کا آدمی تو نہیں۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے خود دوسروں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ خود چور کو پکڑو پکارنے لگے۔ جب ابوسفیان کی تسلی ہو گئی۔ تو لشکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔ محاصرہ طویل ہو گیا اور سرد ختم ہو گئی۔ بنو قریظہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور موسم ناساز گار ہے۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ واپس چلے جائیں۔“ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پوری رپورٹ لے کر اسی طرح بچتے بچاتے واپس آ گئے اور آ کر رسول اللہ ﷺ کو اس صورتحال کی اطلاع دی آپ ﷺ بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا ہر نبی کا کوئی حواری ہوتا ہے۔ اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے۔“

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر۔ باب هل یبعث الطلیعة.....)

ان تصریحات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ایک سپہ سالار کے دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رہنا کس قدر ضروری ہے۔ اور آپ ﷺ نے اس ذمہ داری کو اُس قدر مستعدی اور جانفشانی سے سرانجام دیا تھا۔ ایسے دستوں کی روانگی سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:-

- (۱) مدینہ کے آس پاس کے علاقہ کے متعلق پوری معلومات حاصل ہو گئیں۔
- (۲) دشمن کی نقل و حرکت اور سیاسی اور حربی سرگرمیوں سے مسلمان پوری طرح واقف رہتے تھے۔

(۳) ان دستوں کی روانگی نے ابتدائی جنگی مشقوں کا کام دیا۔

(۵) عسکری تنظیم:

اسلام سے پہلے دنیا میں بالعموم جاگیر داری نظام رائج تھا۔ بادشاہ اپنے سرداروں کو جاگیریں عطا کرتے تھے اور یہ سردار اس کے عوض جنگ کے موقع پر فوج اور اس کے لوازمات مہیا

کرتے تھے۔ عام لوگ فوجی خدمات سے آزاد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ نے ہر لڑنے کے قابل مسلمان کو فوجی قرار دیا اور ان کی تربیت اس انداز سے کی کہ نظم و ضبط سے آشنا اور ایک دوسرے کی جانی دشمن قوم بنیان مرصوص کی طرح مستحکم اور مضبوط فوج بن گئی۔

دور نبوی ﷺ میں سامان جنگ صرف تیر و کمان، تلوار اور ڈھال، خود اور زرہ، نیزہ، بھالوں اور برچھوں تک محدود تھا۔ سواری کے لئے عموماً گھوڑے اور اونٹ کا استعمال ہوتا تھا ہر مسلمان مجاہد کا فرض تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اسلحہ جنگ خود مہیا کرے۔ جب کبھی جنگی حالات پیدا ہو جاتے تو حضور اکرم ﷺ جہاد کا اعلان فرمادیتے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اس میں داغے ورے، قدمے نخے شریک ہو جاتے تھے۔ مسلمانوں کی ان فوجی خدمات کے عوض انہیں صرف اموال غنیمت سے حصہ ملتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ بلکہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کے دور تک یہی دستور رہا۔

جنگ بدر اور جنگ احد کے درمیانی وقفہ میں کسی وقت حضور اکرم ﷺ بلکہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور تک یہی دستور رہا۔

جنگ بدر اور جنگ احد کے درمیانی وقفہ میں کسی وقت حضور اکرم ﷺ نے تمام مسلمانوں کے نام درج رجسٹرڈ کروائے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق اس وقت جملہ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو ہوئی۔ اور لڑنے کے قابل مسلمانوں کی تعداد ابو معاویہ کی روایت کے مطابق چھ سو اور سات سو کے درمیان تھی۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب کتابت الامام الناس)

جب کبھی جہاد کا اعلان ہو جاتا تو تمام لڑنے والے مسلمان اپنے نام لکھوا دیتے۔ پھر اگر کسی کو کوئی مجبوری پیش آ جاتی تو وہ باقاعدہ حضور اکرم ﷺ سے اجازت لیتا تھا۔ ابن عباس کہتے ہیں:-

((جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله اني كنت في غزوة كذا وكذا وامراتي حاجة فقال
(ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا نام فلاں فلاں جہاد میں جانے کے لئے لکھا گیا ہے

﴿ اَرْجِعْ فَحُجَّ مَعَ اَصْرَاتِكَ ﴾)) لیکن میری بیوی حج کو جا رہی ہے۔ آپ (بخاری) کتاب الجہاد والسیر - مسلم کتاب الحج - باب سفر المرأة مع المحرم الى الحج وغيره) ساتھ (پہلے) حج کر۔

منافقین کا نام بھی چونکہ مسلمانوں کے رجسٹر میں درج تھا۔ اس لئے وہ اکثر حیلے بہانے کر کے جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت لے لیتے تھے اور یہی ان کے نفاق کی علامت تھی۔ غزوہ تبوک میں تین سچے مسلمان کعب بن مالک اور اس کے دو ساتھی محض تساہل کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ تو ان پر سخت گرفت ہوئی۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ یہ واقعہ قرآن و احادیث میں تفصیل سے مذکور ہے۔

مسلمان عموماً اسلحہ جنگ تو حسب توفیق خود مہیا کر لیتے لیکن سوار یوں کا معاملہ ذرا مشکل تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ لہذا بارگاہ نبوی ﷺ میں آ کر سواری طلب کرتے۔ بسا اوقات آپ ﷺ بھی سرکاری بیت المال سے سواری مہیا نہ کر سکتے تھے۔ جس سے آپ ﷺ کو بڑا قلق ہوتا۔ اور مسلمان بھی بیچارے آبدیدہ ہو کر چلے جاتے۔

غزوہ تبوک جو حبش العسمرہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ کے وقت مسلمانوں پر خاصی تنگ دستی کا وقت تھا۔ چند مسلمان آئے اور آپ ﷺ سے سواری طلب کی آپ ﷺ پر یہ بات اس قدر شاق گزری کہ آپ ﷺ نے قسم کھالی کہ میں سواری مہیا نہ کروں گا۔ وہ مایوس اور آبدیدہ ہو کر واپس چلے گئے۔ اتنے میں کچھ اونٹ بیت المال میں آگئے تو آپ ﷺ نے ان لوگوں کو واپس بلا کر پانچ عمدہ قسم کے اونٹ دیدیئے۔ ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے سواری مہیا نہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”جب میں قسم کھا لیتا ہوں تو بہتر بات کے لیے اسے توڑ کر کفارہ دے دیتا ہوں“۔ (بخاری) کتاب المغازی باب قدوم الاشعریین)

جنگی مصارف پہلے سے تو فہم کے مال سے پورے کیے جاتے لیکن اس سے کام نہ چلتا تو آپ ﷺ چندہ کی اپیل فرمایا کرتے۔ اسی غزوہ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ نے بھرپور مالی تعاون کی اپیل فرمائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مقابلہ مسابقت کا

۱۔ سورہ توبہ آیت ۱۱۸ بخاری - کتاب المغازی باب حدیث کعب ابن مالک - مسلم کتاب التوبہ - باب حدیث کعب ابن مالک و صاحبہ -

خیال آیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مالی حالت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اچھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھر کے تمام اثاثہ کا نصف لاکر مسجد میں حضور کے سامنے لا ڈھیر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا۔ ”عمر رضی اللہ عنہ! کیا کچھ لائے؟“ بولے تمام جائیداد کا نصف لے آیا ہوں۔ اتنے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھوڑا سا سامان لیے آ گئے۔ آپ ﷺ سے پوچھا۔ ”ابو بکر! کیا کچھ لائے۔ فرمایا۔“ گھر میں بس اللہ اور رسول ﷺ کا نام چھوڑ آیا ہوں؟“

(ترمذی ابواب المناقب - باب ابی بکر الصدیق)

اسی موقع پر ایک تنگدست صحابی (ابو عقیل) نے ساری رات کنویں سے پانی نکال کر ایک صاع کھجوریں مزدوری حاصل کی اور آدھا صاع لا کر حضور اکرم ﷺ کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں۔ آپ ﷺ ہر چند وہ دھندہ کے مشکور ہوتے اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرتے۔ اس تنگدست صحابی کی اس قربانی پر آپ ﷺ اتنے خوش ہوئے کہ اس کی ایک صاع کھجوریں تمام ڈھیر پر پھیلا دیں۔

(بخاری کتاب التفسیر زیر آیت الدین یلمعون المظوعین اور الریحق المنخوم اردو ص ۶۸۲)

یہ تھا حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں افرادی قوت اور جنگی مصارف مہیا کرنے کا طریق۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے فوج کا الگ محکمہ قائم کیا۔ باقاعدہ تنخواہ دار ملازم رکھے گئے۔ پھر یہ افواج بھی دو قسم کی تھیں۔ ایک وہ جو ہر وقت چھاؤنیوں میں موجود اور مستعد رہتی تھیں اور دوسرے وہ جو تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس آ کر اپنا کام کاج کرتی تھیں اور بوقت ضرورت انہیں طلب کر لیا جاتا تھا۔ جسے آج کل ریزرو فوج کہا جاتا ہے۔ ان کے نظم و نسق کے لئے ایک محکمہ دیوان الجند کے نام سے قائم کیا جس میں سپاہیوں کے نام و اوصاف ان کے وظائف کی مقدار اور ان کے اعمال و فرائض کی تفصیلات کا اندراج ہوتا تھا۔

قیادت کا نظام:

رسول اللہ ﷺ کے آخر زمانہ میں اسلامی مملکت سات صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دوران خلافت دس صوبوں میں ہر صوبہ کا ایک والی ہوتا تھا۔ جو حاکم اور سپہ سالار دونوں طرح کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک عامل ہوتا جو صوبہ کی آمد و خرچ

کانگرن ہوتا اور ایک قاضی جو عدلیہ کا سربراہ ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حاکم اور سپہ سالار کے عہدے بھی الگ الگ کر دیئے گئے۔ فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے ان کے سالار مقرر کر دیئے گئے اور پھر ان سب کو ایک سالار اعظم کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس سے پیشتر جنگ کے دوران ہی مختلف دستوں کے سالار مشورہ کے ذریعہ مقرر کئے جاتے تھے اور یہ بات بسا اوقات خلیفہ کی صوابدید پر منحصر ہوتی تھی۔ ان سالاروں کو قائد کہا جاتا تھا۔

خلیفہ کی طرح قائد کی اطاعت بھی واجب تھی۔ اس کی حیثیت خلیفہ کے نائب کی ہوتی تھی۔ نماز میں وہی لوگوں کی امامت کرتا۔ اگر کسی مقام پر ایک سے زیادہ قائد جمع ہو جاتے تو ان میں سے کسی اہل تر کو خلیفہ نماز کی امامت کے لئے مقرر کر دیتا۔ یہ بمنزلہ قائد القواد یا سپہ سالار اعظم سمجھا جاتا تھا۔

جب کسی مقام پر جنگ کا خاتمہ ہو جاتا اور پیش قدمی روک دی جاتی تو ان سپہ سالاروں کے فرائض فوجیوں کے معاملات کی نگرانی ان کی ترتیب و مشق اور ان کے اسلحہ و سامان کی اصلاح و عہدگی کی دیکھ بھال ہوا کرتی تھی۔

اسلامی فوج کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ سالار تین دفعہ اللہ اکبر کہتا تھا۔ پہلی تکبیر پر فوج حربہ و ہتھیار سے آراستہ ہو جاتی تھی، دوسری پر لوگ ہتھیار تول لیتے تھے اور تیسرے نعرہ پر حملہ کر دیا جاتا تھا۔ جنگ بویب (۱۳ھ) میں سالار لشکر مثنیٰ نے ابھی دوسری تکبیر نہیں گئی تھی کہ ایرانیوں نے حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمان ضبط نہ کر سکے اور کچھ جوش میں آ کر آگے نکل گئے مثنیٰ نے غصہ میں آ کر داڑھی دانتوں کے نیچے دبا لی اور پکارے ”خدا کے لیے اسلام کو رسوا نہ کرو“۔ اس آواز کے ساتھ فوراً لوگ پیچھے ہٹے اور اپنی جگہ پر ہٹ آئے۔ پھر تیسری تکبیر پر مثنیٰ نے حملہ کیا۔
(الفاروقؓ نبلی نعمانی ص ۱۳۷)

(۶) کمانڈروں کا انتخاب:

اسلامی لشکر کو کئی دستوں (BATALIAN) میں تقسیم کیا جاتا۔ ان دستوں کو چند کہتے تھے۔ اور ان کے قائد یا سالار مقرر کیے جاتے تھے۔ سپہ سالار کو اپنے چھوٹے افسروں کا انتخاب کرتے وقت ان کی حربی مہارت اور سابقہ تجربہ کا ضرور لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ بڑے پایہ کے صحابی تھے۔ زہد و تقویٰ میں خاص مقام رکھتے تھے لیکن طبیعت میں نرمی اور رحم

دلی بہت زیادہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان سے محبت بھی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے بھی افسر بنا دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ ”اے ابوذر! تو کمزور ہے اور افسری امانت ہے۔ جو قیامت کو رسوائی کا باعث بن سکتی ہے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ۔ باب کراہیۃ الامارۃ) اور ایک دوسری روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ ”اے ابوذر! تو بھی میرے جیسا ہی (نرم دل) ہے۔ میں تمہیں دو آدمیوں پر بھی افسر بنانے کو تیار نہیں۔“ اور یہ جو آپ ﷺ نے ”میرے جیسا“ فرمایا تو یہ مشابہت محض نرم دلی کے پہلو سے تھی۔ ورنہ آپ ﷺ میں تو اولی الامر کے جملہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری سال روم کی طرف ایک لشکر تیار کیا اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کا سپہ سالار منتخب کیا۔ اس واقعہ سے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یوں روایت کرتے ہیں:-

((آنحضرت ﷺ نے روم کی طرف ایک لشکر روانہ کیا اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کا سردار مقرر کیا (حالانکہ اس لشکر میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہما بھی شریک تھے۔) لوگوں نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سردار ہونے پر طعنہ مارا۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”اگر تم اسامہ کی سرداری پر طعنہ دیتے ہو۔ تو اس سے پہلے تم اس کے باپ (زید بن حارثہ) کی سرداری میں بھی طعن کر چکے ہو۔ اور قسم خدا کی وہ سرداری کے لائق تھا اور سب لوگوں سے مجھ کو پیارا تھا۔ اس کے بعد (اس کا بیٹا) سب لوگوں سے پیارا ہے۔))

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثًا وَاَمَرَ عَلَيْهِمْ اَسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ فَطَعَنَ النَّاسُ فِي اِمَارَتِهِ وَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنْ تَطَعُنَا فِي اِمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطَعُنُوْنَ فِي اِمَارَةِ اَبِيْهِ مِنْ قَبْلُ وَاَيْمُ اللّٰهِ اِنْ كَانَ لَخَلِيْقًا لِلْاِمَارَةِ وَاِنْ كَانَ لِمَنْ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَيْ وَاِنْ هَذَا لِمَنْ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَيْ بَعْدَهُ))

(بخاری، کتاب المغازی۔ باب بعث النبی اسامہ)

(ابن زید)

لوگوں کی نظر میں صرف یہ بات تھی کہ اسامہ رضی اللہ عنہ صرف بیس سال کا نوجوان ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسے افضل صحابہ ان کی ماتحتی میں کیسے رہ سکتے ہیں؟ اور بعض کو یہ خیال بھی تھا کہ اسامہ غلام زادہ ہو کر بڑے بڑے معززین قریش کا افسر کیسے بن سکتا ہے؟

اس خطبہ میں آپ ﷺ نے دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ جس منصب کے لئے کسی کا تقرر کیا جائے اس منصب کی اہلیتوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ (چنانچہ حضور ﷺ کی زندگی کے بعد خلافت ابوبکرؓ میں لشکر اسامہ بن زید کی سرکردگی میں بھیجا گیا۔ اور فتیاب ہو کر واپس آیا) دوسرے یہ کہ جو امیر مقرر کیا جائے سب کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے۔ خواہ غلام یا غلام زادہ ہو۔ چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ لشکر روانہ کیا تو آپ حضرت اسامہؓ کی اجازت سے اسلامی ریاست کے انتظام کے لئے مدینہ میں رہے۔ حضرت ابوبکرؓ خود حضرت اسامہ کو الوداع کرنے گئے۔ حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ کہتے ہی رہے کہ یا آپ بھی سوار ہو جائیں یا میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں میں سے کوئی بات قبول نہ کی۔ رخصت کرتے وقت فرمانے لگے اگر مناسب سمجھو تو انتظام سلطنت کے لیے عمرؓ کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ حضرت اسامہؓ نے یہ بات بخوشی منظور کر لی۔ (طبری حصہ دوم خلافت ابوبکرؓ)

حضرت اسامہؓ کے والد حضرت زید بن حارثہؓ بھی کئی سرایا سے کامیاب و کامران واپس آئے تھے۔ ان میں جنگی مہارت اور سپہ سالار بننے کے اوصاف موجود تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت زید کو سریہ موتہ میں سالار لشکر بنایا تھا۔ بڑے بڑے صحابی اور خالد بن ولید جیسا جرنیل آپ کی سرکردگی میں اس جہاد میں شریک ہوئے۔ زید بن حارثہؓ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ اور بالآخر خالد بن ولید کے ہاتھ پر اللہ نے فتح دی۔ اس جنگ میں حضرت زید کو سپہ سالار بنانے سے آپ ﷺ کا اہم مقصد یہی تھا کہ قریش کے تفوق کے بت کو پاش پاش کر دیا جائے۔

یہ تو ایک خاص پہلو تھا جس میں امت کی اخلاقی تربیت مقصود تھی۔ عام اصول یہی ہے کہ کمانڈروں کے انتخاب میں بھی سپہ سالار کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لینا چاہئے۔ حضرت عمرؓ کی نگاہ دور رس بھی اس سلسلہ میں بہت تیز تھی۔ اور ہر محاذ پر لشکر روانہ کرتے وقت ان کی نظر کسی اہل تر سپہ سالار پر جا کر ٹکتی تھی۔ تاہم جنگ قادسیہ کے موقع پر انہیں بھی سپہ سالار کے

آپ نے لشکر کی روانگی کے وقت فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفر طیارؓ کو امیر بنا لینا، وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہؓ کو امیر بنا لینا۔ اتفاق کی بات یہ تینوں سپہ سالار اسی ترتیب سے باری باری شہید ہو گئے۔ اس وقت خالد بن ولیدؓ نے خود آگے بڑھ کر جھنڈا سنبھالا۔ اور فائز المرام واپس آئے۔ اسی موقع پر حضور اکرم ﷺ نے انہیں "سیف اللہ" کا خطاب دیا تھا۔

انتخاب کے لیے اہل الرائے سے مشورہ لینا پڑا۔ اسی طرح سپہ سالار کو اپنے لشکر کے لیے کئی چھوٹے بڑے کمانڈر مقرر کرنا پڑتے ہیں۔ اس وقت عدل و انصاف اور باہمی مشورہ سے کام لینا چاہئے۔ اگر سپہ سالار محض اپنی پسند و ناپسند کے مطابق ترقیاں اور درجات عطا کرنا شروع کر دے تو فوج میں انتشار اور بے دلی پھیل جاتی ہے۔

(۷) رازداری اور خفیہ اطلاعات (Secracy + Intelligence):

جس طرح دشمن کی نقل و حرکت اور اس کے حالات سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اپنے حالات اور نقل و حرکت سے دشمن کو حتی الوسع بے خبر رکھا جائے۔ لہذا ایسے ”فوجی راز“ سوائے گنتی کے چند مشیروں اور معتمدان خاص کے کسی کو معلوم نہ ہونے چاہیں۔ حتیٰ کہ فوجی عوام بھی جنگی پالیسی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ فتح مکہ کی تیاری کے دوران اس بات کا اتنا خیال رکھا گیا کہ آپ نے اپنے حلیف قبائل کو جو خفیہ پیغامات بھیجے وہ اس رازداری سے بھیجے گئے تھے کہ عام مسلمانوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ اسی موقعہ پر ایک سچے مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ سے ایک لغزش ہو گئی۔ انہوں نے بھی خفیہ طریق سے ایک عورت کے ہاتھ رقعہ دے کر اہل مکہ کو چڑھائی کے متعلق آگاہ کرنا چاہا تھا۔ جس سے اس صحابی کی غرض محض اس ”احسان“ کے بدلے اپنے بال بچوں کی حفاظت تھی۔ حضور اکرم ﷺ کو وحی کے ذریعہ اس واقعہ کی خبر مل گئی۔ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعاقب میں روانہ کیا جنہوں نے اس عورت سے بجز رقعہ برآمد کر لیا۔

رازداری کی اہمیت یہ ہے کہ بعض دفعہ محض ایک راز کے لیک آؤٹ ہو جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے۔ اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک عام حکم دے دیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُؤًا مَا عَيْنُكُمْ﴾
 (اے مومنو! اپنے علاوہ کسی دوسرے کو راز دار نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری بربادی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور چاہتے ہیں کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔)
 (۱۱۸:۳)

آپ کی رازداری کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے ۲ھ میں ۱۲ آدمیوں کا ایک گشتی دستہ

حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں روانہ کیا تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک سربمہر لٹافہ دیا اور حکم دیا کہ تین دن بعد تم نخلہ کے مقام پر پہنچ جاؤ گے۔ وہاں جا کر اسے کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ تین دن بعد جب حضرت عبداللہؓ نخلہ پہنچ گئے تو لٹافہ کھول کر دیکھا تو لکھا تھا کہ قریش کی نقل و حرکت کے متعلق پوری واقفیت حاصل کر کے واپس آ کر مجھے اطلاع دو؟ (یہ واقعہ ”طلایہ گردی“ کے عنوان کے تحت ذرا تفصیل سے گزر چکا ہے)

آپ ﷺ جو فوجی دستے روانہ کرتے ان کو قبل از وقت معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس انداز تربیت سے مجاہدین میں بھی فوجی راز کو راز رکھنے کی اہلیت پیدا ہو گئی۔

آپ ﷺ کو جب کبھی غزوہ پر جانا ہوتا تو عموماً غیر معروف اور پر پیچ راستے اختیار فرماتے۔ جس کا مقصد محض یہ ہوتا تھا کہ دشمن آپ ﷺ کی نقل و حرکت سے مطلع نہ ہونے پائے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ آپ ﷺ کی منزل تو کوئی اور ہوتی اور آپ ﷺ استفسارات کسی دوسرے مقام کے متعلق کرتے۔ یا مہم اور ذمہ معنی الفاظ استعمال کرتے۔ حضرت کعب بن مالکؓ کہتے ہیں:-

((وَلَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيْدُ غَزْوَةً اِلَّا وَرَىٰ بِغَيْرِهَا)) فرماتے تو کسی اور موقع کا تو یہ فرماتے (بخاری۔ کتاب المغازی۔ غزوہ تبوک)۔
(اور آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے۔)

علاوہ ازیں آپ ﷺ نے غزوہ نبی مصطلق میں پوشیدہ تحریر کا طریقہ ایجاد کیا طبری ج ۲ ص ۶۰۶ رازداری کے اس طریق سے دنیا پہلے متعارف نہ تھی یہی طریق ترقی کر کے آج کل Code Words کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

اسی رازداری کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ جہاں اپنی نقل و حرکت کو حتی الامکان صیغہ راز میں رکھا جائے وہاں دشمن کے حالات سے متعلق زیادہ سے زیادہ صحیح اور مستند خبریں مہیا کی جائیں۔ عبداللہ بن جحشؓ کے واقعہ میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے سربمہر لٹافہ دیا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ”دشمن کے حالات معلوم کر کے بواپسی اطلاع دی جائے۔“

دشمن سے متعلق موصول شدہ اطلاعات کی صحت کے متعلق آپ کو اتنا اہتمام تھا کہ آپ ﷺ نے صرف ان فوجی دستوں کی اطلاعات کو ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ مختلف حلیف و حریف قبائل

میں آپ ﷺ کے ایسے آدمی موجود تھے جو آپ ﷺ کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ مکہ جیسے مرکزی شہر میں نامہ نگار متعین کیا۔ جو خفیہ طور پر آپ ﷺ کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتا تھا۔ آج کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ کا Intelligence Dept. بھی اپنے دشمن کی نسبت بہت زیادہ متحرک اور فعال تھا۔

(۸) فوجی تربیت:

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی فوج کی فوجی تربیت پریڈ اور لیفٹ رائٹ کے انداز سے نہیں فرمائی بلکہ اس کی ابتدا نماز سے کی گئی۔ عسکری نقطہ نظر سے نماز سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:-

(۱) صف بندی، صفوں کی درستی پر آپ ﷺ خصوصی توجہ فرماتے تھے اور اس درستی کو نماز کا حصہ قرار دیا گیا۔

(۲) اطاعت امیر اور ڈسپلن، نماز میں امام کی تکبیر پر سب کو بلاچون و چرا امام کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ سب نمازیوں کی تمام حرکات ایک ساتھ عمل میں آئیں۔ اور لحظہ بھر کی بھی تقدیم و تاخیر گوارا نہیں۔ یہ دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے سامنے اظہار عبودیت اور اطاعت امیر اور ڈسپلن کی مسلسل اور ناقابل فراموش مشق ہے۔

(۳) رابطہ باہمی، نماز سے اس ”اسلامی تلخوج“ کا آپس میں مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے۔ جو باہمی موانست، محبت اور یک جہتی کا بہت بڑا سبب ہے۔

(۴) وقت کی پابندی کیونکہ نماز کی مقررہ اوقات پر پابندی بھی فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ طے شدہ پروگرام میں چند منٹ کی تاخیر بھی فتح کو شکست میں تبدیل کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

(۵) طہارت اور پاکیزگی، نماز کی ادائیگی سے پہلے طہارت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ جو

۱۔ جنگ احد سے متعلق قریش مکہ کی تیاری کی خفیہ رپورٹیں آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے بہم پہنچائی تھیں۔ اگرچہ ان دنوں کافر تھے۔ (تاریخ اسلام حصہ ۴۲ از پروفیسر حمید الدین)

۲۔ آج کل عام حالات میں دن میں دو بار فوجی جوانوں کو Fall in کر کے حاضر کرائی جاتی ہے۔

سپاہیانہ زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔

(۶) ضابطہ اخلاق کی پابندی نماز کا یہ خاصہ ہے کہ اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو یہ برے کاموں سے روکتی ہے۔ اسلامی فوج کے لئے ضابطہ اخلاق کی پابندی بھی بہت ضروری چیز ہے۔ اور سالار لشکر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ فوج کی اخلاقی تربیت بھی کرے۔ یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنا پر عین دوران جنگ بھی نماز اسی طرح فرض ہے جس طرح عام حالات میں فرض ہے گواس میں تخفیف کر دی گئی ہے۔

فوجی تربیت کے لئے دوسرا اہم اقدام ”روزہ“ قرار دیا گیا ہے۔ ”روزہ“ انسان میں قوت برداشت پیدا کرتا ہے یہ ایک ماہ کا تربیتی کورس ہے بسا اوقات سفر میں فوج کو سامان خوراک کی قلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسے وقتوں میں صبر و ثبات پیدا کرنے کے لئے روزہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

روزہ جہاں صبر و ضبط پیدا کرتا ہے وہاں دوسرے لوگوں کی ایسی تکالیف کا احساس بھی بیدار کرتا ہے جس سے انسان میں خود غرضی کے بجائے ایثار کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا اہم اقدام ”زکوٰۃ“ ہے جو معاشی ناہمواریوں کو ختم کرتی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت امیر طبقہ میں ہی گردش نہ کرتی رہے۔ امیر کو غریب کا احساس ہو۔ فاتح جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو اموال غنائم کو وہ اپنا ذاتی حق سمجھ کر جس طرح چاہتا ہے۔ اُسے تصرف میں لاتا ہے اور اس کا کچھ حصہ سرداران لشکر میں تقسیم کر دیتا ہے اور دولت امراء میں ہی رہ جاتی ہے جو اسلامی روح کے منافی ہے۔ اسلام اموال غنائم سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ جو عموماً غریبوں کی فلاح و بہبود پر ہی خرچ ہوتا ہے باقی غنیمت کے یکساں حصے کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود حضور اکرم ﷺ کو بھی لشکری کے برابر حصہ ملتا تھا۔ دولت سے محبت کم کرنے کے لئے زکوٰۃ ایک موثر ذریعہ ہے۔

چوتھا اقدام ”حج“ ہے جو ایک عالم گیر بین الاقوامی اجتماع ہے۔ جہاں مسلمان مل کر پیش آمدہ مسائل پر غور و خوض کر کے اس کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ اور جس کے بعد نہ جنیوا کانفرنس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور نہ رباط کانفرنس کی۔ افسوس ہے کہ آج کا مسلمان حج کے عظیم فوائد سے یکسر غافل ہے۔

اور پانچواں اقدام ”جہاد“ جس کی تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ نے لاگ مارچ کی کئی دفعہ مشقیں کرائیں۔ وہ گشتی دستے جو آپ ﷺ علاقہ کے نشیب و فراز سے واقفیت بہم پہنچانے کی غرض سے بھیجتے تھے۔ سب لاگ مارچ کی نوعیت کے ہوتے تھے۔

الغرض اسلام نے جو فرائض مقرر کیے ہیں انہیں اگر کما حقہ بجایا جائے تو فوجی تربیت از خود ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح عبادات میں جہاد کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جہاد میں عبادات کا رنگ پیدا کرتا ہے۔

(۹) فوج میں بھرتی کے قواعد

ابتدائے اسلام میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان میں سے جو لوگ لڑائی کے قابل تھے ”جہاد“ قرار دیے گئے۔ ان میں مندرجہ ذیل صفات کا ہونا ضروری تھا:-

(۱) مسلمان ہو:

یہ ایک عام اصول تھا جس میں کچھ مستثنیات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً جنگ حنین میں مکہ کے نو مسلموں کے علاوہ کچھ غیر مسلم بھی شامل تھے۔ اسی طرح دور فاروقی میں جنگ قادسیہ میں مشرک بھی مسلمانوں کے ساتھ تھے اور فتح حاصل کر چکنے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ فوج کے کلیدی مناصب کسی غیر مسلم کے حوالہ نہیں کیے جاسکتے۔ اشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُونَكُمْ بِحَسَنَاتٍ وَذُورُوا فِيهَا﴾ (۱۱۸:۳)

(اے ایمان والو! کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنا راز نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کو تباہی نہیں کرتے۔ اور

چاہتے ہیں کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔)

گو حکومت کے دوسرے محکموں میں بھی بعض امور کو صیغہ راز میں رکھنا پڑتا ہے مگر محکمہ فوج میں راز اور رازداری کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بعض دفعہ صرف ایک راز کے فاش ہونے سے ملک کی قسمت بدل جاتی ہے۔ لہذا حتی الوسع یہ کوشش ہونی چاہئے کہ فوج میں غیر مسلم بھرتی نہ کئے جائیں اور اگر بفرض محال ان کی ضرورت آ بھی پڑے تو کلیدی اسامیاں ہرگز غیر مسلموں کے

حوالہ نہیں کی جاسکتیں۔

غزوہ بدر کے دوران آپ ﷺ کو ایک ایسا شخص ملا جو بہادری میں مشہور تھا۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ اموالِ غنیمت سے حصہ حاصل کر سکے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے؟“ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوٹ جا۔ میں مشرک کی مدد نہیں چاہتا۔ تھوڑی دور آگے چل کر پھر یہی سوال جواب ہوئے تو بھی آپ ﷺ نے اس کی مدد لینے سے انکار کر دیا آگے بڑھے تو پھر یہی سوال و جواب ہوئے۔ اب کی بار اس نے جواب دیا کہ ”میں اللہ اور اس کے رسول پر یقین رکھتا ہوں“۔ تب آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ (مسلم، باب کراهية الاستعانة في الغزو و بكافر) حالانکہ اس وقت آپ ﷺ کو افرادی قوت کی سخت ضرورت تھی۔

تاہم اس میں اتنی گنجائش ضرور ہے کہ کافر اگر مشرک نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کی خیر خواہی کا بھی یقین ہو تو اسے فوج میں شامل کیا جاسکتا ہے حضور اکرم ﷺ نے صفوان بن امیہ سے جنگ حنین میں مدد لی۔ جبکہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے (امام نووی) تحت شرح حدیث مذکورہ (۲) مرد ہو:

لڑنے والی فوج یا مجاہدین میں عورتوں کو بھرتی نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم میں جہاد کے متعلق جتنی آیات آئی ہیں سب میں صرف مردوں سے خطاب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں میدانِ جنگ میں لڑنے کی مکلف نہیں ہیں اور انہیں اصولاً غیر مجاہد قرار دیا گیا ہے:-

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:-

((قَالَتْ اسْتَاذَنْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجِهَادِ وَقَالَ: جِهَادُ كُنَّ عَوْرَتُونَ كَالْجِهَادِ وَالسِّرِّ - باب عورتوں کا جہاد حج کرنا ہے (اس میں تم کو جہاد النساء) جہاد کا ثواب ملے گا))

خلافت راشدہ کے چالیس سالہ دور میں ہمیں ایک مثال ایسی ملتی ہے جہاں کسی عورت نے معرکہ کارزار میں حصہ لیا ہے اور وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جنگ جمل میں شمولیت اور قیادت ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے جذبہ سے شدید متاثر

ہو کر جنگ میں شمولیت اختیار کی تو حضرت علیؓ نے آپ کو لکھا کہ:-

((فَأَنْتَكَ خَرَجْتَ غَاظِبَةً لِلَّهِ وَ لِرَسُولِهِ
تَطْلُبِينَ أَمْرًا كَانَ عَلَيْكَ مَوْضُوعًا-
مَا بَالَ النِّسْوَةَ وَالْحَرْبَ وَأَضْلَاحَ بَيْنَ
النَّاسِ -)) (الامامہ والسیاسیہ ابن تیمیہ ص ۷۰)
(آپ اللہ اور اس کے رسول کے حکم قصاص کے لئے غضبناک ہو کر ایک ایسے معاملہ کے لئے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں کے درمیان مصالحت سے کیا تعلق؟)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ صحابی جو اس جنگ میں غیر جانب دار رہے تھے نے اس واقعہ کے متعلق یوں کہا تھا کہ:-

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھرانہ کے ہودج سے بہتر ہے۔“

(حوالہ ایضاً ص ۶۰)

اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس شمولیت کا زندگی بھر افسوس رہا۔ جب یہ آیت ”فی یونکن“ کی تلاوت فرماتیں تو اتنا روتیں کہ دوپٹہ بھیگ جاتا۔
(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۹۱)
البتہ عورتیں بالواسطہ جنگ میں حصہ لے سکتی ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(۳) بالغ اور سلیم العقل ہو:

بچوں اور دیوانوں کو اس وقت تک جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جب تک کہ وہ بالغ اور تندرست نہ ہو جائیں۔ جنگ بدر سے متعلق حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے:-

((أُسْتَصْفِرْتُ أَنَا وَابْنُ عَمْرٍ -)) (بخاری (میں اور عبداللہ بن عمر دونوں) بدر کے

کتاب المغازی۔ باب عدة اصحاب بدر) (دن) چھوٹے سمجھے گئے۔)

رسول اللہ ﷺ لڑائی میں جانے سے پیشتر جہاد میں شامل ہونے والی فوج کو ملاحظہ فرماتے۔ جو لڑائی کے قابل نہ ہوتے انہیں منظور نہ کرتے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی عمر ۱۳ برس تھی۔ آپ ﷺ نے منظور نہ کیا۔ پھر احد کے دن پیش کیے گئے جبکہ ۱۴ برس کے تھے تب بھی آپ ﷺ نے انہیں اجازت نہیں دی۔ اور جنگ خندق کے وقت آپ ﷺ کی عمر

پندرہ سولہ برس کی تھی۔ اس وقت آپ کو اجازت مل گئی۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب غزوة الحندق)

جنگ احد کے موقع پر جب عبداللہ بن ابی منافق اپنے تین سوساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے باقی ماندہ فوج کا جائزہ لیا۔ اور مندرجہ ذیل پانچ محسن صحابہ ﷺ کو اس بنا پر فوج سے خارج کر دیا۔ کہ وہ ابھی حد بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔

حضرت زید بن ثابت ؓ، حضرت عبداللہ بن عمر ؓ، حضرت عرابہ اوسی ؓ، حضرت ابوسعید خدری ؓ اور حضرت براء بن عازب ؓ۔

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت وقت عمر کے متعلق یہ تعین کر سکتی ہے کہ اتنی عمر سے کم بھرتی نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) قد و قامت اور جسمانی طاقت:

اسی موقعہ پر جب حضور اکرم ﷺ فوج کا جائزہ لے رہے تھے تو چند نوجوز اور شوق جہاد سے سرشار نوجوانوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے اجازت حاصل کر لی ان میں سے ایک رافع بن خدیج ہیں۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو تو آپ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے تاکہ قد پورا نظر آئے۔ آپ کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ تو ایک دوسرے نوجوان سمرہ نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ میں رافع سے کسی طرح کم نہیں اور میں اسے کشتی میں پچھاڑ سکتا ہوں۔ اگر رافع کو اجازت مل گئی ہے تو مجھے بھی ملنی چاہئے۔ چنانچہ ان دونوں میں کشتی کرائی گئی۔ فی الواقع سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ لہذا انہیں بھی اجازت مل گئی۔ (طبری ج ۲ ص ۱۳۹۱) یہ تھا ان پاک باز ہستیوں کا شوق جہاد۔ عمر اور قد سے متعلق یہ واقعات سب کتاب تاریخ مثلاً طبری، ابن ہشام اور البدایہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

- (۱) حکومت مجاہدین کے قد اور جسمانی طاقت کا ایک معیار قائم کر سکتی ہے۔
- (۲) اگر کسی نوجوان میں کسی ایک پہلو میں معیار سے کچھ کمی بھی ہو۔ لیکن وہ جذبہ جہاد سے سرشار ہو تو متعلقہ افسر اس کی بھرتی کی اجازت دے سکتا ہے۔

(۵) صحت مند ہو اور اعضاء و جوارح سالم ہوں:

قرآن کریم نے واضح طور پر اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کو جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ سورہ فتح میں ارشاد ہے:-

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرْجٌ وَلَا عَلَىٰ الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَىٰ الْمُرِيضِ حَرْجٌ﴾ (۱۷:۳۸)
 (نہ اندھے پر نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے (کہ وہ سفر جنگ سے پیچھے رہ جائے)۔)

نور سورہ توبہ میں کمزور اور ناتوان، بوڑھوں اور بیماروں کے علاوہ ان لوگوں کو بھی جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جو مالی حیثیت سے کمزور ہیں۔ نہ گھر میں خرچ کرنے کو کچھ موجود ہے اور نہ زادراہ یا اسلحہ جنگ کے لئے کچھ پس انداختہ رقم۔ ایسے اشخاص کا بروقت اگر کچھ ہندو بست ہو جائے تو خیرور نہ جہاد ان سے ساقط ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ حَرْجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۹:۹۱)
 (ضعیفوں، بیماروں اور خرچ سے معذور لوگوں پر اگر وہ شریک جہاد نہ ہوں تو کچھ گناہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خیر اندیش ہوں۔)

آج کل چونکہ اطمینان و رومی زادراہ اور پس ماندگان کی کفالت کی حکومت خود مددگار ہوتی ہے لہذا اخراجات کی کمی سے متعلقہ شق قابل غور نہیں رہی۔

(۶) والدین کی اجازت:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:-

((جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَأْذَنَهُ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ: أَحَىٰ وَالْبَدَاكُ؟ قَالَ: نَعَمْ! قَالَ: فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ)) (بخاری، کتاب الجہاد والسیر - باب الجہاد باذن الوالدین)

(ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے پوچھا؟ تیرے والدین زندہ ہیں؟ کہنے لگا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تو پھر جہاد کرو ان دونوں کی خدمت بجالا"۔ (یہی تیرا جہاد ہے))

اور یہ شرط اس وقت بالخصوص ضروری ہو جاتی ہے۔ جبکہ والدین بوڑھے ہوں اور انہیں

خدمت کی ضرورت ہو۔

(۷) تعلیم اور کردار:

دور نبوی ﷺ میں کسی بھرتی ہونے والے مجاہد کی تعلیم کا ٹیسٹ یا معیار ضروری نہ تھا۔

وجہ یہ تھی کہ سب صحابہ ﷺ قرآن کی تعلیم کے شیدائی اور اس کے عامل تھے۔ اور معرکہ کارزار میں شمولیت ہی ان سب باتوں کا واضح ثبوت تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج اسلامی ممالک میں بھی بھرتی کے وقت ریکروٹ کے اخلاق دینی تعلیم یا ارکان اسلام کی پابندی سے متعلق پوچھا تک نہیں جاتا۔ اس کے بجائے محض محکمہ تعلیم کے سرٹیفکیٹ دیکھے جاتے ہیں۔ اور بھرتی کے بعد محکمہ پولیس کی معرفت اس بات کی تسلی کر لی جاتی ہے۔ کہ ریکروٹ کسی بڑے جرم میں ماخوذ تو نہیں۔ ایسے تعلیمی اور کریکٹر سرٹیفکیٹوں کی افادیت اپنی جگہ اہم ہی سہی لیکن ایک مجاہد بھرتی کرتے وقت اس کی دینی تعلیم اور اس کے ”ثبوت کردار“ کا بھی جائزہ لینا چاہئے اور اسی لحاظ سے اسے عہدہ اور ترقی دینا چاہئے۔

(۱۰) عورتوں کی جہاد میں بالواسطہ شمولیت

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ عورتیں اصولاً جہاد کے فریضہ سے مستثنیٰ ہیں۔ تاہم عند الضرورت وہ میدان جنگ میں جا کر زخمیوں کو سنبھالنے، ان کی مرہم پٹی کرنے کے لیے پانی یا دوسری اشیائے ضرورت مہیا کرنے کی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔

”جنگ احد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہما اپنی پنڈلیاں کھولے جلدی جلدی پانی کی مشکیں پیٹھ پر لا کر لاتیں اور مسلمانوں کو پلا کر پھر لینے چلی جاتیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کا زخم دھو رہی تھیں اور چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھردی تاکہ خون قہم جائے۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جنگ احد میں ہمارا کام یہ تھا کہ ہم لوگوں کو پانی پلاتے، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے اور جو لوگ مارے جاتے ان کی لاشیں مدینہ کو لاتے تھے۔“

(بخاری کتاب الجہاد والسیر۔ باب جہاد النساء)

یہ تمام احادیث ایسی ہیں جن سے عورتوں کی میدان جنگ میں محض شمولیت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن درج ذیل حدیث اس کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ حشر بن زیاد رضی اللہ عنہ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں:-

((غزوہ خیبر میں ہم کچھ عورتیں بھی جہاد کے لیے ساتھ ہوئیں۔ حضور اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ہمیں بلا بھیجا۔ ہم گئیں تو آپ ﷺ نے پوچھا: ”تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے علم سے آئیں؟“ ہم نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم سوت کاتی رہیں تاکہ اس کی اجرت سے اللہ کی راہ میں مدد کر سکیں ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوا میں ہیں۔ اور ہم تیرا اٹھا اٹھا کر لائیں گی اور پیاسوں کو سستو پلائیں گی۔“ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ”اچھا ٹھہری رہو۔“ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہاتھ خیبر فتح کیا۔ تو آپ ﷺ نے مردوں کی طرح ہمارا بھی (مال غنیمت سے) حصہ نکالا۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا دادی یہ حصہ کیا تھا؟ اس نے کہا ”کھجوریں۔“)

((أَنَّهَا خَرَجَتْ فِي غَزْوَةِ خَيْبَرَ نِسْوَةً فَبَلَغَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَعَثَ إِلَيْنَا فَجِئْنَا فَرَأَيْنَا فِيهِ الْغَضَبَ فَقَالَ: بِمَعِ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِإِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ؟ فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشُّعْرَ وَنُعِينُ بِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَعَنَا دَوَاءٌ لِلْجُرْحَىٰ وَنَنَاوِلُ السِّهَامِ وَنُسْقِي السُّوْبُقِ. فَقَالَ قُمْنَ— حَتَّىٰ إِذَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ خَيْبَرَ أَسْهَمَ لَنَا كَمَا أَسْهَمَ لِلرِّجَالِ. قَالَ فَقُلْتُ لَهَا: يَا جَدَّةُ: وَمَا كَانَ ذَلِكَ؟ قَالَتْ تَمْرًا—)) (ابوداؤد کتاب الجہاد۔ باب فی المرأة والعبد یخدمان من الغنیمۃ)

مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں میدان جنگ میں مندرجہ ذیل خدمات سرانجام دے سکتی ہیں:-

(۱) زخمیوں کی تیمارداری۔ مرہم پٹی، زخمیوں اور بیماروں کو چھچھے محفوظ مقامات تک

۱۔ زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری میں عورتیں اپنی نرم طبیعت کی بنا پر مردوں سے عموماً زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اور شاکد وہ اس معاملہ میں مردوں سے دلچسپی بھی زیادہ رکھتی ہیں۔ غزوہ بنو قریظہ میں قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ تیرے شہید زخمی ہو گئے۔ زخم سے خون تھمتا نہ تھا۔ ایک عورت رفیدہ نامی زخموں کے علاج میں شہرہ رکھتی تھی اور اس کا کلیئک، محض ایک سانبان تھا، مسجد نبوی کے بالکل قریب تھا۔ رسول اللہ نے علاج کی سہولت کے پیش نظر حضرت سعد بن معاذ کا خیمہ مسجد نبوی میں ہی لگوا دیا تھا۔ تاکہ ہر وقت رفیدہ کی نگہداشت میں رہ سکیں۔ مگر انہوں نے حضرت سعد اس کی کاری زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ (لابن جریر ذکر رفیدہ بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۴۲) جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت عورت مرد کا اور اسی طرح مرد عورت کا علاج کر سکتے ہیں۔

پہنچانے کا بندوبست لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا انتظام۔

(۲) مجاہدین زخمیوں اور بیماروں کے پینے کے لئے پانی کا فراہم کرنا۔ ان کی خوراک تیار کر کے دینا۔ اور خوردونوش سے متعلق کام سرانجام دینا۔

(۳) مجاہدین کو اسلحہ جنگ موقعہ پر مہیا کرنا۔ میدان جنگ میں گرا پڑا اسلحہ اکٹھا کر کے مجاہدین کو دوبارہ استعمال کے لئے بنادیا نیا اسلحہ اگر کہیں دور ہو تو اسے ان تک پہنچانا۔

گویا مجاہدین کا اصل کام حملہ کرنا یا دفاع کرنا ہوتا ہے اس اصل کام کو سرانجام دینے کے لیے یا جنگ سے پیدا ہونے والے نتائج کے لیے جس قدر امدادی کاموں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان میں عورتیں بھی ہاتھ بنا سکتی ہیں۔ تاہم یہ یاد رہے کہ عورتیں یہ کام یا تو رضا کارانہ طور پر سرانجام دے سکتی ہیں (جیسا غزوہ خیبر میں ہوا) یا حالات کی نزاکت کے پیش نظر (جیسا کہ جنگ احد میں ہوا) یعنی اشد ضرورت کے وقت ان سے یہ کام لیے جاسکتے ہیں۔ عام حالات میں اصول یہی ہے کہ عورتیں باقاعدہ فوج کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی غنیمت سے ان رضا کار عورتوں کو صرف کھجوریں (جائیداد منقولہ کا حصہ) دیا۔ حالانکہ مجاہدین کو خیبر کی زمین (جائیداد غیر منقولہ) بھی تقسیم ہوئی تھی۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عورتوں کو مستقل طور پر فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ عند الضرورت وہ امدادی کاموں میں رضا و رغبت سے حصہ لے سکتی ہیں اور ان سے ایسے کام لیے بھی جاسکتے ہیں۔ جن کا انہیں معاوضہ ادا کیا جانا چاہئے۔ تاہم اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عورتوں کی شمولیت سے فوج میں فحاشی کے رجحانات کا فروغ نہ ہونے پائے۔

عورتوں کی طرح لڑکے کے بھی خدمت گزاری کے لئے جنگ میں لے جائے جاسکتے ہیں۔ لیکن انہیں بھی اموال غنیمت میں سے انعام کے طور پر کچھ دیا جاسکتا ہے۔ اموال غنیمت سے باقاعدہ حصہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہی گئی کہ عورتوں اور لڑکوں کی شمولیت اور حصہ غنیمت کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے جواب دیا کہ:-

((وَسَأَلْتُ عَنِ الْمَرْأَةِ وَالْعَبْدِ هَلْ كَانَ لَهَا سَهْمٌ مَعْلُومٌ إِلَّا أَنْ يُحْدِثَ يَأْمِنَ غَنَائِمِ الْقَوْمِ.)) (مسلم) کتاب الجہاد والسر۔ باب النساء الغازیات یرضح لهن ولا ینسہم

(اور تو نے پوچھا عورت اور لڑکے کو کوئی حصہ ملے گا اگر وہ لڑائی میں شریک ہوں تو ان کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا مگر انعام کے طور پر غنیمت میں سے۔)

یہاں تک تو میدان جنگ میں عورتوں کی امدادی کارروائیوں کا ذکر تھا۔ اب ہم دور نبوی کا ایک ایسا واقعہ پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لڑائی میدان جنگ کے بجائے محفوظ شہری آبادیوں میں داخل ہو جائے تو دفاع کے طور پر عورتوں کو بھی..... اگر وہ کر سکیں تو..... ایسا ہی کردار ادا کرنا چاہئے جیسا کہ مجاہد ادا کرتے ہیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری کا کارنامہ:

جنگ احزاب کے موقع پر بنو قریظہ معاہدہ کی حیثیت سے مدینہ میں رہ رہے تھے۔ لیکن بدعہدی کر کے 'اتحادیوں' سے مل گئے۔ ایک یہودی نے مسلمانوں کو مصروف جہاد دیکھ کر اس قلعہ پر جس میں مستورات پناہ گزین تھیں۔ حملہ کر دیا حضرت حسان بن ثابت اس قلعہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اتر کر اس کو قتل کر دو"۔ حضرت حسان کسی عارضہ کی وجہ سے لڑائی سے گھبراتے تھے۔ کہنے لگے اگر میں ایسا کر سکتا تو میدان جنگ میں ہوتا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے خیمہ کی چوب اکھاڑی اور اس زور سے یہودی کے سر پر ضرب لگائی کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا اس کے ہتھیار اور کپڑے اتار لاؤ۔" حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" آخر صفیہ رضی اللہ عنہا نے خود ہی اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ یہودیوں کو یقین ہو گیا اس قلعہ میں مسلمان فوج متعین ہے۔ لہذا انہیں پھر حملہ کی جرأت نہ ہوئی۔

(طبری ج ۱۔ جنگ خندق)

ام عمارہ رضی اللہ عنہا کی بہادری کا کارنامہ:

جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ تو افراتفری مچ گئی۔ عورتیں بھی گھروں سے میدان جنگ میں نکل آئیں جو امدادی کام سرانجام دے رہی تھیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا تھیں جو زخموں کو پانی پلا رہی تھیں۔ آپ نے مشک اتار کر پھینک دی، تلوار کھینچ لی اور حضور ﷺ کے دفاع میں لڑنے لگیں۔ اس دن انہیں تیرہ زخم پہنچے اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئیں۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو ناپنے خاوند سے متعلق پوچھا اور نہ بیٹے

کے متعلق جو اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں لڑ رہے تھے۔ اگر پوچھا تو یہ کہ: کیف حال الرسول یعنی رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں؟ (بخاری کتاب المناقب۔ ذکر ام سلیط)۔
 موجودہ دور میں جنگ کے دوران عموماً دشمن کے بمبار جہاز آتے ہیں۔ اور جنگی یا شہری آبادیوں کو خبر کیے بغیر بمبار منٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی فضائی حملہ سے بچاؤ کی تدابیر (A.R.P) اور ابتدائی طبی امداد کے کورس کروائے جائیں۔ تاکہ عورتیں بھی اپنی دفاعی ذمہ داریاں پوری کر سکیں۔

(۱۱) آلات حرب کی مسلسل مشقیں

جہاد کی تیاری کے سلسلہ میں آلات حرب کی فراہمی ان کا استعمال اور ان کی مسلسل مشق بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں کو اس طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔
 فرمایا:-

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ وَعَدُّوا لَهُمْ وَعَدُّوا حُمْمٌ﴾ (۸: ۶۰)
 (اور ان دشمنوں کے لئے جہاں تک ممکن ہو حربی قوت اور گھوڑے تیار رکھنے سے مستعد رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کے اور تمہارے دشمن دہشت زدہ اور سہمے رہیں۔)

دور نبوی ﷺ میں آلات حرب صرف تیر و کمان نیزہ، تلوار اور اپنے دفاع کے لئے ڈھال زرہ اور خود پر مشتمل ہوتے تھے۔

دور جاہلیت کے عرب تیر اندازی میں ماہر تھے۔ یاہمی جنگوں اور شکار کے مرغوب شغل نے انہیں اس کام میں اتنا ماہر بنا دیا تھا کہ اگر کوئی چاہتا کہ ہرن کی آنکھ کو نشانہ بنائے تو وہ اس میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

تیر، نیزہ اور تلوار کے علاوہ جیشی لوگ ایک اور قسم کا ہتھیار چلانے میں مہارت رکھتے تھے۔ جسے حرابہ کہتے تھے۔ یہ گول شکل کا تیز دھار والا ہتھیار جب استعمال کیا جاتا تو لٹو کی طرح اپنے گرد گھومتا ہوا تیزی سے دشمن کی طرف بڑھتا تھا۔ اور دشمن تک پہنچ کر اس کے جسم میں بیوست ہو جاتا یا پار نکل جاتا اور اسے مار دیتا۔

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ان سب آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کرنے کی

تلقین فرمائی۔ سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ:-

نبی کریمؐ اسلم قبیلے کے کئی لوگوں پر گزرے جو (دو گروہ ہو کر) تیر مار رہے تھے۔ (تیر کی مشق کر رہے تھے) آپؐ نے فرمایا۔ اے بنی اسمعیل! تیر اندازی کی مشق کیا کرو کیونکہ تمہارے باپ اسمعیل تیر انداز تھے۔ اور میں اس گروہ کی طرف ہوتا ہوں یہ سن کر دوسرے گروہ نے کھیل ختم کر دیا۔ آپؐ نے تو انہیں کہا۔ تیر کیوں نہیں چلاتے۔ وہ کہنے لگا کیسے چلائیں آپؐ دوسرے فریق کے ساتھ ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ”اچھا میں تم سب کے ساتھ ہوں۔ تیر چلاؤ (مشق جاری رکھو)

((مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيَّ نَفَرٍ مِنْ أَسْلَمٍ يَنْتَصِلُونَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِرْمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ فَإِنَّ آبَاءَكُمْ كَانُوا رَامِيًا اِرْمُوا وَأَنَا مَعَ بَنِي فُلَانٍ فَأَمْسِكْ أَحَدَ الْفَرِيقَيْنِ بَأْيْدِيهِمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا لَكُمْ لَا تَرْمُونَ؟ قَالُوا كَيْفَ نَرْمِي وَأَنْتَ مَعَهُمْ؟ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِرْمُوا فَأَنَا مَعَكُمْ كُلَّكُمْ))

(بخاری کتاب الجہاد والسریر باب التحریر علی الرمی)

جنگی فنون سے آپؐ کی دلچسپی کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی بخوبی ہو سکتا

ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:-

(ایک بار ایسا ہوا کہ حبشی لوگ آنحضرت ﷺ کے سامنے برجیوں سے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آئے اور یہ دیکھ کر کنکر پوں کی طرف جھکے اور ان پر کنکر مارے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ”عمرؓ ان کو کھیلنے دے۔“ علیؓ نے عبدالرزاق سے انہوں نے عمرؓ سے اتنا زیادہ کیا کہ ”یہ کھیل مسجد میں ہو رہا تھا۔“)

((بَيْنَا الْجَبَشَةُ يَلْعَبُونَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ وَسَلَّمَ بِحَرَابِهِمْ دَخَلَ عُمَرُ فَاهْوَى إِلَى الْحَصَى فَحَصَبَهُمْ بِهَا فَقَالَ: ”دَعُهُمْ يَا عُمَرُ!“ وَزَادَ عَلِيٌّ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَاقِ أَخْبَرَنَا مَعْمَرُ فِي (المسجد-))

(بخاری کتاب الاضباب اللہو بالحراب و'نحوها)

حضرت عمرؓ نے مسجد کے احترام کی وجہ سے حبشیوں کو روکنا چاہا تھا لیکن حضور

اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو روک کر یہ واضح کر دیا کہ حربی فنون کی مشقیں مسجد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ آپؐ فرماتی ہیں:-

((وَكَانَ يَوْمَ عَيْدِ يَلْعَبُ السُّودَانُ بِالذَّرْقِ وَالْحَرَابِ فَمَا سَأَلَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَمَّا قَالَ لِي "تَشْتَهِيْنَ أَنْ تَنْظُرِي؟" فَقُلْتُ "نَعَمْ" فَأَقَامَنِي وَرَأَى عَدِيَّ عَلَى عَدِهِ وَ يَقُولُ: "ذُؤُنُكُمْ بَنِي إِزْفَدَةَ" حَتَّى إِذَا مَلَيْتُ قَالَ: حَسْبُكَ؟ قُلْتُ: "نَعَمْ"! قَالَ "فَأَذْهَبِي" --)) (بخاری حوالہ ایضاً)

(یہ عید کا دن تھا۔ حبشی سپہ اور برچھوں سے کھیل رہے تھے یا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی یا آپ ﷺ نے خود ہی فرمایا۔ "کیا تو یہ تماشا دیکھنا پسند کرتی ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں"۔ آپ ﷺ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ میرا گال آپ ﷺ کی گال پر تھا اور آپ ﷺ حبشیوں سے فرما رہے تھے "بنی ارفدہ! کھیل تماشا جاری رکھو"۔ میں تماشا دیکھتے دیکھتے خود ہی تھک گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ "بس طبیعت سیر ہو گئی؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اچھا چلی جاؤ"۔)

تلوار کے استعمال سے آپ ﷺ کو اتنی دلچسپی تھی کہ بسا اوقات دوران جنگ آپ تلوار گلے میں لٹکائے رکھتے تھے۔ امام بخاری نے اس کتاب میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے الحنہ تحت بارقۃ السیوف۔ یعنی جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔

نیزہ اور اس کے استعمال سے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:-

((جُعِلَ رُزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رَمْحِي وَ جُعِلَ الذَّلَّةُ وَالصَّغَارُ عَلَيَّ مَنْ خَالَفَ أَهْرِي --)) (بخاری کتاب الجہاد و باب ما قبل فی الرماح)

(میری روزی بھالے کے سائے تلے ہے اور جو میرا حکم نہ مانے اس پر ذلت اور خواری مسلط ہوگی۔)

آج کے مشینی دور سے پہلے جنگ میں بطور سواری اکثر گھوڑے ہی استعمال ہوتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قوت یعنی آلات حرب کے ساتھ گھوڑوں کو پال پوس کر تیار رکھنے کی بھی تاکید فرمائی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((مَنْ أَحْبَبَسَ فَرَسًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِيْمَانًا بِاللَّهِ وَتَصَدِّقًا بِوَعْدِهِ فَإِنَّ شِبَعَهُ وَرِيئَهُ وَرَوْتَهُ وَبَوْلَهُ فِي مِيزَانِهِ يَوْمَ)) (جس شخص نے ایمان کے ساتھ اللہ کے وعدے کو جو اس نے مجاہدین سے کیا ہے۔ سچا سمجھ کر جہاد کے لئے گھوڑا باندھ رکھے تو

الْقِيَامَةِ -)) (بخاری، کتاب ایضا)
 اس کی کھلائی پانی لید اور پیشاب سب کچھ
 اس کے اعمال کے ترازو میں رکھے
 جائیں گے۔)

اموال غنیمت میں سے آپ نے مجاہد کے لئے ایک حصہ اور گھوڑے کے لئے دو حصے
 مقرر فرمائے۔ اس کی مندرجہ ذیل دو وجوہ تھیں:-

(۱) اس دور میں نہ تو مجاہدین یا سپاہیوں کو تنخواہ ملتی تھی اور نہ اسلحہ جنگ اور گھوڑے وغیرہ۔
 اپنے علاوہ گھوڑوں کی پرورش بھی مجاہدین کی ذمہ تھی اور یہ تو ظاہر ہے کہ گھوڑے کی
 خوراک پر آدمی سے کئی گنا زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔

(۲) گھوڑے کے دو حصے مقرر کرنے میں یہ حکمت بھی تھی کہ مجاہدین کو گھوڑے پالنے کی
 طرف زیادہ سے زیادہ رغبت ہو۔

جاہلیت کی رسوم میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کے ہتھیار توڑ
 ڈالتے اور جانور مار ڈالتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس رسم کو پوپ ختم کیا جب آپ ﷺ فوت
 ہوئے تو آپ ﷺ نے مال و اسباب کی قسم کی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ اور اگر کچھ چھوڑا تو وہ یہی
 آلات حرب تھے۔ یعنی کچھ ہتھیار اور ایک سفید خنجر۔ (بخاری، کتاب الجہاد والسریر۔ باب بغلة النبی)
 آلات حرب سے مسلمانوں کی دلدادگی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں
 نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا کہ اسلحہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں تیار رکھا جائے یا بہتر طریق
 سے استعمال کیا جائے۔ بلکہ ان میں نئے آلات حرب کی ایجادات کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ
 جنگ طائف میں مسلمانوں نے منجیق، دبابہ اور صوریہ تین نئے آلات استعمال کیے۔ منجیق ایک
 قلعہ شکن آلہ تھا جو توپ کی طرح ایک مقام پر نصب کیا جاتا اور بارود کے گولوں کی بجائے پتھر
 برساتا تھا۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق اسلام میں سب سے پہلے منجیق کا استعمال آنحضرت
 ﷺ نے محاصرہ طائف کے وقت فرمایا: جس سے اہل عرب پہلے آشنا نہ تھے۔ دوسرا جنگی آلہ
 جو محاصرہ کے دوران استعمال کیا گیا وہ دبابہ تھا سہی اس کے اندرونی حصہ میں داخل ہو جاتے اور

۱ واضح رہے کہ اگر کسی مجاہد کے پاس ایک کے بجائے دو یا تین گھوڑے ہوں تو بھی گھوڑوں کا حصہ مجاہد سے
 دگنا ہی رہے گا۔ چونکہ نیا چھ گنا نہیں رہے گا۔ فقہاء حنفیہ ہر گھوڑے کا الگ حصہ شمار کرتے ہیں۔

اسے ریلتے ہوئے قلعہ کی دیواروں تک بڑھاتے چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر قلعہ کی دیواروں میں سوراخ پیدا کر دیتے تھے۔ دباب کی چھت ان سپاہیوں کو دشمنوں کے تیروں سے محفوظ رکھتی تھی۔ اور تیسرا جنگی آلہ ضبور تھا۔ جو اس جنگ میں استعمال ہوا۔ حملہ آور اس کے اندر بیٹھ کر دشمن کے قلعوں تک پہنچتے اور وہاں ان سے لڑتے۔ آج کل یہ آلہ ٹینک کے نام سے معروف ہے جو اسی ضبور کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ (طبری ج ۱۔ غزوہ طائف)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بحری بیڑہ تیار کر لیا۔ پھر اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ رومی بیڑے کے حیثیت بھی ختم کر دی۔ آئندہ بھی مسلمان اس میدان میں پیش پیش رہے۔

پھر بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے اس پہلو سے غفلت برتی تو حضور اکرم ﷺ کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ وَجُعِلَ الدِّئَةُ وَالصُّعَارُ عَلٰی مَنْ خَالَفَ اَمْرِيْ اور یہ ادبار و عتبت آج تک اسی وجہ سے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے۔ اور آج بھی اس مصیبت کا علاج یہی ہے کہ مسلمان انفرادی اور حکومتی سطح پر اس پہلو پر خاص توجہ دیں۔

(۱۲) سرحدوں کی حفاظت:

کسی ریاست کے استحکام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مملوکہ یا زیر اثر کے کناروں پر فوجی چوکیاں قائم کرے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ﴾ (۶۰:۸)

(جہاں تک ہو سکے فوج کی جمعیت کے زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے مقابلے کے لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے اور تمہارے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر تمہاری دھاک بیٹھی رہے گی۔)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۲۰۰:۳)

(اے ایمان والو! کفار کے مقابلے میں ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور مورچوں پر جھمکے رہو اور خدا سے ڈرو تاکہ تم مراد حاصل کرو۔)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:-

((رَبَاطٌ يَوْمٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ (ایک دن رباط یعنی سرحدی چوکیوں میں
الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا-)) (بخاری) کتاب الجہاد بسر کرنا دنیا میں اور جو کچھ اس میں ہے سب
والسیر - باب رباط یوم فی سبیل اللہ سے بہتر ہے)

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا:-

((رَبَاطٌ يَوْمٌ وَأَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صِيَامِ شَهْرٍ (ایک دن رات پہرہ چوکی دنیا ایک ماہ کے
وَقِيَامَةِ أَنْ مَاتَ جَرِي عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي روزہ اور قیام سے بہتر ہے۔ اگر (پہرہ دار)
يَعْمَلُهُ وَأَجْرِي عَلَيْهِ رِزْقُهُ وَآمِنَ الْفَتَانَ-)) مرجائے گا تو اس کا یہ عمل جاری رہے گا اور
(مسلم) کتاب الجہاد - باب تفضیل الرباط اس کو اس پر اجمردیا جائے گا اور فتنوں سے وہ
امن میں رہے گا۔)

بعض فقہاء رباط کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاد
غیر مسلموں سے کیا جاتا ہے اور رباط خود مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے ابتدائی سالوں میں مدینہ کے ارد گرد بسنے والے مشرک قبائل
آپس میں گٹھ جوڑ کر کے مدینہ پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ آپ ان کے حالات سے ہر لحظہ باخبر رہتے
اور جب محسوس کرتے کہ کوئی مدینہ کی طرف بری نظروں سے دیکھ رہا ہے تو فوراً خود وہاں پہنچ جاتے
یا سہرا یا بھیج دیتے۔ صلح حدیبیہ سے پہلے اکثر ایسے واقعات پیش آتے رہے۔ اور بسا اوقات یوں
ہوا کہ دشمن اسلامی دستوں کی خبر پا کر تتر بتر ہو جاتا تھا۔

۹ھ میں جبکہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا۔ شام کی سرحد پر عرب
عیسائیوں نے جو قیصر روم کے زیر اثر تھے۔ مسلمانوں کی سرحد پر فوج اکٹھی کرنا شروع کر دی تھی۔
غزوہ تبوک اسی وجہ سے پیش آیا تھا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی دشمن کا لشکر منتشر ہو گیا
اور جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔

دور فاروقی میں جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں بہت وسیع ہو گئیں۔ تو سرحدوں پر
فوجی چھاؤنیاں قائم کر دی گئیں جہاں ہر وقت فوج موجود رہتی تھی تاکہ دشمن کی نقل و حرکت کی
بر وقت سرکوبی کی جاسکے۔

(۱۳) جنگ اور تعلقات خارجہ

جنگ کا خارجہ پالیسی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے اس سلسلہ میں مسلمانوں کو مندرجہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں۔

(۱) دوستانہ تعلقات:

غیر مسلم اقوام سے صلح کے معاہدے تو کرنے کی اجازت ہے لیکن دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّيْ
وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾
(اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں
کو جو غیر مسلم ہیں دوست نہ بناؤ۔)
(۱:۶۰)

اس کی وجہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کافر مسلمان کا حقیقی خیر خواہ کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کی دوستی صرف اس وقت تک ہوگی جب تک اس کا اپنا مفاد وابستہ ہوگا۔ ذرا بھی مفادات میں فرق آیا تو وہ اسی وقت کفر کی دوسری طاقتوں سے مل جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ
أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ (۲۴:۵۸)

(تمہیں ایسی کوئی قوم نہ ملے گی جو اللہ اور قیامت پر ایمان بھی رکھے پھر ایسی قوم سے دوستی بھی رکھے جو اللہ اور رسول کی مخالفت کرتی ہو۔ چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا بھائی یا دوسرے رشتہ دار۔)

(۲) غیر مسلم کی دوستی سے ملکی اور فوجی راز افشا ہونے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ کیونکہ جس سے دوستی ہو اس سے ایسے راز چھپانا ناممکن ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةَ مَنْ
دُونَكُمْ لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبْرًا وَلَا وَدُوًّا
مَاعَنْتُمْ﴾ (۱۱۸:۳)

(اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی دوسرے کو راز دار مت بناؤ۔ یہ لوگ تمہارے نقصان میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں گے۔ تمہارے نقصان اور تمہاری تکلیف میں ان کی خوشی ہے۔)

آج مسلمانوں کے ”دوست غیر مسلم ممالک“ اقتصادی امداد کے نام پر فنی ماہرین بھی ساتھ بھیجتے ہیں۔ جو فنی مہارت کا کام تو کم ہی سرانجام دیتے ہیں۔ البتہ ملک کے راز بڑی سرگرمی سے اپنی حکومتوں کو مہیا کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان ملکوں کی حکومتوں کے آئے دن تختے الٹائے جاتے ہیں۔ غیر مسلم دوستوں سے مشترکہ دفاع کے سمجھوتے بھی نہیں کیے جاسکتے ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَلَا تَحَادِلْ فِي دِينِكُمْ غَيْرِ الْمَسْئُورِ﴾ (جو لوگ خود اپنے نفس سے دھوکہ کرتے ہیں انفسہم ان اللہ لا یحب من کان خوانا ان کی حمایت میں نہ لڑو۔ اللہ ایسے لوگوں کو ائیمًا ○ ﴿۴:۱۰۷﴾ پسند نہیں کرتا جو غنا باز اور بدکردار ہوں۔)

(۳) غیر مسلم ممالک سے دوستی کا تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ثقافت کے نام پر اس ملک کے باطل نظریات مسلمانوں میں پرورش پانے لگتے ہیں۔ فحاشی اور بے حیائی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور جن منکرات کے استیصال کے لیے جہاد فرض قرار دیا گیا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور خود مسلمان ممالک میں فروغ پانے لگتے ہیں۔

(۲) معاہدات:

دوسرے ممالک سے برابر کی سطح پر معاہدات کرنے کی اجازت ہے۔ یہ معاہدات امن و صلح کے بھی ہو سکتے ہیں تجارتی بھی اور امان کے بھی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خوب سمجھ کر معاہدات کریں۔ کیونکہ جب کوئی قوم صلح کی پیش کش کرے یا کوئی فرد یا قوم امان مانگے تو مسلمان پر اسے قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ ان معاہدات کو ایفا کرنا مسلمان کی اولین ذمہ داری ہے۔ خواہ دشمن اس طریق سے مسلمانوں کو دغا دے جائے۔ اگر ایسی صورت ہو تو دشمن کو معاہدہ کے کینسل کر دینے کا الٹی میٹم دینا ضروری ہے۔ بعد میں مناسب کارروائی کی جاسکتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَمَا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ﴾ اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو۔

یعنی معاہدہ منسوخ اور اب ہر فریق اپنی اپنی جگہ آزاد ہے۔ جیسی کارروائی مناسب سمجھے

کرے۔

(۳) سفارتی تعلقات:

غیر ممالک کے خواہ یہ ملک دوست ہو، غیر جانبدار ہو یا دشمن ہو۔ سفیروں سے اچھی طرح پیش آنا ان سے بہتر سلوک کرنا اور انہیں مناسب آرام پہنچانا اور مراعات دینا ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ سفارت کی تکرمیم کے لیے حضور اکرم ﷺ نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ اگر کوئی ملک مسلم سفیر سے بد سلوکی کرے یا اسے قتل کر دے۔ تو یہ بات جنگ کا سبب بن جاتی ہے۔ آج کل ہر ملک میں دوسرے ممالک کے سفارت خانے قائم ہیں۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو تو پہلے اس ملک سے سفارتی تعلقات ختم کر دینا چاہئیں۔ یہ گویا جنگ کا الٹی میٹم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تلافی نہ ہو تو جنگ شروع کی جاسکتی ہے۔



میدان کارزار اور فوج کو لڑانے کی مہارت

جب دونوں متحارب فریق آمنے سامنے آجائیں تو ایک بہتر جرنیل کو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(۱) میدان جنگ کا صحیح انتخاب:

میدان جنگ کا صحیح انتخاب بھی فتح کا ایک موثر سبب ہوتا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر قریش مکہ نے پہلے پہنچ کر حسب پسند مقامات پر قبضہ کر لیا۔ جو جنگ کے لیے موزوں سمجھتے تھے۔ ناچار مسلمانوں کو ایسی جگہ پڑاؤ ڈالنا پڑا جہاں نہ کوئی کنواں تھا نہ چشمہ زمین ریتلی تھی جہاں پاؤں بھی نہیں جم سکتے تھے۔ آپ ﷺ اسی سوچ میں تھے کہ ایک صحابی حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اس مقام پر پڑاؤ ڈالنا جنگی تدبیر ہے یا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ جنگی تدبیر سے تعلق رکھتا ہے۔“ حباب رضی اللہ عنہ نے کہا پھر آپ ﷺ لوگوں کو آگے لے چلیں چشمہ پر قبضہ کر لیں اور تالاب بنا کر پانی سے پر کر لیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فوراً اس تجویز پر عمل کیا۔ لیہ جگہ کفار کے پڑاؤ سے اونچی تھی۔ مزید براں اللہ تعالیٰ کی مہربانی یہ ہوئی کہ مینہ برس گیا۔ زمین جم کر اور سخت ہو گئی۔ جبکہ اسی پانی نے نیچے بہہ کر کفار کے پڑاؤ میں دلدلی کیفیت پیدا کر دی۔ اس موقع پر بارش کا نزول دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد اور خاص رحمت تھی۔

دوسری تدبیر آپ ﷺ نے یہ کی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے اپنا خیمہ ایک ایسے بلند مقام پر نصب کیا جہاں آپ ﷺ تیروں کی زد سے بھی محفوظ رہ سکتے تھے اور لڑائی کا نقشہ بھی بخوبی ملاحظہ فرما سکتے تھے۔

اور تیسری تدبیر یہ تھی کہ اس خیمہ کے پاس چند سواری کے جانور رکھے گئے۔ ایک طرف کفار مکہ کا ایک ہزار کا لشکر جو آلات حرب و ضرب سے پوری طرح مسلح تھا خوراک وافر تھی۔ ہر روز دس اونٹ ذبح کیے جاتے اور شراب کا بھی دور چلتا تھا۔ دوسری طرف تین سو تیرہ مسلمان (تہائی سے بھی کم) اور وہ بھی نہتے، کمزور اور سامان خوراک سے بھی عاجز۔ اندریں حالات جنگ کے دوران کسی وقت بھی مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑ جانے کا اندیشہ ایک فطری امر تھا خیمہ کے پاس سواریاں اس لیے رکھی گئیں کہ خدا نخواستہ اگر ایسی صورت پیدا ہو تو مدینہ سے فوری طور پر کمک مہیا کی جاسکے۔

(۲) صف بندی اور طریق جنگ:

مسلمان صف بندی کا طریق تو نماز سے ہی سیکھ چکے تھے۔ تاہم آپ ﷺ نے میدان بدر میں اس کا بالخصوص اہتمام کیا۔ آپ ﷺ ایک چھڑی لے کر خود مسلمانوں کی صفوں کو درست اور سیدھا کر رہے تھے۔ صف بندی قریش مکہ نے بھی کی تھی۔ لیکن ان میں ایسا نظم و ضبط ہرگز نہ تھا۔ دوسرا اہتمام آپ ﷺ نے یہ کیا کہ مسلمانوں کی اس انداز سے صف بندی کی کہ وہ اپنی اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہے تھے۔ قرآن کریم نے اس منظر کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

﴿فِنَّةُ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى﴾ (ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا کافر) ﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنِ﴾ کفار کا گروہ تھا۔ جو مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دگنا مشاہدہ کر رہا تھا۔ (۱۳:۳)

صف بندی کی اصل غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی خاص مقام پر دشمن کے حملہ کا دباؤ بڑھ جائے تو فوج کا آپس میں رابطہ منقطع نہ ہونے پائے۔ صف بندی کے دوران حضور ﷺ نے اس بات کو بالخصوص ملحوظ رکھا تھا۔

صف بندی کے علاوہ مورچہ بندی، مورچوں کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب، ان میں مناسب افراد کا تعین، یہ سب امور سپہ سالار کی صوابدید پر منحصر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنگ احد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:-

طبری ج اغزوة بدر

﴿وَأَذَعِدُوهُمْ مِنْ أَهْلِكُمْ تَبَوُّيَ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (۱۲۱:۳)
 (اور اے نبی! جب تم صبح اپنے گھر سے روانہ ہو کر ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کر رہے تھے۔)

اور لغوی لحاظ سے فقط تَبَوُّيَ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی رہائشی جگہ کی فضا اور ماحول رہنے والے کی طبیعت کے موافق اور سازگار ہو یا کوئی شخص جس مقصد کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کرتا ہے وہ اس کے لیے موافق اور سازگار ہو۔

عہد جاہلیت میں عرب جنگ کے دوران کروفر کے اصول کے تحت لڑتے تھے۔ وہ دشمن پر حملہ کرتے (کز) اور جب اپنے اندر کوئی کمزوری دیکھتے تو بھاگ گھڑے ہوتے۔ (فر) اس کے بعد پھر لوٹ کر حملہ آور ہوتے اور جب تک جنگ جاری رہتی بغیر کسی ضابطہ یا نظام کے اسی طرح لڑتے رہتے۔ اُس طریق جنگ میں نہ کوئی نظم رہ سکتا تھا اور نہ ہی کامیابی کی کوئی ضمانت ہو سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو باقاعدہ صف بندی کا حکم دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُمْ بُنْيَانٌ مَوْصُوصٌ﴾ (۳:۶۱)
 (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں یوں صفیں باندھ کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی دیوار ہے۔)

چنانچہ دور نبوی ﷺ میں مسلمان نماز کی طرح ہی جنگ کے لیے بھی صف بندی کرتے تھے۔ شانہ سے شانہ ملائے دشمن کی طرف بڑھتے اور ایک انج بھی صف سے آگے بیچھے نہ ہوتے۔ جب تک فوج صف بہ صف نہ ہو اس وقت تک اس کے مختلف شعبوں کا توازن صحیح نہیں رہ سکتا۔ تیر انداز، شمشیر زن، نیزہ بردار اور سوار مختلف ستوں اور مختلف رفتار سے میدان جنگ میں استعمال کیے جاتے تھے۔ گمران میں توازن اسی صورت میں قائم رکھا جاسکتا تھا۔ جب ان میں ہر ایک اپنی اپنی صف میں جگہ پہچان لیتا۔ اور پھر اسے قائم رکھتا اور نہ احتمال رہتا تھا کہ سوار کہیں وقت سے پہلے یا وقت کے بعد دشمن سے ملاپ نہ کر پائے۔ اس قسم کے بے ترتیبی میں شکست کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔

پڑاؤ کے انتخاب اور صف بندی کے دوران سورج کی روشنی اور ہواؤں کے رخ کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ تاکہ دشمن کی تلواروں کی حرکت سے مسلمانوں کی آنکھیں چندھیا نہ جائیں۔ اور ہواؤں کے رخ کے متعلق صحیح انتخاب کا ہی یہ نتیجہ تھا۔ کہ آپ ﷺ نے عین اس وقت جب

معرکہ کارزار گرم تھا آپ ﷺ نے مٹھی بھر ریت کفار کی طرف پھینکی تو ہواؤں نے ان ذرات کو اڑا کر کفار کی آنکھوں میں ڈال کر انہیں چند ہی دیا اس عمل میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مدد کو اپنے خاص احسان سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ﴾ (اے مسلمانو! کفار کو تم نے نہیں وہ تو اللہ نے
 وَمَا مَيِّتٌ إِذْ مَيِّتٌ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ- ﴿﴾ مارا تھا اور نہ ہی اے پیغمبر! جو مٹھی تم نے پھینکی وہ
 تم نے نہیں پھینکی بلکہ وہ تو اللہ نے پھینکی تھی۔) (۱۷:۸)

یہ ہے تائید ایزدی کا صحیح مفہوم۔ اس موقع پر بارش کا نزول اور ہواؤں کے رخ سے ریت کے ذرات کا کفار کی آنکھوں کو نشانہ بنانا اللہ کی بہت بڑی امداد ثابت ہوئے۔ لیکن یہ امداد اس وقت آئی جب مسلمان اپنے مادی وسائل سے مقدور بھرا استفادہ کر چکے تھے۔

آج کی افواج میں بحری بیڑے، بری فوج اور فضائیہ میں توازن نہ ہو تو جنگ صحیح معنوں میں لڑی ہی نہیں جاسکتی اور اس توازن کو افواج سہ گانہ کی متوازن تیاری کے بعد ان کا استعمال بھی ایسے منصوبے کے ماتحت ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کو مدد دے سکیں تاکہ ایک کی ضرب دوسرے کو آگے بڑھنے میں مدد دے۔ اس طرح کی جنگ کو صف بہ صف جنگ یا متوازن منصوبے کی جنگ کہتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں سیسے کی دیوار کی مثال دی گئی ہے۔ سیسہ ایسی موہات ہے جو مضبوط ہوتی ہے اور چلک دار بھی۔ اور یہی دو صفات افواج میں ہونی چاہئیں۔ تاکہ دشمن کی ضربات سے صف ٹوٹنے نہ پائے۔ اور اس محاذ کا کوئی حصہ کمزور نہ ہو جائے۔ چلک کی وجہ سے صرف معمولی طور پر اور وقتی طور پر دب جائے اور جو نئی دشمنوں کا دباؤ ہے اسی وقت پھر اپنے پہلے مقام پر چلا جائے۔

(۳) جنگی نقشہ کی فوری تبدیلی:

معرکہ کارزار میں ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اور شکست کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اس وقت ایک بہترین اور حاضر دماغ جرنیل کا کام یہ ہوتا ہے کہ فوراً پڑاؤ تبدیل کر کے نقشہ جنگ کو بدل کر فتح و شکست کا رخ موڑ دے۔ جنگ احد کے موقع پر جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور ابن قریظ نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ (نغوذ باللہ) محمد ﷺ قتل ہو گئے۔ تو آپ ﷺ نے فوراً نقشہ جنگ بدل دیا۔ اور پہاڑی کے ایک محفوظ اور بلند مقام پر

میدان کارزار اور فوج کو لڑانے کی مہارت

تشریف لے گئے۔ گویا اب مسلمان فوج کا مرکز و محور یہ مقام تھا۔ یہیں سے آپ ﷺ نے شکستہ دل اور بدحواس فوج کو پکار پکار کر بلایا اور بکھری ہوئی فوج پھر جمع ہو گئی۔ اور مسلمان شکست سے بچ گئے۔

(۴) اقدام:

معرکہ کارزار میں اقدام کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہو رہا ہو تو کوئی ایک فوج پوری قوت سے دشمن کے قلب پر حملہ کر کے اسے پسپائی پر مجبور کر دے۔ آپ نے جنگ احد کے موقع پر یہی تدبیر استعمال کی اور کفار قریش فتح و شکست کا فیصلہ ہوئے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ چنانچہ راستہ میں ابوسفیان سپہ سالار قریش کو یہ خیال آیا کہ کام تو ادھورا رہ گیا۔ واپس مڑ کر حملہ کرنا چاہیے ادھر حضور اکرم ﷺ کو بھی ایسا ہی خیال آیا۔ اور آپ ﷺ نے کفار کے تعاقب کا فیصلہ کر لیا اللہ تعالیٰ نے نہایت وضاحت سے ارشاد فرمایا کہ:-

﴿وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَالِمُونَ فَإِنَّهُمْ يَالْمُونَ كَمَا تَالِمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ﴾
(اور دشمن کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تمہیں دکھ پہنچا ہے تو انہیں بھی تو دکھ پہنچا ہے جیسے تمہیں پہنچا ہے پھر تم اللہ تعالیٰ سے ایسی امیدیں بھی (جنت و انعام) رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھتے۔) (۱۰۴:۴)

چنانچہ دوسرے دن آپ زخموں سے چورس صحابہ کی معیت میں تعاقب کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور مدینہ سے آٹھ میل دور ایک مقام حمراء الاسد پر جا کر ڈیرہ ڈالا۔ اور تین دن قیام فرمایا۔ اس تعاقبی سفر کو غزوہ حمراء الاسد کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں قطعاً جنگ نہیں ہوئی۔ ہوا یہ تھا کہ ابوسفیان کا لشکر روجا کے مقام پر پڑاؤ ڈالے مسلمانوں پر مڑ کر حملہ کر کے سارا قصہ پاک کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہیں ایک شخص معبد خزاعی ملا۔ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن مسلمانوں کا خیر خواہ ضرور تھا۔ اس سے ابوسفیان نے مسلمانوں کی کیفیت پوچھی تو کہنے لگا کہ ”محمد ﷺ ایک بہت بھاری لشکر لے کر تمہاری تلاش میں چڑھے آ رہے ہیں۔ اب ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جو میدان جنگ میں موجود نہ تھے۔ اور انہیں اس موقع کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے۔“ (طبری ج ۱ غزوہ احد)

ابوسفیان نے جب یہ کیفیت سنی تو اسے واپس مڑ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ معبد خزاہی کا یہ کردار بھی فی الحقیقت نصرت الہی تھی۔

دعا و مناجات اور نزول ملائکہ:

اگر خالصتاً مادی ذہنیت کو ملحوظ رکھا جائے تو دعا و مناجات اور نصرت الہی کا تصور خارج از بحث قرار پاتا ہے۔ جبکہ مسلمان مادی وسائل سے بھرپور استفادہ تو کرتا ہے۔ لیکن ان پر تکیہ کبھی نہیں کرتا۔ اور انجام کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے اس کا ایمان ہے کہ نتائج کے عوامل صرف مادی اور ظاہری اسباب ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ اور بھی کئی غیر مرئی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو حالات کا رخ موڑ دینے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کئی مثالوں سے واضح ہو چکا ہے۔ محض مادی وسائل پر تکیہ کرنے کی تردید میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

﴿كَمْ مِّن فِئْتَةٍ بَلَغَتْ فِئْتَةً ۚ قَلِيلَةٌ غَلَبَتْ فِئْتَةً﴾ (کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھاری کثیرۃ باذن اللہ۔ ﴿۲۳۹:۲﴾)

جمیعت پر غالب آ جاتی ہے۔)

اور مسلمانوں سے تو تقریباً ہر جنگ میں ایسا ہی معاملہ پیش آتا رہا ہے۔

غیر مرئی اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مادی وسائل سے بھی بھرپور تیاری کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و انکسار کا اظہار اور فتح و کامرانی کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ جنگ بدر میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے مادی وسائل سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور جنگی تدابیر میں اپنی تمام صلاحیتیں بھی صرف کیں۔ لیکن اس کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ کام بھی کیا کہ پڑاؤ ڈالنے کے بعد مسلمان تورات بھر سو رہے تھے۔ اور آپ ﷺ نے اپنے خیمہ ”عریش“ میں یہ رات اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گزار دی۔ آپ ﷺ رو رو کر مسلمانوں کے لیے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ عبد اللہ بن عباس..... کہتے ہیں۔

﴿قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾ (نبی اکرم ﷺ (بدر کے دن) ایک خیمہ وَهُوَ فِي قُبَّةٍ ”اللَّهُمَّ إِنِّي أُنشِذُكَ“ میں تھے۔ آپ نے یوں دعا کی ”یا اللہ اب

فلب کے حتی (HITTI) تاریخ عرب میں لکھتا ہے کہ ”مسلمان عربوں کی فوجی قوت نہ ساز و سامان جنگ کی برتری پر مبنی تھی نہ نظم و تربیت کی عمدگی پر بلکہ اس کا اصل راز ہمت اور حوصلہ کی برتری تھی۔ جس میں مذہب نے بلاشبہ اپنا حصہ پیش کیا۔“

میں وعدے اور تیرے اقرار کو مجھ سے چاہتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری مرضی یہ ہو (مسلمانوں کی مٹھی بھر جمعیت ختم ہو جائے) تو آج کے دن سے تیری عبادت بند ہو جائے گی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگے ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بس کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار سے دعا میں حد کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے خیمہ سے نکلے تو یہ آیت زبان پر جاری ہوئی۔ ”اب کوئی دم میں کافروں کا گروہ ٹھکست کھا کر پسا ہو جائے گا۔“

عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ اللَّهُمَّ إِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدَ بَعْدَ الْيَوْمِ فَأَخَذَ أَبُو بَكْرٍ بِيَدِهِ فَقَالَ حَسْبُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَدَّ الْأَحْحَتَ عَلَى رَبِّكَ -“ وَهُوَ فِي الدَّرْعِ فَخَرَجَ وَيَقُولُ سَيَهْزَمُ الْجَمْعُ وَيَوْلُونَ الدُّبْرَ -“ (بخاری - کتاب الجہاد - باب ما قبل فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اس رات بھر دعا کے نتیجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح کی بشارت مل گئی۔ اور اس فتح کے بے شمار غیر مرئی اسباب پیدا ہو گئے۔ مثلاً بارش کا نزول ہو ا کا رخ اور کافروں کے دل میں رعب کا طاری ہونا۔ مسلمانوں کے دلوں کا ثابت قدم رہنا اور فرشتوں کا نزول یہ اسباب بھی غیر مرئی ہیں اور فرشتے بھی غیر مرئی۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے یہ نہ ہم جان سکتے ہیں نہ جاننے کے مکلف ہیں۔ تاہم یہ ایسے حقائق ثابتہ ہیں جن سے مجال انکار نہیں۔ نصرت الہی اور نزول ملائکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْتِي مَعَكُمْ فَتَبَيَّنُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأَلْتَنِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرَّعْبَ فَأَضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَأَضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ -﴾ (۱۴:۸)

(جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ میں کافروں کے دلوں میں رعب و ہیبت ڈال دیتا ہوں۔ تم ان کی گردنیں اڑا دو اور بند بند توڑ دو۔)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:-

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یوم بدر ”هذا جبرئیل اخذ برأس آن پیچے اپنے گھوڑے کو تھامے ہوئے ہتھیار لگائے ہوئے۔“))

(بخاری - کتاب المغازی - باب شہود الملكة بدر)

اسی طرح جنگ احد میں بھی ملائکہ کے نزول سے متعلق اسی باب میں کئی احادیث موجود ہیں۔ اور ایسی احادیث بھی ہیں جن میں صحابہ کا بیان ہے کہ وہ فرشتوں کے مارے ہوئے کافروں اور مسلمان کے ہاتھوں مقتولین کے درمیان امتیاز بھی کر لیتے تھے۔ تاہم اگر ہم اس نصرت الہی کو مادی زبان میں ہی ادا کرنا چاہیں۔ تو صورت یہ ہوگی کہ کفار اپنے سرداروں کے قتل شکست کے غم اور جنگ کی محنت سے اتنے نڈھال ہو گئے تھے کہ ان کا بند بند چور ہو رہا تھا۔

پھر یہ نصرت الہی حضور اکرم ﷺ یا دور نبوی ﷺ کے مسلمانوں سے بھی مخصوص نہیں۔ جب بھی مسلمانوں نے ذاتی اغراض کو بالائے طاق رکھ کر محض اعلائے کلمۃ الحق کے لیے نیک نیتی سے جنگ کی انہیں ایسی نصرت غیبی ضرورت حاصل ہوتی رہی ہے دور کیوں جائے ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ میں گئے گزرے مسلمانوں کو بھی یہ تائید غیبی حاصل ہوئی۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اعتماد کر کے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت کو شکست دی۔ اور اس فوج کا ہر فرد اس بات کا معترف ہے کہ تائید غیبی ضرور ساتھ تھی۔ یہ تائید کیسے حاصل ہوئی اس کی تفصیل میں بہت سی دکائیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں درج کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اسی حقیقت کو مولانا ظفر علی نے درج ذیل شعر میں ادا فرمایا ہے

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو!

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دعا اسی وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جبکہ مادی وسائل سے بھی پورا پورا استفادہ کیا جائے۔ مادی وسائل کو بروئے کار لائے بغیر محض دعا پر تکیہ کرنا بے سود اور قانون الہی کے خلاف ہے۔ اگر مادی وسائل کے ساتھ ساتھ دعا کی روحانی قوت بھی شامل ہو جائے تو مسلمانوں کی قوت دس گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر یہ قوت دو گنا سے بھی کم رہ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی واقع ہو چکی ہے۔

اگر مسلمان مادی وسائل سے غافل ہو کر محض دعا پر انحصار کرے گا۔ جیسا کہ آج کل اکثر مسلمانوں کا شیوہ بن چکا ہے تو وہ یقیناً شکست ہی سے دوچار ہوگا۔ اور اگر دونوں لڑنے والے فریق دعا اور توکل کے عادی نہ ہوں اور محض مادی وسائل پر تکیہ رکھتے ہوں تو فتح اس فریق کی ہوگی

جو مادی وسائل کے لحاظ سے مضبوط اور طاقتور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون مسلمانوں کا محض نام کا مسلمان ہونے کے لحاظ سے کوئی لحاظ نہیں کرے گا۔

(۲) دشمن کی تدابیر کو ناکام بنانا

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ یہ اپنی قوت کو بڑھانے اور کامران ہونے کے مثبت پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن کامرانی کے حصول کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کے جنگی مقاصد اور تدابیر پر کاری ضربیں لگائی جائیں۔ اس سلسلہ میں بالعموم درج ذیل تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

(۱) تجارتی ناکہ بندی (Blockada):

جنگ کے لیے سب سے ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست ہوتا ہے۔ اور ایک کامیاب جرنیل اس بات پر کڑی نظر رکھتا ہے کہ وہ دشمن کے معاشی وسائل پر کاری ضرب لگا کر اس کی جنگی تیاریوں میں تعطل پیدا کر دے۔

قریش مکہ کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور مدینہ اسی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ لہذا مدینہ کو سیاسی لحاظ سے ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ اور اسی وجہ سے مکہ اور مدینہ کے بڑے بڑوں میں دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ ایک دفعہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے کے لیے مکہ آئے اور اپنے دوست قریشی سردار امیہ بن خلف کے ہاں قیام کیا۔ یہ دونوں حضرات کعبہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ ابو جہل نے سعد بن معاذ کو کہا کہ اگر تم ابو سفوان (امیہ بن خلف کی کنیت) کے ساتھ نہ ہوتے تو میں تمہیں ختم کر دیتا۔ تو اس کے جواب میں سعد بن معاذ نے یہی جواب دیا تھا کہ ہم تمہاری تجارت کی شہ رگ کاٹ کر تمہارے ناک میں دم کر دیں گے۔

(بخاری - کتاب المغازی - باب ذکر النبی من)

مدینہ میں دم بدم یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کہ ۲ھ میں قریش کا جو تجارتی قافلہ ابو سفیان کی سرکردگی میں شام گیا ہوا ہے۔ اس کا پورا کا پورا منافع مصارف جنگ اور مسلمانوں کے استیصال کے لیے وقف کر دینے کے آپس میں عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جنگ سے بچنے کے لیے اس تجارتی قافلہ کی ناکہ بندی کر کے جنگ کو التوا میں ڈال دیں۔ پھر

ساتھ ہی یہ خطرہ بھی تھا کہ قریش مکہ اس قافلہ کی حفاظت کے لیے مسلح ہو کر موقع پر پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ان ٹلی جلی کیفیات سے رمضان ۲ھ میں مسلمانوں کا لشکر اس قافلہ کی طرف بڑھا۔ ادھر ابوسفیان کو خبر ہوگئی تو اس نے تیز رفتار قاصد مکہ بھیجا۔ مکہ سے ہنگامی طور پر ایک ہزار پر مشتمل مسلح لشکر ابو جہل کی سرکردگی میں قافلہ کی حفاظت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اب ہوا یہ کہ ابو سفیان نے عام رستہ کو چھوڑ کر بحیرہ قلزم کے ساتھ والا راستہ اختیار کر لیا۔ اور اس طرح ہچتا بچتا قافلہ لے کر بحفاظت مکہ پہنچ گیا۔ قریشی لشکر بدر کے مقام پر پہنچ چکا تھا تو اسے بھی معلوم ہو گیا کہ ابوسفیان بخیریت مکہ پہنچ چکا ہے۔ لہذا اکثر سرداروں نے یہ رائے دی کہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ لہذا اب جنگ نہ کرنی چاہیے۔ مگر ابو جہل کے غرور اور ہٹ دھرمی نے کوئی پیش نہ جانے دی اور جنگ ہو کر رہی جس میں کفار کو عبرت انگیز شکست ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں اس تجارتی ناکہ بندی کے اور بھی چند ایک واقعات ملتے ہیں۔ مندرجہ بالا تصریحات سے مقصود یہ ہے کہ غزوہ بدر کا پیش خیمہ بھی تجارتی ناکہ بندی تھا۔ اور ایسی ہمیں بسا اوقات کامیاب ہی ثابت ہوئیں۔

ابتدا میں قریش نے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے بحیرہ قلزم کے ساحل کے ساتھ کا متوازی راستہ اختیار کیا مگر ان پر چل کر ان کے منافع کی مقدار بہت کم ہوگئی اور سامان خوراک بڑی دقت سے اور گراں قیمت پر ملنے لگا۔ اس طرح کی ناکہ بندی آپ ﷺ کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ دشمن معاشی لحاظ سے کمزور ہو جائے دوسرے وہ منافع جو فوری طور پر مصارف جنگ کی صورت میں مسلمانوں ہی پر استعمال ہونے والا تھا اس کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ تجارتی ناکہ بندی کو کامیاب بنانے کے لیے گہرے تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اسی وقت کی جانی چاہیے جب انسان اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے

۱۔ اس تجارتی ناکہ بندی پر معاندین اسلام نے یہ الزام لگایا کہ اسلام غارتگری کی تعلیم دیتا ہے۔ اور مسلمانوں کا مقصد محض لوٹ مار کا مال حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ الزام کئی لحاظ سے غلط ہے۔ مثلاً (۱) اگر لوٹ مار ہی مقصد ہوتا تو پھر صرف قریش کے تجارتی قافلہ کی تخصیص کیوں تھی۔ تجارتی قافلے تو بین سے بھی روانہ ہوتے تھے مدینہ سے بھی اور غیر ٹلی تاجر بھی ان راستوں پر سفر کرتے تھے۔ ان کی بھی ناکہ بندی نہیں کی گئی۔

(۲) کسی واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے اس ناکہ بندی کے ذریعہ مال حاصل کیا ہو۔ سر یہ نخلہ میں عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اگر مال حاصل کیا بھی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پوری طرح تیار ہو۔ اب دیکھئے کہ نپولین بونا پارٹ جو مغربی دنیا کا عظیم جرنیل سمجھا جاتا تھا، نے بھی برطانیہ کی تجارتی ناکہ بندی کی تھی جسے کانٹی نینٹل سسٹم (Continental System) بھی کہا جاتا ہے۔ برطانیہ کے پاس مضبوط بحری بیڑہ بھی تھا۔ اور بیرونی مصنوعات چینی چائے، قہوہ اور دیگر کئی اشیاء پر اس کی اجارہ داری بھی تھی۔ نپولین نے پہلے تو برطانوی درآمدات کو حکماً ممنوع قرار دیا پھر اپنے دوست ممالک پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھی برطانوی مصنوعات اپنے ہاں ہرگز درآمد نہ کریں یہ ایک ایسی بات تھی جس پر زیادہ دیر تک عمل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فرانس اور اس کے دوست ممالک کی تجارت بحران کا شکار ہو گئی۔ برطانیہ نے جو ابی کاروائی کے طور پر ان ممالک کی بھی ناکہ بندی کر دی۔ تو نپولین اور اس کے حامی ممالک سخت مجبور ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے حلیف ممالک اسی وجہ سے اس سے کٹ گئے اور دشمن بن گئے۔ خود نپولین کا یہ حال تھا کہ اسے فوج کے لیے ہزار ہا تعداد میں اسمگل شدہ برطانوی کمبل بلیک میں اونچے نرخوں پر خریدنے پڑے۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کے زوال کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اس کی یہی تجارتی ناکہ بندی تھی۔

(جدید تاریخ یورپ حصہ اول - ص ۶۳ تا ۶۵)

ناکہ بندی کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دشمن کی کمک کو دشمن تک پہنچنے سے پہلے اس کا صفایا کر دیا جائے۔ جنگ احزاب میں جب محاصرہ طویل ہو گیا اور ”اتحادیوں“ کی رسد ختم ہونے لگی تو جی بن اخطب یہودیوں کے سردار نے رسد لائے ہوئے بیس اونٹ مشرکین کی فوج کے لیے بھیجے۔ یہ رسد جو کھجوروں اور ستور پر مشتمل تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر لگ گئی تو

(بقیہ) (۳) لوٹ مار کا مال اسلامی نقطہ نظر سے حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مال غنیمت کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس فرق کے لیے صفحہ ۱۶۷ پر اموال غنیمت پر حدود و قیود کا عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

جب آپ ﷺ غزوہ بدر پر گئے تو آپ ﷺ کو ایک شخص ملا جو بہادر میں مشہور تھا۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں تاکہ اموال غنیمت سے حصہ حاصل کر سکے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے؟“ اس نے کہا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”لوٹ جا میں مشرک کی مدد نہیں چاہتا۔ تھوڑی دور آ کے پل کر پھر یہی سوال وجواب ہوئے تو بھی آپ ﷺ نے اس کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ آگے بڑھے تو پھر یہی سوال وجواب ہوئے۔ اب کی بار اس نے جواب دیا کہ ”میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر یقین رکھتا ہوں۔“ تب آپ ﷺ نے اجازت دیدی۔

(مسلم - باب كراهية الاستعانة في الغزو بكافر)

تاہم اس میں اتنی گنجائش ضرور ہے کہ کافر اگر مشرک نہ ہو اور اس سے مسلمانوں کی خیر خواہی کا بھی یقین ہو تو اسے فوج میں شامل کیا جاسکتا ہے حضور اکرم ﷺ نے صفوان ابن امیہ رضی اللہ عنہ سے جنگ میں مدد لی جبکہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ (امام نووی - تحت شرح حدیث مذکورہ)

مجاہدین نے اس پر حملہ کر کے ان رسد سے لدے ہوئے اونٹوں پر قبضہ کر لیا۔

(۲) دشمن کی فوجوں میں انتشار ڈالنا:

ایک کامیاب جرنیل جہاں اپنی فوجوں میں ہر قیمت پر اتحاد برقرار رکھنے کی طرف خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہاں دشمن کی فوجوں میں پھوٹ ڈال کر اس کی قوت کو منتشر کرنا بھی اس کے مقصد کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اسلام میں کسی قوم سے خواہ وہ کتنی ہی دشمن جاں کیوں نہ ہو بد عہدی کی قطعاً اجازت نہیں البتہ کسی تدبیر سے یہ کام اگر بنتا نظر آئے تو اس کی اجازت ہے۔

جنگ احزاب میں یہود اور بالخصوص اس کے قبیلہ بنو نضیر کے کچھ افراد جو خیبر کی طرف جلاوطن کیے جا چکے تھے۔ تمام قریش مکہ اور دوسرے مشرک قبائل عرب کو بھڑکا کر مسلمان کو ختم کرنے کے لیے مدینہ پر چڑھلائے تھے۔ یہود کا ایک قبیلہ بنو قریظہ ابھی تک اپنے عہد پر قائم تھا۔ لہذا مدینہ میں مقیم تھا اور مسلمانوں کا حلیف تھا۔ بنو نضیر کے سردار جیح بن اخطب نے بنو قریظہ کو کئی طرح کے سبز باغ دکھا کر بد عہدی پر مجبور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس جنگ میں وہ بھی دشمنوں سے مل گئے تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ عین دوران جنگ پیش آیا لہذا اس سے مسلمانوں پر مایوسی کی فضا طاری ہو گئی تھی۔

انہیں دنوں میں ایک واقعہ پیش آیا۔ قبیلہ غطفان..... جو یہودیوں کا حلیف تھا..... کا ایک رئیس نعیم بن مسعود اشجعی مسلمان ہو گیا۔ لیکن اس کے اسلام لانے کی دشمن کو خبر نہ تھی۔ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔ ”اگر آپ ﷺ اجازت دیں تو میں دشمن میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس کی تجویز سن کر اتفاق فرمایا۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد کی ایک شکل تھی۔

چنانچہ نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے جنہوں نے بد عہدی کی تھی۔ اور کہا کہ اگر جنگ میں خدا نخواستہ ہمیں (یعنی قریش مکہ، بنو نضیر، غطفان اور بنو قریظہ وغیرہ کو) شکست ہوگی۔ تو دوسرے سب قبائل تو اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے لیکن تمہارا کیا ہے گا؟ تم تو مدینہ میں ہی رہتے ہو۔ مسلمان تو تمہارا کچھ مر ڈال دیں گے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر یہ ہے

کہ تم قریش مکہ اور غطفان کے دس آدمی بطور یرغمال لے لو تا کہ بصورت شکست اگر وہ واپس چلے جائیں تو تمہاری تکلیف کا انہیں فکر ہو اور وہ اس کا مداوا سوچنے پر مجبور ہوں۔ بنو قریظہ کے ذہن میں یہ بات آگئی۔

پھر یہی نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سپہ سالار ابوسفیان کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ ”دیکھو! میرے تمہارے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔ میں تمہیں تمہارے ہی فائدے کی ایک بات کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بنو قریظہ اپنے کیے پر پریشان ہیں وہ تو پہلے ہی معاہدہ توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ حی بن اخطب نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اگر قریش کام ناتمام چھوڑ کر چلے گئے تو میں تمہارے پاس آ رہوں گا۔ اب ظاہر ہے کہ شکست کی صورت میں نہ تو بنو نضیر مدینہ واپس آ سکتے ہیں اور نہ ہی تم ایسا کر سکتے ہو۔ لہذا بنو قریظہ اب یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے چند آدمی بطور یرغمال اپنے پاس لے لیں۔ اگر تم نے ان کی یہ بات مان لی تو یقین ممکن ہے کہ وہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر کے جنگ کا نقشہ ہی الٹ دیں۔“ ابوسفیان کے ذہن میں بھی یہ بات کھب گئی۔

چنانچہ قریش اور غطفان نے بنو قریظہ کے پاس عکرمہ بن ابوجہل کی سرکردگی میں ایک مشترکہ سفارت بھیجی۔ اور کہلا بھیجا کہ کل صبح آخری حملہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قصہ ہی پاک کر دیں۔

بنو قریظہ نے جواب دیا کہ ”کل ہمارا چھٹی کا دن ہے۔ لہذا کل یہ کام نہیں ہو سکتا۔ نیز ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت تک لڑنے کے لیے تیار نہیں جب تک تم ہمارے اطمینان کے لیے اپنے چند خاص آدمی بطور ضمانت ہمارے حوالے نہ کر دو۔“

تدبیر اپنا کام کر چکی تھی۔ جب عکرمہ یہ پیغام لے کر واپس آیا تو قریش اور غطفان کو نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات کا یقین ہو گیا۔ بنو قریظہ کو کہلا بھیجا کہ ”اگر تم لڑنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ ورنہ تمہاری مرضی۔ خدا کی قسم! ہم اپنا ایک آدمی بھی تمہارے سپرد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔“

یہ پیغام سن کر بنو قریظہ کو بھی نعیم بن مسعود کی بات کا یقین آ گیا۔ لہذا انہوں نے آئندہ جنگ میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ دشمن کی فوجوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ کفار کے قبائل میں بدگمانی اور بددلی کی فضا پیدا ہو گئی۔ جو کفار کی شکست کے اسباب میں سے ایک مؤثر سبب

میدان کارزار اور فوج کو لڑانے کی مہارت

ثابت ہوئی۔ (طبری۔ ج ۱۔ غزوة خندق)

(۳) جنگی چالیں یا خدع فی الحرب:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:-

((الْحَرْبُ خُدْعَةٌ)) (یعنی جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔)

(بخاری۔ کتاب استنابة المرتدین)

تو یہاں خدعہ سے مراد بد عہدی یا اخلاقی اقدار کو پامال کر کے اپنے مقصد کا حصول نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ”داؤ اور تدبیر“ ہے۔ جیسے دو پہلو انوں کی کشتی میں ایک پہلو ان کوئی انوکھا داؤ کھیل کر دوسرے کو پچھاڑ دیتا ہے۔ تو اس کے داؤ یا تدبیر کو دھوکا اور فریب پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بس بالکل یہی مثال ان جنگی تدابیر کی ہوتی ہے۔ جنہیں حضور اکرم ﷺ نے خُدْعَةُ الْعَسَاكِمِ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) میدان جنگ میں صف بندی اس طرح کی جائے کہ دشمن کو اپنے حریف کی تعداد اصلی تعداد سے بہت زیادہ نظر آئے۔ یہ خدعہ یا جنگی چال تو ہے۔ لیکن اسے مکرو فریب کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) آج کل فوج کی وردی کارنگ عموماً خاکی تجویز کیا جاتا ہے۔ جو ہم رنگ زمین ہے۔ اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے ہوائی جہاز فوج کی نقل و حرکت سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ یہ بھی خدعہ کی تعریف میں آتا ہے۔ اس طریق سے کسی چیز کی ہیئت تبدیل کر دی جاتی ہے۔ لیکن دشمن سے مکرو فریب کا اسے نام نہیں دیا جاسکتا۔

(۳) اسی طرح آج کل فوج اگر کہیں پڑاؤ ڈالنا چاہے تو اپنے خیموں کے اوپر درختوں کی شاخیں رکھ دیتی ہے۔ جسے کیموفلاج (Camou Falge) کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کے جہاز اس مقام کو عام جنگل ہی تصور کریں اور فوج کی نقل و حرکت سے بے خبر رہیں۔ یہ خدعہ ہے۔

غرض اس طرح کی پیشتر تدابیر جنگ میں اختیار کی جاتی ہیں۔ کین گاہوں میں بیٹھنا

۱ خدعہ کا مادہ خدع ہے جس کا معنی دھوکا اور مکرو فریب ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے فصیح العرب والعمم ہونے کی حیثیت سے خدعہ کی اصطلاح خود وضع فرمائی جس کے معنی چالیں اور داؤ ہے نہ کہ دھوکا فریب۔

میدان کارزار اور فوج کو لڑانے کی مہارت

دشمن کو بے خبر رکھ کر خطرے کی جگہ کھینچ لانا، دکھاوے کی پیش قدمی اور دکھاوے کی پسپائی سے دشمن کو مغالطہ میں ڈالنا۔ یا پسپائی کا مغالطہ دے کر اس کے آگے بڑھنے پر اسے چاروں طرف سے گھیر لینا یہ سب باتیں خدمتہ میں داخل ہیں۔ اور ایک کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے۔ جو موقع و محل کے مطابق بروقت ایسی تدابیر اختیار کر سکے۔

ایسی ہی صورت حال مسلمانوں کو ایران کی جنگوں میں پیش آئی۔ ایرانیوں کے دیو ہیکل اور سیاہ فام ہاتھیوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے گھوڑے جو بد کے تو اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے۔ پہلے ایک دو دن تو مسلمان سخت پریشان ہوئے۔ آخر ایک تدبیر ذہن میں آگئی۔ عربوں نے اپنے اونٹوں کو کالے برقع پہنائے اور جب یہ سیاہ کالے مہیب جانور میدان جنگ میں آئے۔ تو دشمن کے گھوڑے ڈر کر جو بد گئے تو دور تک اپنی فوجوں کو روندتے چلے گئے۔

اگر ہم اس پہلو سے بھی رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں کامیاب جرنیل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے

(۱) جنگ بدر کے میدان میں اس طرح صف بندی کی کہ دشمن کو مسلمانوں کی فوج اصل تعداد سے بہت زیادہ نظر آتی تھی۔ لہذا وہ مرعوب ہو گئے۔

(۲) جنگ خندق میں آپ نے خندق کھود کر دشمن کے سارے ارادوں اور تدبیروں پر پانی پھیر دیا۔ یہ ایک ایسی تدبیر تھی جو دشمن کے سامان و گمان میں بھی نہ تھی۔

(۳) جنگ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک عجیب جنگی تدبیر اختیار کی۔ قبیلہ غطفان کا اہل خیبر سے شرکت جنگ کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے رجب کی مقام پر فوج کو اترنے کا حکم دیا جو غطفان اور خیبر کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے حسب ضرورت کا انتظام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا گیا۔ اس تدبیر کا فائدہ یہ ہوا کہ غطفان کا اہل فوجی دستے آگے روانہ کرنے کا انتظام کر دیا۔ یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کر لی۔ اور کیمپ خیبر سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ جب غطفان کی فوجوں نے خیبر کے طرف پیش قدمی شروع کی تو اپنے علاقہ کو خطرہ میں دیکھ کر واپس ہو گئے۔

(۴) فتح مکہ سے ایک دن قبل جب آپ ﷺ نے مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالا تو فوج کو حکم دیا

کہ وہ دور تک کئی میلوں میں پھیل کر پڑاؤ ڈالیں اور آگ خوب روشن کریں۔ اس تدبیر کا بھی یہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی فوج اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ معلوم ہو۔ قریش مکہ کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا کیونکہ اس میں آپ ﷺ نے انتہائی رازداری سے کام لیا تھا۔ یکدم اتنی بڑی فوج دیکھنے پر اہل مکہ کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نفسیاتی طور پر اتنے مرعوب ہو گئے کہ مقابلہ کی جرأت نہ کر سکے۔

(۵) غزوہ بنو لحيان (ربیع الاول ۶ھ) کے موقع پر آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں نکلے اور اپنی فوجوں کا رخ شمال کی طرف کیا۔ جب یہ خبر قریش اور بنو لحيان میں مشہور ہوئی تو آپ ﷺ نے ناگہانی طور پر پلٹ کر بنو لحيان پر حملہ کر دیا۔ بنو لحيان اس ناگہانی حملہ سے گھبرا کر مقابلہ کی تاب نہ لاسکے اور منتشر ہو گئے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایسے ڈھنگ اختیار کیے جو اس جیسی لڑائیوں میں آج کے ترقی یافتہ دور میں استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے طائف کے محاصرہ میں منجیق دباہ اور ضبور سے کام لیا۔ اس وقت ایسے ہتھیاروں کا استعمال عجیب و غریب تھا۔ آپ ﷺ نے جنگ بدر میں اپنے ٹھہرنے کے لیے جو علیحدہ جگہ (عریش) تیار کروائی اور اپنا ٹھکانہ منتخب کرتے وقت تمام ضروری انتظامات کا لحاظ رکھا جیسا کہ آج کل کی جنگوں میں ہوتا ہے۔

(۴) گوریلہ جنگ

انفرادی جنگ کی یہ شکل بھی خدعہ ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ یہ طریق جنگ عموماً اس وقت استعمال کرنا پڑتا ہے جب کھلے میدان میں مقابلہ کی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ یا اگر ہو تو وہ یا غیر موثر ہو یا نقصان دہ۔ ایسی جنگ کسی جنگی ضابطہ یا نظم کے تحت نہیں لڑی جاتی۔ اس کا مقصد دشمن کے ٹھکانوں کو اور بعض تخریب کار عناصر کو خفیہ طریقہ اور داؤ سے نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ نیز دشمن کے بعض ایسے افراد جو زیر زمین سازشوں اور تخریب کاریوں میں مصروف رہتے ہیں اور کھلے میدان میں مقابلہ کو نہیں آتے۔ انہیں اس طریقہ سے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے چنانچہ جنگ احزاب سے قبل ایسے ہی چند دشمنان اسلام کا قلع قمع کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ ان دشمنان اسلام کا جرم اتنا

ہی نہ تھا کہ وہ اسلام کے دشمن تھے۔ بلکہ وہ طرح طرح گھناؤنے جرائم سے مسلمانوں کو اور خود پیغمبر اسلام کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور کھلے میدان میں لڑنے سے بھی گریز کرتے تھے۔

ابو جہل اور اس کا بیٹا عکرمہ ابوسفیان امیہ بن خلف غرض بیٹھارے افراد کا نام لیا جاسکتا ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کا مدینہ جانے کے بعد بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن ان کے متعلق حضور اکرم ﷺ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ انہیں خفیہ طریقہ سے ٹھکانے لگا دیا جائے جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دشمنی کرتے تھے تو شریفانہ اور کھلے طور پر کرتے تھے۔ میدان جنگ میں سامنے بھی آتے رہے۔

لیکن جن چند افراد کو حضور اکرم نے خفیہ طور پر ٹھکانے لگوادیا۔ وہ مکینہ دشمن تھے۔ معاہدہ تھے لیکن بد معاہدان کا جرم بھی ایک نہیں تھا۔ پھر میدان جنگ میں آنے کی بجائے مکین گاہوں سے نقصان پہنچانے والے تھے۔ ان کی مختصر سرگزشت درج ذیل ہے:-

کعب بن اشرف:

اشرف عربی النسل تھا اور اس کی بیوی بنو نضیر قبیلہ یہود کے سردار جہی بن اخطب کی بیٹی تھی۔ لہذا مدینہ میں اس کا بہت وقار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ جنگ بدر میں کافروں کی شکست کے بعد ان میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ کعب بڑا چوٹی کا شاعر اور فصیح اللسان تھا۔ ابوسفیان کے دورہ مدینہ کے بعد یہ مکہ گیا اور قریش مکہ کو خوب بھڑکایا۔ حضور اکرم ﷺ کی جہو بھی کرتا تھا۔ واپس مدینہ آ کر اس نے مسلمان عورتوں کے متعلق اشعار کہہ کر ان پر دہ نشینوں کو رسوا اور بدنام کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے کہا ”کون ہے جو کعب بن اشرف کی خبر لیتا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو بہت تکلیف دی۔“

ایک صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہنے لگے۔ ”آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ اسے قتل کر دوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں“ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ ”اچھا پھر مجھے اجازت دیجئے میں جو چاہوں اس سے کہہ لوں۔“ (یعنی اپنی باتوں سے اسے اپنے دام میں پھنسا لوں)

۱۔ ایسے جاٹاروں کو آج کی زبان میں کمانڈوز (Commandoes) کہا جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”کہہ لینا۔“

محمد بن مسلمہ ﷺ کعب بن اشرف کے پاس جا کر کہنے لگے۔ ”یار! یہ پیغمبر ﷺ ہم سے صدقہ و خیرات مانگتا ہے، ہمارے تو اپنے پاس کھانے کو کچھ نہیں اسے کیا دیں؟“

کعب کو موقع ہاتھ آ گیا کہنے لگا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

قصہ مختصر محمد بن مسلمہ ﷺ نے کعب سے کچھ مانگا تو کہنے لگا کوئی چیز گروی رکھو تو ادھار ملے گا۔ محمد مسلمہ ﷺ کہنے لگے ”مثلاً کیا گروی رکھیں؟“ کہنے لگا ”اپنی عورتیں گروی رکھ دو۔“ محمد مسلمہ ﷺ کہنے لگے تم ایک خوش شکل جوان ہو۔ ہمیں خطرہ ہے کہ عورتیں تم پر فریفتہ ہو جائیں گی۔ کعب کہنے لگا ”اچھا پھر اپنے لڑکے گروی رکھ دو۔ محمد بن مسلمہ ﷺ کہنے لگے ”کیا ہم لوگوں سے ساری عمر یہ طعنہ سنتے رہیں کہ ادھار کے لیے بیٹوں کو گروی رکھا تھا؟ البتہ ہم اپنے ہتھیار تمہارے پاس گروی رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس شرط پر معاملہ طے ہو گیا۔ اور دوبارہ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔“

رات کو محمد بن مسلمہ ﷺ اپنے چار ساتھیوں سمیت ہتھیار وغیرہ لے کر آئے آپس میں بات گن رکھی تھی۔ محمد بن مسلمہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اس لڑکے کی خوشبو سونگھنے کے بہانے اس کا سر تھام لوں گا۔ تم اسے قتل کر دینا۔ چنانچہ یہاں ہی ہوا۔ محمد بن مسلمہ ﷺ کعب سے کہنے لگے۔ ”یار! تمہارے سر کے بالوں سے بڑی نفیس خوشبو آ رہی ہے۔ کہو تو ذرا سونگھ لوں؟“ کعب اس بات پر پھولا نہ سمایا۔ کہنے لگا! ”ہمارے پاس عرب کی وہ عورت ہے جو سب عورتوں سے زیادہ معطر رہتی ہے اور سب سے زیادہ حسین و جمیل ہے۔“ پھر اس نے محمد بن مسلمہ ﷺ کو سر سونگھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ ﷺ نے اس بہانے سے اس کا سر خوب تھام لیا اور ساتھیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

کعب بن اشرف کو معاہدہ قوم کا ایک فرد تھا۔ یہ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی ذمی ذمی ہونے کے باوجود اگر پیغمبر ﷺ کو گالیاں دیتا ہے تو اس شخص کا معاہدہ از خود ٹوٹ جاتا ہے۔

(بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قتل کعب بن اشرف۔ معہ حاشیہ تیسیر الباری)

ابورافع عبد اللہ بن ابی الحقیق:

بنو نضیر کا رئیس تھا۔ خیبر میں رہتا تھا کعب بن اشرف کی طرح مسلمانوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کا جانی دشمن تھا۔ یہ بہت بڑا بزدبان تھا۔ رات کو محفل جما کر اس میں مسلمانوں کے خلاف من گھڑت قصے بیان کرتا۔ ان کے خلاف نفرت پھیلاتا اور ان کی تضحیک و تمسخر اڑاتا۔ کئی بار معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ جنگ احزاب کے موقع پر کئی قبائل کو ترغیب دے کر اور رد پیہ سے ان کی مدد کر کے مدینہ پر چڑھایا تھا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جو قبیلہ اس سے تعلق رکھتے تھے۔ کعب بن اشرف کا خاتمہ کر دیا تو انصار میں رشک پیدا ہوا۔ چنانچہ ابورافع کو کھینچ کر دار تک پہنچانے کے لیے قبیلہ خزرج کے ایک فرد عبد اللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ تیار ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین ساتھی اور بھی تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:-

رات کو ہم اس قلعہ کے قریب پہنچ گئے میں نے اپنے ساتھیوں کو قلعہ سے باہر بٹھرنے کو کہا اور خود قلعہ میں داخل ہونے والے لوگوں میں مل کر اندر داخل ہوا۔ اور گدھوں کے طویلے میں ایک جگہ چھپ گیا۔ کچھ دیر بعد دربان نے آواز دی ”کوئی باہر تو نہیں رہ گیا؟ اور جب کوئی جواب نہ پایا۔ تو قلعہ کا دروازہ اندر سے مقفل کر کے چابی ایک جگہ رکھ دی میں وہ جگہ دیکھ رہا تھا۔

جب رات کا ایک حصہ گزر گیا۔ بتیاں بجھ گئیں اور سب لوگ سو گئے۔ میں نے چپکے سے چابی لے کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ تاکہ بھاگتے وقت یہ کام نہ کرنا پڑے۔ اس کے بعد سب کمروں کی باہر سے کنڈیاں لگا دیں۔ تاکہ کوئی ابورافع کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ اب میں بالا خانے پر گیا جہاں وہ سو رہا تھا۔ کمرہ کھلا تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ ابورافع کہاں ہے۔ میں نے آواز دی۔ وہ بولا تو میں نے آواز پر تلوار کی ضرب لگائی مگر وار خالی گیا اور وہ چیخ اٹھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے آواز کو بدل کر اُس سے پوچھا۔ ”ابورافع کیا ہوا؟“ جیسے کوئی اس کا کارندہ اس کی مدد کو پہنچ رہا ہو۔ ابورافع بولا۔ ”تیری ماں مرے ابھی مجھ پر کسی نے تلوار کا وار کیا ہے۔ میں نے پھر آواز پر ضرب لگائی۔ لیکن اب کی بار بھی وار کاری نہ لگا تو میں نے نزدیک جا کر اس کے پیٹ میں تلوار جھونک دی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ مر گیا ہے۔

میں گھبراہٹ میں نیچے اتر آیا سیڑھی سے پھسلا۔ میرے پاؤں میں موج آگئی۔ تاہم

اپنے ساتھیوں کو جا کر خوشخبری دی۔ اور کہا اب جاؤ میں اس وقت آؤں گا جب قلعے سے رونے کی آواز آئے۔ کچھ دیر بعد صبح ہوئی تو قلعہ سے موت کی خبر دینے والے نے کہا۔ لوگو! ابورافع گزر گیا۔ میں سن کر وہاں سے بھاگا۔ اس وقت مجھے خوشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے پاؤں میں کوئی درد ہے ہی نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پہلے مدینے پہنچ کر نبی ﷺ کو یہ خوشخبری دی۔

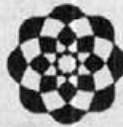
(بخاری۔ کتاب المغازی باب قتل ابورافع)

ان واقعات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) مندرجہ بالا واقعات میں مقتول صرف یہودی ہیں۔ جو بد عہد، دھوکہ باز، کمینہ دشمن، ہر وقت سازشیں کرنے والے اور مسلمانوں کو اور پیغمبر اسلام کو زبان اور عمل سے ایذا پہنچانے والے تھے اور اساطین کفر تھے۔ لیکن کھل کر میدان مقابلہ میں نہیں آتے تھے۔

(۲) ایسے بد عہد انفرادی شریکوں کی سرکوبی کے لیے _____ ان کو ختم کرنے کے لیے حیلہ بہانہ سے کام لیا جاسکتا ہے۔

(۳) ایسی گوریلا جنگ بھی امیر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔ ورنہ وہ فتنہ و فساد ہی شمار ہوگا۔ جس کی اسلام میں کسی صورت اجازت نہیں۔



باب چہارم

ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف

پچھلے باب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق ان امور سے ہے جو فتح و کامرانی کے حصول کے لیے ایک جرنیل کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس باب میں ہم ایسے ذاتی اوصاف کا ذکر کریں گے جو کسی جرنیل کی عظمت کا مقام یا درجہ متعین کرتے ہیں:-

(۱) شجاعت اور بہادری

جب معرکہ کارزار میں فوج کے پاؤں اکٹھا جاتے ہیں تو سپہ سالار کی شجاعت ہی وہ جوہر ہوتا ہے۔ جو فوج کو شکست سے بچا کر فتح سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سپہ سالار کی شجاعت اور نجات تھکے ہارے سپاہیوں کی زندگی میں نئی روح پھونک کر جنگ کا رخ پھیر دیتی ہے۔ نجات اس صفت کو کہتے ہیں کہ جب موت بالکل سامنے نظر آنے لگے تو سب بھی اعتماد علی النفس بحال رہے۔ چنانچہ ایسے ہی چند واقعات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

(۱) مدینہ میں خوف و ہراس کی فضا:

جن دنوں مدینہ پر قریش مکہ کے حملہ کا خطرہ ہر وقت مسلط رہتا تھا انہیں ایام سے متعلق

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:-

(آنحضرت ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ اک بار ایسا ہوا کہ رات کو اہل مدینہ (دشمن کے ڈر سے) گھبرا گئے۔ اور آوازیں طرف نکل کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ادھر سے لوٹ کر واپس آ رہے ہیں۔ آپ ﷺ لوگوں سے پہلے اکیلے ہی روانہ ہو گئے تھے اور صورت حال

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ وَأَشْجَعَ النَّاسِ وَلَقَدْ فُزِعَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ لَيْلَةَ فَخْرٍ جُؤَانِحُوا الصُّوْتِ فَاسْتَقْبَلَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ اسْتَبْرَأَ الْعَجْبَرِ وَهُوَ عَلَى فَرَسٍ لَابِسٍ طَلْحَةَ عُرْبِيٍّ وَفِي عُنُقِهِ السِّيفُ وَهُوَ يَقُولُ: لَمْ تُرَاغَبُوا،

لَمْ تَرَ غَوًّا“)) (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب الحمائل و تعليق السيف بالعنق)
 کی تحقیق کر آئے تھے۔ آپ ﷺ ابو طلحہ کے
 گھوڑے کی تنگی پیچھے پر سوار تھے۔ گلے میں
 تلوار لٹکائی ہوئی تھی اور فرما رہے تھے۔
 گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔)

اب دیکھئے مدینہ پر دشمن کے کسی بھی وقت حملے کا ہراس بھی طاری تھا۔ اس حال میں
 ایک معمولی افواہ بھی یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ پھر لوگوں نے کچھ اس قسم کی آواز بھی سنی تھی۔
 آپ ﷺ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کس تعداد میں ہے اور ان سب باتوں کے باوجود آپ ﷺ
 نے نہ کسی کو ساتھ لیا اور نہ کسی کا انتظار کیا۔ اس صورت حال میں اکیلے بڑھ کر اپنی جان کو خطرہ میں
 ڈال دینا آپ کی شجاعت کی زبردست دلیل ہے۔

(۲) جنگ احد:

جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا اور ابن قمریہ نے یہ افواہ پھیلا دی کہ
 (نعوذ باللہ) محمد ﷺ قتل ہو گئے۔ تو اس وقت مسلمانوں پر اس قدر بدحواسی طاری ہو گئی تھی کہ
 انہیں دوست و دشمن کی بھی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہ ؓ کے والد حضرت یمان ؓ مسلمانوں
 کے ہی ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حالانکہ حضرت ؓ پکار پکار کر کہتے رہے کہ یہ میرے والد ہیں۔ لیکن
 اس بدحواسی کے عالم میں کسی کی کون سنتا ہے؟ مسلمانوں میں سے ایک گروہ نے مایوس ہو کر جنگ
 بندی کر دی۔ ایک فریق میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس حال میں رسول اللہ ﷺ اکیلے
 میدان میں کھڑے مسلمانوں کو واپس بلا رہے تھے۔ اس حالت کا نقشہ اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں
 بیان فرماتے ہیں:-

﴿اِذْ تَضَعُ دُونَ وَلَا تَلُونَ عَلٰی اَحَدٍ وَّ
 الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْ اٰخِرٰكُمْ﴾
 (جب تم بگٹھ دوڑے جا رہے تھے اور
 باوجود یہ کہ پیغمبر پچھلے گروہ میں رہ کر تم کو بلا رہا
 تھا۔ لیکن تم مڑ کر بھی کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔)
 (۱۵۲:۳)

اس حالت میں آپ ﷺ تیزی سے دشمن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آپ نے شکست
 دل فوج کو الٰہی عباد اللہ، الٰہی عباد اللہ، اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ کے آواز دے کر جمع کیا، جنگ
 کی پلاننگ میں فوری تبدیلی کی اور ایسا سنبھل کر مقابلہ کیا کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہ

ہو۔ کا۔

غور فرمائیے عام جنگوں میں اگر ایسی صورت حال پیش آجائے تو سپہ سالار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ بھاگ کر اپنی جان بچائے۔ لیکن آپ خود پکار پکار کر اپنے دشمن کو مطلع کر رہے ہیں کہ میں اس جگہ ہوں۔

(۳) جنگ حنین:

جنگ حنین میں بھی ابتداءً مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کو دشمن کے تیروں کی بارھ سے کوئی جائے پناہ نہیں ملتی تھی۔ قرآن کریم میں ہے:-

(اور جنگ حنین میں جب تمہیں اپنی کثرت تعداد پر ناز تھا۔ لیکن وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آسکی۔ اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔)

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتَكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمُ الْمُذَبِّحِينَ﴾ (۲۵:۹)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کسی نے جنگ حنین میں بھاگنے کی کیفیت پوچھی تو آپ

رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(اللہ کی قسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹھ نہیں موڑی (جبکہ دوسرے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے) ہوا یہ کہ جلد باز لوگوں نے پیٹھ پھیری (لوٹ پر لگ گئے) ہوازن کے کافروں نے ان کو نیزوں پر دھرایا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید فخر پر سوار تھے اور ابو سفیان بن حارث اس کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ شعر پڑھ رہے تھے)

((لَا وَاللَّهِ مَا وَلى النَّبِىَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ وَلى سُرْعَانَ النَّاسِ فَلَقَبَهُمْ هُوَ اَزَنٌ بِأَلْسِنَةٍ وَالنَّبِىَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى بَغْلَتِهِ الْبَيْضَاءِ وَأَبُو سَفْيَانَ ابْنُ الْحَارِثِ إِحْدَ بِلْجَامِهَا وَالنَّبِىَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ:))

أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَلِّبِ

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ

(بخاری۔ کتاب الجهاد والسر باب بغلة النبی)

بخاری کتاب المغازی۔ باب غزوة طائف

ہوں میں بیٹمبر بلا شک و خطر اور عبد المطلب کا ہوں پسر
حدیث مذکورہ میں تین باتیں قابل غور ہیں جو آپ ﷺ کی شجاعت اور نجات کے واضح دلائل
ہیں:-

- (۱) فوج میں بھگدڑ مچی ہے۔ اس حال میں آپ ﷺ فخر پر سوار ہیں۔ کسی تیز گام گھوڑے پر نہیں کہ آپ ﷺ بھی کسی محفوظ مقام پر جلد پہنچ کر پناہ لے سکیں۔
- (۲) فخر کارنگ بھی سفید تھا۔ جو دشمن کو دور سے بخوبی نظر آ سکتا ہے۔
- (۳) نعرہ بھی آپ ﷺ وہ لگا رہے ہیں جو دشمن کے کینہ و عداوت کا اصل سبب ہے۔

ایک دوسری روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”اس وقت نبی ﷺ فخر کو ایز لگانے اور دشمن کی طرف بڑھانے لگے۔ میں نے لگام اور ابوسفیان نے رکاب تھام لی۔ اس ارادہ سے کہ آنحضرت ﷺ کو آگے بڑھنے سے روک دیں۔“ اور صحیح مسلم میں اس واقعہ کے بعد پھر یہ الفاظ ہیں۔ ”نبی ﷺ اپنی فخر سے اتر پڑے۔“

شجاعت و نجات اور اللہ تعالیٰ پر توکل کی ایسی نظیر نہایت مشکل ہے۔ تیروں کی بوچھاڑ سے فوج تو دم دبا کر بھاگ نکلے اور سپہ سالار سواری کو ایز لگائے دشمن کی طرف بڑھنے پر مصر ہو۔ پھر جب آپ ﷺ کے چچا اور چچا زاد بھائی نے آپ ﷺ کو روکا تو آپ ﷺ فخر سے اتر کر پیدل ہی اس طرف نعرہ لگاتے چل کھڑے ہوتے ہیں یہ آپ ﷺ کی اس بینظیر شجاعت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے ایک طرف منہ کر کے پکارا ”یا معشر المہاجرین“ اور دوسری طرف منہ کر کے پکارا ”یا معشر الانصار! تو تمام صحابہ اس آواز پر لبیک کہہ کر واپس پلٹ آئے اور ایسی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کہ شکست شاندار فتح میں بدل گئی۔

(۴) دشمن کا تلوار سونت کر آپ ﷺ کے سر پر کھڑا ہونا:

غزوہ ذات الرقاع ۷ھ میں جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔ بنو غطفان چند قبائل کے ساتھ اتحاد کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی تو آپ ﷺ چار سو صحابہ کو لے کر ان کی گوشمالی کو نکلے۔ اس غزوہ کو ذات الرقاع یا چیتھڑوں والا غزوہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سفر میں سواری بہت کم تھی۔ چھ آدمیوں کے حصہ ایک اونٹ آتا تھا۔ اور اکثر صحابہ کو یہ

دشوار گزار سفر بیدل ہی کرنا پڑا۔ جس سے پاؤں پر آبلے پڑ جاتے تو ان کے گرد پٹیاں لپیٹ کر سفر جاری رکھتے تھے۔ جب آپ ﷺ منزل مقصود پر پہنچے تو دشمن مرعوب ہو کر منتشر ہو گیا۔ اس سفر سے واپسی پر ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا جسے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:-

(انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نجد کی طرف جہاد کیا۔ جب آپ ﷺ وہاں سے لوٹے تو میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ لوٹا۔ اتفاق سے دو پہر کو ایسے مقام پر پہنچے جہاں خاردار درخت بہت تھے حضور اکرم ﷺ وہاں اتر پڑے۔ اور آپ ﷺ کے ساتھی الگ الگ درختوں کے سائے میں ٹھہرے۔ آپ ﷺ ایک کیکر کے درخت کے نیچے ٹھہرے اور تلوار درخت سے لٹکا دی (اور سو گئے) جابر کہتے ہیں ہم لوگ بھی سو رہے تھے۔ ایک ایک رسول اللہ ﷺ ہم کو بلانے لگے۔ ہم آئے تو دیکھا آپ ﷺ کے پاس ایک گنوار (غورث بن حارث) بیٹھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پتہ ہے ابھی اس گنوار نے کیا کیا؟ میں سو رہا تھا کہ اس نے میری تلوار سونت لی۔ میں جاگا تو سنی تلوار اس کے ہاتھ میں دیکھی۔ کہنے لگا اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا ”میرا اللہ“ دیکھو وہ گنوار یہ بیٹھا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کو کوئی سزا نہ دی۔)

((اِنَّهُ غَزَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ نَجْدٍ فَلَمَّا قَفَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَفَلَ مَعَهُ فَاذْرُ كُنْهَمُ الْقَائِلَةَ فِي وَادٍ كَثِيْرٍ الْعِصَاةِ فَنَزَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ فِي الْعِصَاةِ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرَةِ وَنَزَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمْرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ قَالَ جَابِرٌ: فَبِمُنَا نَوْمَةٌ ثُمَّ اِذَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْنَا، فَجَنَانَاهُ فَاِذَا عِنْدَهُ اَعْرَابِيٌّ جَالِسٌ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ هَذَا اِخْتَرَطَ سَيْفِيْ وَاَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقِظْتُ وَهُوَ فِي يَدِيْ صَلْتًا فَقَالَ لِيْ: مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ؟ قُلْتُ: اللّٰهُ! فَهِيَ هُوَ ذَا جَالِسٍ“. ثُمَّ لَمْ يَعَاتِبْهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)) (بخاری، کتاب المغازی باب غزوة ذات الرقاع)

اور بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ بچائے گا“ تو اس بدو پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی جو آپ ﷺ نے پکڑ لی اور سونت کر کہا۔ ”بتاؤ! اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا۔ کہنے لگا آپ ﷺ کا رحم و کرم“ آپ ﷺ نے

اسے کوئی سزا نہ دی۔

غور فرمائیے اس دشمن قبیلے کا ایک مشرک تلوار سونٹے سر پر کھڑا ہے جس سے جنگ کے لیے آپ ﷺ گئے تھے۔ اس حالت میں بھی آپ ﷺ کے پائے ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہیں آئی..... پھر یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ جو لوگ جس قدر شجاع اور بہادر ہوتے ہیں اتنا ہی ان میں رحم و کرم بھی زیادہ ہوتا ہے چنانچہ اس پر پورا اختیار رکھنے کے باوجود آپ ﷺ نے اس کو معاف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنوار بعد میں نہ صرف خود مسلمان ہوا بلکہ اس کے ذریعہ اس کے قبیلے کے بہت سے لوگ حلقہٴ اسلام میں داخل ہوئے۔

غرض آپ ﷺ کی شجاعت کے واقعات تو بی شمار ہیں۔ لیکن ہم نے صرف ایسے واقعات درج کیے ہیں جن کا تعلق صرف جنگ سے ہے۔ حضرت علیؓ جن کی اپنی شجاعت ضرب المثل بن چکی ہے، جنہوں نے جنگ بدر اور خندق میں دعوت مبارزت دینے والے کفار کو ایک وار سے جہنم واصل کیا، جن کے ہاتھوں خیبر کا سب سے مضبوط قلعہ قموں فتح ہوا، وہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

((أَنَا كُنَّا إِذَا حَمَى النَّبَأُ وَأَخْمَرَتْ
الْحَدِيقُ اتَّقَيْنَا بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا يَكُونُ أَحَدًا أَقْرَبْنَا إِلَى
الْعَدُوِّ مِنْهُ)) (مسند احمد ج ۱ ص ۱۲۶)

(جب گھمسان کارن پڑتا اور لڑنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے۔ اور سب سے آگے دشمن کی جانب نبی ﷺ ہی ہوتے تھے۔)

ہجرت کے دوران جب آپ ﷺ سازشیوں کے مسلح سپرہ سے بچ کر نکل آئے تو حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ لے کر غار ثور میں پناہ لی۔ قریش اپنی ناکامی پر بہت تنگ پا ہو گئے۔ اور ہر طرف آپ ﷺ کی تلاش میں آدمی روانہ کیے اور سوانت انعام بھی مقرر کیا۔ آپ ﷺ حالات سے باخبر رہتے تھے۔ مسلسل تین دن آپ ﷺ کی تلاش جاری رہی اور آپ ﷺ اس غار میں پناہ گزین رہے۔ غصہ سے پھرے ہوئے قریشیوں کے چند افراد غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اگر وہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھتے تو غار کے اندر سے آپ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ ان کو باسانی نظر آسکتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جیسے بہادر اور جری انسان نے جب ان کو دیکھا

تو موت کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور آپ ﷺ سے کہنے لگے۔ ”اگر یہ لوگ اپنے قدموں کی طرف دیکھ پائیں تو پھر کیا ہو؟“ اس سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:۔ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (۳۰:۹) غم مت کیجئے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

گویا آپ نے سبق یہ دیا تھا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ! یہ خیال مت کرو کہ ہم دو ہیں۔ بلکہ ہمارے درمیان ایک تیسرا اللہ تعالیٰ بھی ہے۔

یہ تھا آپ ﷺ کے استقلال اور نجات اور اللہ پر توکل کا نمونہ۔ ایک عیسائی مصنف ایف سی اینڈریوز اس واقعہ کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ”میں مسلمان نہیں ہوں مگر غار ثور کے اس واقعہ کی مدح ضرور کرتا ہوں بصد احترام جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات کا خیال مت کرو کہ ہم دو نہیں ایک تیسرا اللہ تعالیٰ بھی ہمارے درمیان ہے“۔..... مہیب خظروں میں گھرے ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ کے پائے استقامت اور ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا..... میں ان الفاظ کی تعریف و توصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب میں کبھی ان الفاظ کو دھراتا ہوں تو وجدان روحانی جوش و خروش سے جھومنے لگتا ہے اور الفاظ بار بار میرے ذہن میں عود کر آتے ہیں ”ابو بکر رضی اللہ عنہ! یہ خیال مت کرنا کہ ہم دو ہیں۔ نہیں ہمارے درمیان ایک تیسرا ساتھی بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ“۔ (سرور کونین ص ۱۰۶/۱۰۵)

(۲) فوج سے ہمدردی اور مساوات

بلاشبہ سپہ سالار کی اصل ذمہ داری فوجوں کو کمان کرنا ہے اور فوج اس کے حکم کی تعمیل کی پابند ہوتی ہیں۔ لیکن کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے جو عند الضرورت اس بالا تر مقام سے نیچے اتر کر سپاہیوں کے ساتھ گھل مل کر کام کرے۔ ان سے ہمدردی اور محبت سے پیش آئے اور خود کو انہیں میں کا ایک فرد تصور کرے۔ اس کے طرز عمل سے فوج کے سپاہی اس پر جان چھڑکنے لگتے ہیں۔

امریکہ کے ایک مشہور جرنیل واشنگٹن کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے۔ وہ سادہ کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستہ میں اس نے دیکھا کہ چند سپاہی ایک بھاری شہیتہ اٹھا رہے ہیں مگر وہ اٹھتا نہیں۔ ان کا افسر پاس کھڑا ہدایات دے رہا تھا۔ کہ ادھر سے اٹھاؤ، ادھر سے بلاؤ، مگر خود ہاتھ نہیں ہلاتا تھا۔ واشنگٹن نے گھوڑا روک کر اس عہدہ دار سے کہا اگر آپ بھی

ساتھ شامل ہو جائیں تو یہ شہیترا اٹھایا جاسکے گا۔ عہدیدار نے کہا۔ ”آپ کو پتہ نہیں میں کارپول ہوں۔“

واشنگٹن گھوڑے سے اتر، کوٹ اُتار اور آستینیں چڑھا کر سپاہیوں کے ساتھ زور لگانے میں شامل ہو گیا۔ شہیترا اٹھا کر منزل مقصود پر پہنچا دیا گیا اور کارپول صاحب یہ سب کچھ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ واشنگٹن جب جانے لگا تو کارپول سے کہا۔ ”آئندہ جب کبھی کسی محنت کے کام میں ایک آدمی کی ضرورت پڑے تو آپ مجھے بلا لیا کریں۔ مجھے آپ آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں کیونکہ میں آپ کا سپہ سالار واشنگٹن ہوں۔“ واشنگٹن کا نام سنتے ہی کارپول زمین میں گر گیا۔ جبکہ واشنگٹن وہاں سے جا چکا تھا۔ (رہبر کامل ص ۹۲)

یہ بات صرف واشنگٹن تک محدود نہیں عموماً بڑے بڑے جرنیلوں میں یہ صفت ان کی عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نیولین بونا پارٹ کے متعلق مشہور ہے کہ خود بہت محنتی تھا اور اپنے سپاہیوں سے بھی کام لینا جانتا تھا۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ اپنے سپاہیوں سے اتنا گھل مل کر رہتا تھا کہ اسے اکثر سپاہیوں کے نام تک بھی زبانی یاد تھے۔

اس پہلو سے بھی اگر ہم حضور اکرم ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ تو آپ ﷺ کی ہستی سب سے ممتاز نظر آئے گی۔ ہم ذیل میں چند مستند واقعات سے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں:-

(۱) خندق کی کھدائی:

غزوہ خندق یا احزاب کے موقع پر جب عرب کے تمام قبائل اور یہودی مدینہ پر یکبارگی حملہ آور ہونے پر متحد ہو گئے تو یہ مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا وقت تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ ﷺ سے مدافعتانہ طریق جنگ سے متعلق مشورہ کیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کی تجویز پیش کی تو آپ ﷺ نے اسے پسند فرمایا اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر اتفاق ہو گیا۔

مگر یہ خندق کھودنے کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت جانفشانی سے بھوکے رہ رہ کر اس کام کو سرانجام دیا۔ آپ ﷺ نے دس دس گز زمین دس صحابہ رضی اللہ عنہم کو بانٹ کر دی۔ چنانچہ یہ پندرہ سو (۱۵۰۰) فٹ لمبی ۱۵ فٹ گہری اور بیس پچیس فٹ چوڑی خندق

بائیس دن میں تیار ہوئی۔ اتفاق کی بات کہ ادھر خندق مکمل ہوئی ادھر دشمن سر پر آ پہنچا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کھدائی کا منظر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:-

((جعل المهاجرون والانصار يحفرون الخندق حول المدينة وينقلون التراب على متونهم ويقولون: نحن الذين بايعوا محمداً على الجهاد ما بقينا أبداً والنبي صلى الله عليه وسلم يجيهم ويقول: اللهم انملا خير الأخره فبارك في الأنصار والمهاجرة- (بخاری- کتاب الجہاد- باب حفر الخندق) فرما۔))

(انصار اور مہاجرین مدینہ کے گرد خندق کھود رہے تھے اور اپنی پیٹھ پر مٹی ڈھور رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔) ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے جب تک زندہ رہیں جہاد پر بیعت کی ہے۔ اور نبی ﷺ ان کو یوں جواب دیتے جاتے تھے۔ فائدہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف آخرت کا فائدہ ہے۔ اے اللہ انصار اور مہاجرین کو برکت عطا فرما۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی شمولیت ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:-

((رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاحزاب ينقل التراب وقد وارى التراب بياض بطنه-)) (بخاری- کتاب الجہاد باب حفر الخندق)

میں نے غزوہ احزاب میں آنحضرت ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ خود مٹی ڈھور رہے تھے اور آپ ﷺ کے گورے گورے پیٹ کو مٹی نے ڈھانپ لیا تھا۔

خندق کی کھدائی کے دوران ایک چٹان آگئی جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسی صورت نہ ٹوٹی تھی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کو بلا کر یہ مسئلہ پیش کیا۔ تو آپ ﷺ نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر پوری قوت سے گینتی کی ضرب لگائی تو وہ چٹان پاش پاش ہوگئی۔ اس وقت بھی بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ کے پیٹ، پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ (بخاری- کتاب المغازی- غزوہ احزاب)

(۲) بھوک کی شدت:

خندق تیار ہونے بھی نہ پائی تھی کہ دشمن سر پر آ پہنچا اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ رسد کے پہنچنے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ یہ محاصرہ بیس بائیس دن تک جاری رہا۔ خوراک کی قلت کا یہ حال تھا کہ تین تین دن مسلسل فاقے سے گزر رہے تھے۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک کی

حالت میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھوک سے بے تاب ہو کر آپ کے سامنے اپنے اپنے شکم کھول کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹایا تو دو بندھے تھے۔ (شامک ترمذی) اپنے ساتھیوں سے دکھ درد میں شرکت کی ایسی مثال تاریخ میں اور بھی کہیں مل سکتی ہے؟ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسی تنگی تڑشی صرف غریب سپاہیوں کا مقدر ہوتی ہے۔ افسر لوگ ایسی تکالیف کا پہلے سے انتظام کر رکھتے ہیں۔

(۳) سواری میں مساوات:

غزوہ بدر کے موقعہ پر جب مسلمانوں کے پاس آلات حرب کی بھی بہت کمی تھی اور سواریوں کی بھی۔ آپ ﷺ کے حصہ میں جو اونٹ آیا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مرشد بن ابی مرشد غنوی بھی شریک تھے۔ اس پر آپ صرف اپنی باری سے سوار ہوتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جاں نثارانہ طور پر اپنے سوار ہونے کی باری کی پیش کش کرتے اور کہتے کہ آپ ﷺ سوار رہیں اور ہم پیادہ چلتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”نہ تو تم مجھ سے زیادہ پایادہ چل سکتے ہو اور نہ ہی میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔“ (مسند امام احمد ج ۱ ص ۴۲۲)

www.KitaboSunnat.com

(۴) کام کاج میں شرکت:

کسی غزوہ پر جاتے ہوئے آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ اوکو کھانا پکانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں کام بانٹ لیے۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کام کاج میں مصروف ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ وہاں سے غائب ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پریشان ہوئے تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ آپ ﷺ جنگل سے ایندھن اکٹھا کر کے لا رہے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کام ہم کر لیں گے آپ تکلیف نہ فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”ہاں ٹھیک ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھوں۔ اللہ اس بندہ کو پسند نہیں کرتا۔ جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔“ (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۴۱۲)

غور فرمائیے۔ جب یہ بات عقیدہ میں شامل ہو تو سپہ سالار یا دوسرے کماندار کیونکر امتیازی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں؟

ایک انگریز مصنف مسٹر وائل، اپنی تصنیف ”ہسٹری آف دی اسلامک پیپل“ میں

رسول اللہ ﷺ کے کردار کے اس پہلو پر یوں رقمطراز ہے۔ آپ ﷺ اتنے منکسر المزاج تھے کہ اپنے معتقدین کے ساتھ کسی ایسے سلوک کے بالکل روادار نہ تھے۔ جو آپ کو ان سے ممتاز کر دے۔ جس کام کو آپ کر سکتے تھے کبھی اپنے غلاموں سے بھی وہ کام نہ لیتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا آپ ﷺ بازار میں سودا خرید رہے ہیں۔ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگا رہے ہیں بکری کا دودھ اپنے ہاتھ سے دھور رہے ہیں۔ درنوبی ہر ایک کے لیے اور ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اور ہر شخص کی رسائی آپ ﷺ تک بلا روک ٹوک ہوتی۔ آپ ﷺ بیماروں کی عیادت کرتے اور ہر ایک کے ساتھ رحم و شفقت کا برتاؤ کرتے۔ اگر کوئی سیاسی وجہ حائل نہ ہوتی تو آپ ﷺ سلوک اور تواضع سے کبھی منہ نہ موڑتے۔“ (سرور کونین ص ۲۶)

آپ ﷺ کے اسی طرح کے سلوک کا یہ اثر تھا کہ یہ مقدس فوج اپنے عظیم سپہ سالار پر پروانہ وار جاں نثار کرتی تھی۔ غزوہ احد میں جب آپ ﷺ کو شترکین نے ہر طرف سے گھیر لیا تو مسلمانوں نے اپنے جسموں سے ڈھال کا کام لے کر انہیں روکا اور حتی الوسع آپ ﷺ کو آٹچ نہ آنے دی۔ عروہ بن مسعود ثقفی جو صلح حدیبیہ کے وقت قریش مکہ کی طرف سے سفیر بن کر آیا داپسی پر جا کر قریش مکہ سے صحابہ کرام کی پروانہ وار شفقتی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:-

اے قریش! میں روم، ایران اور حبش کے بادشاہوں کے پاس بھی گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا! جیسے محمد ﷺ اپنی قوم میں ہیں۔ جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس کے اصحاب فوراً لپکتے ہوئے حکم بجالاتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں پانی نہیں گرنے دیتے اور اس کے لیے دوڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو اپنی آواز دھیمی کر لیتے ہیں اور ہمہ تن متوجہ ہو کر بات سنتے ہیں اور ادب و تعظیم کی وجہ سے نظر بھر کر ان کی طرف نہیں دیکھتے۔ محمد ﷺ کے ساتھی کبھی اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لہذا تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم محمد ﷺ کی بات مان لو۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔“ (بخاری۔ کتاب الشروط۔ باب الشرط فی الجہاد للمصالحة)

اور حضور اکرم ﷺ کو اپنے صحابہ کرام ﷺ سے جس قدر ہمدردی، موانست اور محبت تھی

ان کی شہادت اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی ہے:-

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ
عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ
(تمہارے پاس تمہاری ہی سے ایک رسول آئے۔ تمہاری تکلیف ان پر گرا بنا رہے۔)

وہ تمہاری بھلائی کے لیے حریص ہیں اور
مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے
مہربان ہیں۔

(۳) جوہر شناسی

ایک سو سالار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی فوج کے افراد کی ذاتی صلاحیتوں سے واقف ہوتا کہ انکی صلاحیت کے مطابق ہر ایک سے کام لے سکے۔ آپ ﷺ میں جوہر شناسی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فوج کے تمام افراد آپ ﷺ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ جیسا کہ درج ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آپ سے افسری کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم کمزور آدمی ہو۔ اور افسری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت تھی۔

(۲) حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ زندگی بھر کفار کی بلیغ اشعار سے مدافعت فرماتے رہے۔ آپ ﷺ نے ان کے اشعار سن کر یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ فی البدیہہ شعر گوئی میں روح القدس آپ کو مدد کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ کا دل جنگ کے لیے طاقتور نہیں تھا۔ لہذا آپ ﷺ انہیں بطور سپاہی میدان جنگ میں نہیں لے گئے۔ بلکہ احد اور خندق کے موقع پر عورتوں کی حفاظت کے لیے مدینہ میں چھوڑ دیا تھا۔

(۳) جنگ احد کے دن آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اس تلوار کا حق کون ادا کرتا ہے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رشک بھری نظروں سے آپ ﷺ کو اور تلوار کو دیکھنے لگے۔ تو آپ ﷺ کی نظر انتخاب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر پڑی جنہوں نے فی الواقع اس کا حق ادا کیا۔ اور کشتوں کے پستے لگا دیے۔

(۴) جنگ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک جھنڈا تیار کیا اور فرمایا کہ کل میں یہ جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ خیبر کو فتح کرے گا۔ تمام بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے امیدوار تھے اور منتظر تھے کہ دیکھیں کہ جھنڈا کسے ملتا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے

جبری اور بہادر صحابی فرماتے ہیں کہ مجھے خیبر کے دن کے علاوہ زندگی بھر کبھی امارت کی آرزو پیدا نہیں ہوئی۔ دوسرے دن جب جھنڈا سپرد کرنے کا وقت آیا۔ تو آپ ﷺ کی نظر انتخاب اس شخص پر پڑی جو حاضرین میں موجود بھی نہ تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا اور پوچھا وہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی آنکھیں دکھنے میں آئیں ہیں۔ اور وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں طلب فرمایا۔ آنکھوں پر لب مبارک لگایا تو آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ پھر آپ ﷺ نے جھنڈا ان کے حوالہ کر دیا۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ... میں بہادری کے تمام اوصاف موجود تھے جو ایسے موقع پر درکار تھے۔ اور واقعات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ آپ ﷺ کا انتخاب بالکل درست تھا۔

(۵) اسی طرح آپ ﷺ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ کون لوگ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اپنی وفات سے قبل آپ ﷺ نے شام کی سرحدوں پر شورش کو دفع کرنے کے لیے جو لشکر ترتیب دیا۔ اس کا سپہ سالار حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے، کو مقرر کیا۔ جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے بہادر اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک صحابہ موجود تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت بعض لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوئی کہ اتنے اتنے بڑے معزز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک غلام زادے کی ماتحتی میں جہاد پر روانہ ہوں۔ لیکن آپ ﷺ جانتے تھے کہ حضرت اسامہ بن زید میں مطلوبہ قائدانہ صلاحیت اور بہادری موجود ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے تقرر سے آپ ﷺ کا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ نسلی تفوق کے بت کو ساتھ ہی پاش پاش کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تقرر سے یہ دونوں مقصد حاصل ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے ایک پنتھ سے دو کاج کا کام لیا۔

آپ ﷺ کی فتوحات کی وجوہ میں جو ہر شناسی کو بہت بڑا دخل ہے۔ تھوڑی سی فوج سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اپنے مقصد کو حاصل کر لینا آپ ﷺ کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتی۔

(۴) باہمی مشاورت

مشورہ امیر کی خود سری اور پندار نفس کا موثر علاج ہے جو اسے آمرانہ حیثیت سے نیچے

اتار کر مشورہ دہندگان کی سطح پر لاکھڑا کرتا ہے۔ دوسری طرف مشورہ دہندوں میں خود اعتمادی اور عزت نفس بحال کر کے انہیں اس قابل بنادیتا ہے کہ وہ سلطنت کے کاروبار میں برابر شریک سمجھے جا سکیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے کہ مشورہ حقیقی جمہوریت کی روح رواں ہے یہی وجہ ہے کہ آمر قسم کے لوگ مشورہ میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ محض حکم چلانے میں ہی اپنی شان سمجھتے ہیں اور بسا اوقات ایسی خطرناک غلطیاں کر بیٹھتے ہیں جو بالآخر ان کی دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ ہر قسم کے سربراہ اور اسی طرح ایک جرنیل کی عظمت کا راز اس بات میں ہے کہ وہ تمام اہم امور میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ لیتا رہے۔ اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ سے فرماتے ہیں:-

((وَسَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ)) (۱۵۹:۳)
(آپ ﷺ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا
کیجئے۔ پھر جب کسی کام کا عزم کر لیں تو اللہ
تعالیٰ پر توکل کیجئے۔)

مشورہ کے فائدے:

مشورہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:-

- (۱) اس سے رائے عامہ اپنی اجتماعی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ آزادی سے اپنی رائے کے اظہار کا موقع میسر آتا ہے۔
- (۲) شوری کے فیصلے سے رائے عامہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ مشیر اور عوام اسے اپنا ذاتی فیصلہ سمجھ کر اسے بروئے کار لانے میں مستعد ہو جاتے ہیں۔
- (۳) معاملہ کے سب پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور درست نتائج تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ واضح رہے کہ دور نبوی اور خلافت راشدہ میں شوری کے فیصلے امت کے لیے واجب التعمیل اور قانون کا ماخذ قرار پائے ہیں۔ آپ ﷺ حکومت کے ہر اہم معاملہ میں شوری طلب فرماتے تھے۔ یہ معاملہ خواہ دین کی مصلحتوں سے متعلق ہو تا یا دنیوی مفاد سے، اجتماعی ہو تا یا شخصی قسم کا۔ صحابہ کرام آپ کو مشورہ کے لیے بے چین پاتے تھے۔ واقعہ انکب جو آپ ﷺ کی عائلی زندگی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں بھی آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور رائے طلب فرمائی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شوری کے مستقل اور ممتاز اراکین تھے جنگ بدر کے قیدیوں سے متعلق مجلس مشاورت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا: لَوْ اجْتَمَعَا مَا عَصَيْتُكُمَا (دُرُ منثور ج ۳ ص ۲۰۲)

اگر دونوں کا مشورہ ایک ہو جائے تو میں اس کا خلاف نہ کروں گا۔

مشورہ آپ کا معمول بن چکا تھا اور اس میں آزادی رائے کا پورا حق دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں کوئی بہتر بات آجاتی تو وہ از خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر نے جنگ بدر میں پڑاؤ کے انتخاب کے لیے از خود مشورہ دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ جنگ احزاب کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان سے صلح کے متعلق صرف انصار کے دور رساء حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ جنگ خندق کے متعلق مشورہ کی مجلس قائم ہوئی تو خندق کی کھدائی کا مشورہ صرف ایک صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا جسے قبول کیا گیا۔ آپ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کہ مشورہ دینے والا بلا جھجک پوری آزادی سے اپنی رائے دے سکے۔ جنگ بدر کے آغاز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلس مشاورت بلا کر فرمایا تھا: اَشِيرُوا عَلَيَّ أَيُّهَا النَّاسُ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱) اے لوگو! مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو۔

مشورہ اور آزادی رائے:

درج ذیل واقعہ سے معلوم ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رائے کے اظہار میں آزادی حق کو کیسے استعمال کرتے تھے:

غزوہ احزاب میں اتحادیوں کا محاصرہ طویل ہو گیا۔ مسلمانوں کا خوارک کی قلت کی وجہ سے برا حال تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ غطفان کو مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی دینے کے وعدہ پر ان کا اتحاد توڑ دیا جائے تو اتحادیوں کا یہ محاصرہ جلد ختم ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے دوسرے داروں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کیا کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو مجال انکار نہیں لیکن اگر مشورہ کی غرض سے ہے تو عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی ہمے کوئی شخص خراج مانگنے کی جرأت نہ کرے گا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ انصار کا یہ استقلال دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ (طبری ج ۱ غزوہ خندق)

حکم کے بعد مشورہ ہے نہ اجتہاد:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مشورہ کے بعد امیر کو اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس میں آراء کی کثرت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔ پھر جب امیر کسی کام میں مشورہ کے بعد یا بعض امور میں بغیر مشورہ محض اپنی صوابدید کے مطابق کوئی حکم نافذ کر دے۔ تو اس کے بعد عوام کو دوبارہ مشورہ یا خود اجتہاد کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔

جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ نے درہ پر ۵۰ تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی اس درہ کو نہ چھوڑیں۔ فتح کے آثار دیکھ کر کچھ لوگ مال غنیمت سمیٹنے کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کا اجتہاد یہ تھا کہ مقصود جنگ تو فتح تھا۔ وہ حاصل ہو گئی تو اب یہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟ ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ایک واضح حکم کے بعد اجتہاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس اجتہادی غلطی نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔

صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ قربانی کے جانور ذبح کر دیئے جائیں اور یہ حکم آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی خفی کی صورت میں ملا تھا۔ صحابہ اس حکم کی تعمیل میں متردد اور وحی کے انتظار میں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جوش میں آ کر کچھ غیر محتاط باتیں بھی کیں۔ جن کا مدت العمر انہیں افسوس رہا تو بہداشتغفار کرتے رہے۔

جنگ احد میں آپ ﷺ نے مشورہ کے بعد کھلے میدان میں لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں کچھ بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس فیصلہ میں تبدیلی کی درخواست کی مگر آپ ﷺ نے ان کی اس دوبارہ تجویز کو قبول نہیں فرمایا۔

(۵) حربی فراست

دوران جنگ ایک عظیم جرنیل کی نظر بعض اوقات ایسے دور رس نتائج پر جا پہنچتی ہے جو عام لوگوں کی نظروں میں واضح طور پر خطرناک ہوتے ہیں۔ اور انہیں اس میں واضح طور پر اپنی شکست کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسی دور رس فراست کی مثالیں بھی ہمیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے سوا اور کہیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ البتہ ایسی مثالیں ضرور مل جاتی ہیں کہ کسی جرنیل نے بڑی سوچ بچار کے بعد کوئی اقدام کیا تو اس کے نتائج اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلے۔ نیولین بونا پارٹ کی

تجارتی ناکہ بندی (BLOCKAGE) کی سکیم جو بالآخر اس کو لے ڈوبی اس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ یا جنگ وائرلو میں اس کی شکست کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اپنے دو حریف جرنیلوں کو الگ الگ شکست دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے پریشیا کے جرنیل بلوشر کو اس نے شکست دی۔ اور اپنے جرنیل گردجی کو اس کے تعاقب میں بھیجا۔ اور خود اتحادیوں کے جرنیل ونگٹن کی طرف پیش قدمی کی اس کے جرنیل گردجی نے تعاقب میں تساہل سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوشر کی فوجیں بھی ونگٹن سے آکر مل گئیں۔ اور دونوں نے مل کر پنولین کو شکست فاش دی۔ اس کی فوجی تدبیر کی ناکامی اس کی شکست کا سبب بن گئی۔ دوران جنگ ایسے ”اتفاقی حوادث“ کا پیش آجانا معمولی بات ہوتی ہے۔ ایک کامیاب جرنیل کے لیے یہ بات ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتی ہے کہ اگر ایسی صورت حال پیش آجائے تو اس کا چارہ کار کیا ہو؟

اب آپ ﷺ کی حربی فراست کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) محاصرہ طائف:

غزوہ حنین کے بعد طائف کا جنگ جو قبیلہ بنو شقیف مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ مضبوط قلعہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اسی غزوہ میں آپ ﷺ نے دباہ اور مخنیق بھی استعمال کی۔ تاکہ قلعہ کو کسی مقام سے شکستہ کیا جاسکے۔ لیکن اس میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ دشمن کے اوپر سے آنے والے تیروں سے گاہے گاہے کوئی مسلمان شہید ہو جاتا۔ ان شہداء کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی تھی۔

طائف کا محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر آپ ﷺ نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ جنہیں خوارک وغیرہ کی بھی کمی تھی۔ ان حالات میں محاصرہ اٹھالینا دوسرے لفظوں میں اپنی شکست کا کھلا اعتراف تھا۔ جو مسلمانوں پر گرا نبار تھا۔ لیکن حکم کی تعمیل میں محاصرہ اٹھالیا گیا۔ کوئی اور جرنیل ہوتا تو اپنے جھوٹے وقار کو بحال رکھنے کے لیے تمام افواج کٹوا دیتا مگر محاصرہ نہ اٹھاتا۔ مگر آپ کی نگاہ دور رس نے ان حالات کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ لوگ ذہنی طور پر آپ ﷺ کے مطیع و منقاد ہو چکے تھے۔ صرف کسی بہانہ کی ضرورت تھی۔ آپ ﷺ نے غنودرگزر سے کام لیتے ہوئے محاصرہ اٹھالیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہ سب مسلمان ہو گئے۔

(۲) بیثاق مدینہ:

بیثاق مدینہ اور اس کی تمام دفعات کا ذکر ہم پہلے تفصیل سے کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ ﷺ نے جنگی لحاظ سے اس معاہدہ سے کیا کچھ فائدہ حاصل کیے اور وہ یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے:-

- (۱) مدینہ کو ایک سیاسی وحدت قرار دیا۔ اور بیرونی حملوں کی صورت میں دفاع کی ذمہ داری تمام آبادی پر ایک جیسی ڈال دی مگر سیاسی برتری اپنی تسلیم کروالی۔
- (۲) بیرونی دشمنوں سے معاہدہ و فاداری پر پابندی عائد کر دی گئی۔
- (۳) جنگی مصارف کا بار بھی حصہ رسدی طے ہوا۔

گویا بیثاق مدینہ آپ ﷺ کی حربی فراست کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہے۔ مدینہ اور اس کے مضافات کو اپنے حق میں ایسی بہتر شرائط پر منفق کر لینا آپ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی اہمیت کو مسلم مورخین سے زیادہ مشرقین نے محسوس کیا۔ پروفیسر نکلسن لکھتا ہے:-

”یہ ظاہر میں ایک محتاط اور دانشمندانہ اصلاح ہے۔ حقیقت میں یہ ایک انقلاب تھا۔ محمد ﷺ نے قبائل کی آزادی پر کھلم کھلا تو ضرب زد گائی لیکن اسے ختم کر ڈالا۔ ہر چند کہ اس وحدت میں یہودی۔ مشرکین اور مسلمان سبھی شریک تھے لیکن آپ بخوبی اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ اس نوزائیدہ ریاست میں فعال اور بااثر حصہ دار مسلمان ہی ہیں۔ اس حقیقت کو آپ ﷺ کے مخالفین پہلے نہ دیکھ سکے۔“

بیثاق مدینہ کو بلاشبہ اسلام کی آئینی تاریخ میں میکانا کارٹا کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں یہ ضمیر کی آزادی کا پہلا چارٹر تھا اس میں محض وہاں اس دور کے لیے نہیں بلکہ آئندہ زمانہ کے لیے بھی بہترین رہنما اصول موجود ہیں۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے۔ تو بعد کے تمام دساتیر اس کا چرہ معلوم ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ کے سیاسی تدبیر اور دور اندیشی کی ایک مثال نبوت کے پہلے کے دور میں ملتی ہے۔ جس کے ذریعے آپ ﷺ نے سرداران قریش کو ایک ہونے والی خونریز لڑائی سے بچالیا تھا۔ یہ مشہور واقعہ حجر اسود کی تنصیب ہے۔

(۳) صلح حدیبیہ:

صلح حدیبیہ کن حالات میں ہوئی اور کن شرائط پر ہوئی۔ اس کی تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ اس صلح نامہ کی درج ذیل شرائط کو ہم زیر بحث لائیں گے۔

(۱) اس سال مسلمان واپس چلے جائیں۔ اگلے سال عمرہ کی غرض سے آئیں۔ صرف تلوار نیام میں ساتھ لاسکتے ہیں۔ اور تین دن مکہ میں رہ کر واپس چلے جائیں۔

(۲) جو مسلمان مکہ میں ہیں اگر وہ اپنے والی کی اجازت کے بغیر مدینہ میں جا کر پناہ لینا چاہیں تو مسلمان انہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ اور جو مسلمان مکہ میں آکر رہنا چاہیں تو قریش انہیں واپس نہیں کریں گے۔

(۳) قبائل عرب جس فریق کے ساتھ چاہیں مخالفہ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یعنی مسلمان یا کفار مکہ جس فریق کے حلیف بنا چاہیں انہیں پوری آزادی ہوگی۔

(۴) یہ صلح دس سال کے لیے برقرار رہے گی۔

بظاہر یہ شرائط مسلمانوں کے لیے بڑی توہین آمیز تھیں۔ خصوصاً جبکہ بیعت رضوان بھی ہو چکی تھی اور مسلمان مرنے مارنے پر تلے بیٹھے تھے پھر اس دوران ایک اور واقعہ پیش آ گیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ قریش کے اسی سفیر سہیل بن عمرو کے لڑکے ابو جندل مسلمان ہو چکے تھے اور قریش مکہ کی قید میں تھے جن پر ہر طرح کی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ وہ بیڑیوں میں جکڑے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر مسلمانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے زخم دکھلا دکھلا کر رحم اور پناہ دینے کی اپیل کر رہے تھے۔ کہ انہیں قریش مکہ کی قید سے چھڑا کر اپنی حفاظت میں لے لیا جائے۔ صلح کی شرائط طے ہو چکی تھیں۔ مگر تحریر اور دستخط کرنا باقی تھے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ از روئے معاہدہ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو پناہ میں نہیں لے سکتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد کی پاسداری کرتے ہوئے ابو جندل کو صبر کی تلقین کی۔ اور قریش کو واپس دے دیا۔ جبکہ دوسرے مسلمانوں کا جی اس قدر بھرا آیا تھا کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ کو کسی قیمت پر واپس دینے کو تیار نہ تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے معاہدہ واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ قربانی کے جانور ذبح کر دیئے جائیں۔ لیکن مسلمان متردد تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ شاید ابھی

کوئی وحی نازل ہو جس سے مسلمانوں کا یہ ذہنی کرب دور ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر سیاستدان بھی ان شرائط کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ بیقراری کی حالت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ لیکن ابو بکر رضی اللہ عنہ تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ایسی ہی تلقین کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے۔ ”کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے پیغمبر نہیں؟ کیا ہم حق پر نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتوں کا جواب اثبات میں دیا تو کہنے لگے تو پھر ہم یہ توہین آمیز شرائط کیوں قبول کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی صبر کی تلقین کی۔ اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لہجہ بھی قدرے تلخ تھا۔ جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری زندگی افسوس رہا اور تو بہ استغفار فرماتے رہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مسلمان کہنے کے باوجود قربانی پر آمادہ نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کا جانور ذبح کیا۔ جس کی دیکھا دیکھی سب مسلمانوں نے اپنے اپنے جانور ذبح کیے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ وحی نازل ہوئی۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تمہیں فتح میں عطا فرمائی۔) (11/۴۸)

گویا وحی الہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت سے پوری طرح ہم نوا تھی۔ اور وہ شرائط جنہیں مسلمان توہین آمیز سمجھ رہے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح میں قرار دیا۔ اب ہم دیکھیں گے تو یہ توہین آمیز شرائط کیسے فتح میں ثابت ہوئیں اور نیز یہ بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اتنی دور رس تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر سیاست دان کی نگاہ اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکی تھی۔

صلح کیوں کی گئی؟

اس واقعہ میں سب سے نمایاں چیز جو ہمیں نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قیمت پر جنگ کرنے سے گریز کرتے رہے اور صلح پر مصر رہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہ غلط تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی طور پر لڑائی کا خیال چھوڑ دیا اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:-

(۱) اگر اس وقت صلح نہ کی جاتی اور جنگ چھڑ جاتی تو وہ مرد اور عورتیں جو مکہ میں مسلمان ہو

چکے تھے اور جنہیں مسلمان جانتے بھی نہیں تھے۔ سب پیس ڈالے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو سورہ فتح میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

﴿وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَّوُّوهُمْ فَضُصِّكُمْ مِنْهُمْ مَعْرَةً بَغَيْرِ عِلْمٍ﴾
 (اور اگر ”شہر مکہ میں“ کچھ مسلمان مرد اور کچھ مسلمان عورتیں نہ ہوتیں کہ تم ان سے ناواقف تھے (اور لڑائی کی صورت میں) تم ان کو پامال کر ڈالتے اور بے خبری میں تم کو ان کی طرف سے نقصان پہنچ جاتا۔) (۲۵:۲۸)

(۲) جب سے آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے ایک دن بھی امن و چین کا نہیں گزارا تھا ادھر قریش مکہ دشمن تھے اور یہود مارا آستین بنے ہوئے تھے۔ جو دوسرے قبائل کو ساتھ ملا کر ہر وقت جنگ کی فضا قائم رکھتے تھے کیونکہ یہود کے حملے کا خطرہ تھا۔ اندریں صورت حضور اکرم ﷺ دو دشمنوں میں ایک سے ہر قیمت پر صلح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے واپس جا کر سب سے پہلے خیبر فتح کر کے یہودی فتنہ کا استیصال کیا گیا۔

(۳) آپ ﷺ اس لیے بھی قریش سے صلح چاہتے تھے کہ ادھر سے فارغ ہو کر اپنا فریضہ رسالت بیرونی دنیا تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے واپس جا کر ۷ھ میں شہانہ عجم کو تبلیغی خطوط لکھے۔ آپ ﷺ تبلیغ کے نتائج سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ بعد میں سر یہ موتہ اور غزوہ تبوک انہیں تبلیغی خطوط کے نتیجے میں سامنے آئے۔ لہذا آپ ﷺ قریش سے صلح اور یہود کا استیصال کر کے فریضہ رسالت کی سرانجام دہی کے لیے اندرونی طور پر مطمئن ہونا چاہتے تھے۔

(۴) صلح حدیبیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک صلح جو اور اصول پرست قوم ہے۔ انہی باتوں سے متاثر ہو کر صلح حدیبیہ کے بعد بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا۔ ان نو مسلموں میں خالد بن ولید فاتح ایران اور عمرو بن عاص فاتح مصر جیسے جرنیلوں کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

(۵) قریش کا جنگ سے ہٹ کر صلح پر اتر آنا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اب وہ مسلمانوں کو خانماں برباد اور ستم رسیدہ مہاجر نہیں سمجھتے بلکہ اپنا ہم پلہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

انہوں نے مدینہ کی آزاد ریاست کو قبول کر لیا تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ وہاں کا سرکاری

مذہب اسلام ہے۔

(۶) چونکہ یہ صلح مسلمانوں کی امن پسندی کا واضح ثبوت تھا۔ لہذا بہت سے قبائل نے مسلمانوں سے معاہدے کرنے شروع کر دیئے۔

شرائط صلح کے نتائج

اب ہم دیکھیں گے کہ صلح حدیبیہ کی بظاہر ان توہین آمیز شرائط کے نتائج مسلمانوں کے حق میں کتنے مفید ثابت ہوئے؟

شرط نمبر 1 کا نتیجہ:

صلح نامہ کی شرط نمبر 1 کی رو سے مسلمان ۷ھ کو عمرہ کر سکتے تھے۔ اور تین دن مکہ میں قیام کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اگلے سال اعلان کر دیا کہ جو لوگ صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ سب عمرہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ جب حضور ﷺ اس جمعیت کو لے کر مکہ پہنچ گئے۔ تو قریش مکہ اس قدر ذلت برداشت کرنے کی تاب نہ لاسکے۔ کہ مسلمان اس قدر آزادی سے کعبہ کا طواف کریں۔ مگر معاہدہ کی رو سے اس بات کی اجازت دے چکے تھے۔ اس کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیا۔ اور کواہ ابو قعیس پر چڑھ گئے۔ جہاں سے مسلمانوں کی ہر نقل و حرکت بخوبی نظر آتی تھی۔

اب شہر خالی تھا اور ایک طرح مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اگر آپ ﷺ کی بجائے کوئی موقع شناس جرنیل ہوتا تو اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاتا۔ لیکن آپ نے دشمن کا ایک پیہہ کا بھی نقصان نہیں کیا اور امن و امان کو برقرار رکھ کر وعدہ وفا کی ایک اور مثال قائم کر دی۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ کعبہ میں صرف قریش ہی تو نہیں تھے۔ دیگر تمام قبائل عرب بھی عمرہ کرنے آئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعداد کو دیکھ کر اندازہ کر لیا۔ کہ اب کعبہ کا سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آنے ہی والا ہے۔ جس کی یہ تمہید ہے۔ پھر آنے والے واقعات نے ان تاثرات کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

شرط نمبر 2 کے نتائج:

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس کے والد اور قریش کے سفیر سہیل بن عمرو اپنے ساتھ لے

گئے تو انہوں نے وہاں جا کر قید کے نگران کو تبلیغ شروع کر دی جس سے وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر اس نے بھی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور ہوتے ہوتے مکہ میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی۔ لہذا اس شرط سے قریش کو سخت تکلیف پہنچی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ عقبہ بن اسید وہ پہلے مسلمان ہیں جو کفار مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر مدینہ میں پناہ لینے کے لیے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب آپ ﷺ مدینہ میں پہنچے تو قریش نے بھی دو آدمی ان کو واپس لانے کے لیے مدینہ بھیج دیے۔ آپ ﷺ نے عقبہ بن اسید کو ابو جندل رضی اللہ عنہ کی طرح واپس کر دیا۔ صبر کی تلقین کی اور یوں تسلی دی کہ ”اللہ کوئی بہتر تدبیر پیدا کر دے گا۔“

یہ لوگ جب عقبہ بن اسید رضی اللہ عنہ کو حراست میں لے کر واپس ہوئے تو راستہ میں ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت عقبہ بن اسید رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا فرار ہو کر واپس مدینہ پہنچا تا کہ حضور ﷺ سے فریاد کرے۔ لیکن ساتھ ہی عقبہ بن اسید خود بھی حاضر ہو گئے۔ اور حضور ﷺ سے عرض کی ”آپ ﷺ نے حسب معاہدہ مجھے واپس کر دیا۔ اب آپ ﷺ ذمہ دار نہیں۔“ یہ کہہ کر بحیرہ قلزم کے کنارے مقام عیص پر پہنچ کر اقامت اختیار کر لی۔ اور قریش کے تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کر دی۔ اب دوسرے مظلوم مسلمان بھی مدینہ کی بجائے اس طرف کا رخ کرنے لگے رفتہ رفتہ یہاں ایک ایسی آبادی قائم ہو گئی۔ جو قریش اور ان کے قافلوں کے لیے وبال جان بن گئی۔ ان دونوں باتوں سے تنگ آ کر قریش مکہ نے خود اس شرط کو منسوخ قرار دینے کی درخواست کر دی۔ اور کہا کہ آئندہ جو مسلمان مدینہ جا کر رہنا چاہیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا جسے آپ ﷺ نے منظور فرمایا۔ چنانچہ عیص کی نو آبادی کے سب مسلمان مدینہ چلے گئے اور اس طرح قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ بدستور کھل گیا۔

(شرح مسلم - کتاب الجہاد - باب صلح حدیبیہ)

اور اس شرط کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ مسلمان آزادانہ مکہ میں آنے جانے لگے۔ میل جول بڑھا۔ تو کفار کو مسلمانوں کے کردار اور اسلام کے سمجھنے کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ابتدائے ہجرت سے صلح حدیبیہ تک مسلمانوں کی تعداد تین چار ہزار سے بڑھنے نہ پائی تھی۔ لیکن اس کے صرف دو سال بعد فتح مکہ

کے وقت مسلمان فوجیوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور یہ صرف وہ تعداد تھی جو آپ ﷺ کے ہمراہ مکہ آئے تھے جبکہ تمام مسلمانوں کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی۔

شرط نمبر 3 کے نتائج:

اس شرط کی رو سے عرب قبائل اس بات میں آزاد تھے کہ وہ فریقین میں سے کسی کے حلیف بن جائیں۔ اس شرط کی رو سے قبیلہ بنو خزاعہ تو مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور قبیلہ بنو بکر قریش کے۔ ان دونوں قبائل کی دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے قریباً ڈیڑھ سال بعد بنو بکر نے قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ تو قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے علانیہ ان کی مدد کی اور بہت سے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا انہوں نے حرم میں پناہ لی لیکن قریش نے اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ بنو خزاعہ کے چالیس شترسوار مدینہ میں فریاد لے کر پہنچے۔ تو آپ کو اس بد عہدی کا سخت صدمہ ہوا۔ آپ ﷺ اگر چاہتے تو اس عہد شکنی پر جنگ کا فوری اعلان کر سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کی امن پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا۔ لہذا آپ ﷺ نے قریش کو تین شرطیں پیش کیں۔

(۱) خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قاصد نے جب یہ شرائط پیش کیں تو نوجوان طبقہ بھڑک اٹھا۔ انہیں میں سے ایک شخص فرط بن عمر نے قریش کی طرف سے اعلان کیا کہ ”صرف آخری شرط منظور ہے۔“

قاصد واپس چلا آیا تو قریش کے سنجیدہ طبقہ نے اس اعلان کے نتائج و عواقب پر غور کیا۔ تو جلد ہی ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ چنانچہ ابوسفیان کو مدینہ بھیجا گیا کہا معاہدہ کی تجدید کر آئیں۔ ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ کے سامنے گزارش پیش کی تو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے حضرت ابو بکر ﷺ حضرت عمر ﷺ کو مالشی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں نے معذرت کر دی۔ اب ابوسفیان... نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سفارشی بنانا چاہا اور حضرت حسن کا واسطہ دے کر تجدید عہد کے لیے کہا۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔

”بچوں کو ایسے معاملات میں کیا دخل؟“ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو خود ہی مسجد نبوی میں جا کر ایک طرف اعلان کر دیا کہ ”میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ (طبری۔ ج ۱۔ باب فتح مکہ) ظاہر ہے کہ ابوسفیان... کی ایسی بے بسی اس بات کی واضح دلیل تھی کہ کفر و ہنہی اور اخلاقی ہردو پہلوؤں سے اسلام کے مقابلہ میں شکست کھا چکا ہے۔ اب صرف جسمانی فتح باقی ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

یہ تھے صلح حدیبیہ اور اس کی توہین آمیز شرائط کے نتائج جسے اللہ تعالیٰ نے ”شاندار فتح“ سے تعبیر فرمایا۔

(۶) حصول مقصد کے لئے کم از کم جانی و مالی نقصان

ایک عظیم جرنیل کی پالیسی یہ ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے، کہ فتح کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور جانی یا مالی نقصان بھی کم سے کم ہونے پائے۔ خواہ یہ نقصان اپنی فوج اور علاقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دشمن کے مقتولین اور علاقہ سے۔ اگو کوئی جرنیل کشتوں کے پتے لگا کر کوئی ملک فتح کر بھی لیتا ہے تو ایسی فتح فوج کی بہادری کا کارنامہ تو قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن سپہ سالار کی دانشمندی اور حکمت عملی کو اس سے کم ہی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل مقصد علاقہ کو فتح کرنا ہوتا ہے۔ نہ کہ انسانی خون بہانا۔ لہذا اگر ایسے نقصان کے بغیر کم از کم نقصان برداشت کر کے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو سپہ سالار کی عظمت کی دلیل ہوتی ہے۔

اس پہلو سے اگر ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ دنیا بھر کے جرنیلوں سے ممتاز نظر آتے ہیں:-

آپ ﷺ نے شب خون مارنے، غیر مقاتل (یعنی بچے، بوڑھے، عورتیں، معذور افراد و ریش اور صوفی قسم کے لوگ) سے لڑنے یا ان کو قتل کرنے سے منع فرمادیا۔ فتح کے بعد قتل عام کو گناہ عظیم قرار دیا۔ اسی طرح فتح کے بعد کھیتوں کو جلانے اور غیر مقتول افراد کے محفوظ اموال لوٹنے سے منع فرمادیا۔ فتح کے بعد قتل کو گناہ عظیم قرار دیا۔ اسی طرح فتح کے بعد کھیتوں کو جلانے اور غیر مقاتل افراد کے محفوظ اموال لوٹنے سے بھی منع فرمادیا۔ گویا صرف ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت ہے جو میدان جنگ میں مرنے مارنے کا ارادہ کر کے نکل آئے ہوں۔ اس طرح آپ

ﷺ نے حکماً قتل و غارت اور مالی نقصان کا دائرہ انتہائی محدود کر دیا۔ اور ایسی پابندیاں عائد کر دیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ اور کسی جنگ میں نہیں پائی جاتیں۔ نہ ہی کوئی جرنیل ان باتوں کا کبھی لحاظ رکھتا ہے۔ بڑے بڑے جرنیلوں کے حالات دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے معرکہ کارزار میں اتنے لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اتارے۔ فتح کے بعد اتنے دن قتل و غارت کا بازار گرم رکھا شہر کو آگ لگا دی گئی۔ مسجدوں کو اضمحلیل بنا لیا گیا۔ مفتوح علاقہ کی عورتوں کی بے آبروئی کے لیے سپاہیوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن آپ ﷺ نے تمام ایسی حرکات کو ممنوع قرار دیا جو اتنی بات سے بھی آپ ﷺ کی حکمت عملی کی امتیازی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے زندگی بھر جو جنگیں لڑیں۔ ان میں فریقین کا کس قدر جانی نقصان ہوا اور اس نقصان کے عوض کتنا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آیا۔ ذیل میں ان تمام غزوات و سرایا کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ جن میں فریقین میں سے کسی کا بھی کوئی آدمی کام آیا:-

غزوات سرایا	لشکر اسلام اور قائد	لشکر دشمن اور قائد	شہداء	مقتولین	کیفیت
(۱) غزوہ بدر رمضان ۱ھ	۳۱۳ خود نبی اکرمؐ	۱۱۰۰۰ ابو جہل	۲۲	۷۰	
(۲) غزوہ موئق ذی الحجہ ۱ھ	۲۰۰ خود نبی اکرمؐ	۱۲۰۰ ہونسیان	۲	X	مقابلہ نہیں ہوا۔
(۳) غزوہ بنو سلیم محرم ۲ھ	۲۰۰ خود نبی اکرمؐ	قبیلہ غطفان و بنو سلیم	۲	؟	ہونسیان ۲ مسلمان شہید کر کے چلا گیا
(۴) سر یہ محمد بن مسلمہ ربیع الاول ۳ھ	۵ محمد بن مسلمہ	کعب بن اشرف	X	۱	
(۵) غزوہ احد شوال ۳ھ	۶۵۰ خود نبی اکرمؐ	۱۳۰۰۰ ہونسیان	۷۰	۳۰	
(۶) سر یہ عبد اللہ بن ابی اسحاق محرم ۳ھ	عبد اللہ بن ابی اسحاق	سقیان ہڈی	X	۱	
(۷) سر یہ ربیع صفر ۳ھ	۱۰-عاصم بن ثابت	۱۰۰ قبیلہ غطفان و قارہ	۱۰	X	

ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف

	x	۶۹	ایک بڑی جماعت مل وڈ کوان کے قبائل	۷۰ قاری ممتاز عالم	(۸) سریہ محمود صفر
	۲	x	بنو کلاب	عمر بن امیہ	(۹) سریہ عمرو بن امیہ الضمری ربیع الاول ۵۳
	۱۰	x	بنو مصطلق - حارث بن ضرار	خود نبی اکرم	(۱۰) غزوہ بنو مصطلق شعبان ۵۵
	۱۰	x	دس ہزار ایوسقیان	۳۰۰۰ خود نبی اکرم	(۱۱) غزوہ احزاب ذیقعدہ ۵۵
	۱	x	ابورافع سلام بن ابوالمہدیق	۳ عبد اللہ بن عتیک	(۱۲) سریہ عبد اللہ بن عتیک ۵۵
	۳۰۰	۳	بنو قریظہ	خود نبی اکرم ﷺ	(۱۳) غزوہ بنو قریظہ ذی الحجہ ۵۵
	۱	۳	بنو غطفان	سعد بن اکوع	(۱۴) غزوہ ذی قرد ربیع الثانی ۵۶
ذکیعتی کا واقعہ ۹ عالمان دین شہید محمد بن مسلمہ بن نکلے بلور گشت گئے تھے کہ دشمن نے حملہ کر دیا۔	x	۹	۱۰۰ بنو شیبہ	۱۰ محمد بن سلمہ	(۱۵) غزوہ ذی القعدہ ربیع الثانی ۵۶
	x	۹	ساکنان وادی القرنی	۱۲ - زید بن سارہ	(۱۶) سریہ وادی القرنی رجب ۵۶
یڑائی غلامی کی بنا پر ہوئی تھی ۳۰ یہودی	۵۲۶	x	۳۰ امیر بن رزام	۳۰ عبد اللہ بن رواح	(۱۷) سریہ عبد اللہ بن رواحہ شوال ۵۶

یہ علاج کرانے آئے تھے پھر ذہنی کی۔	۸	x	قبیلہ عکلم و عربیہ کنانہ بن ابوالقیس	۲۰ سوار کرز بن جابر البصری	(۱۸) غزوہ عین شوال ۵۶
	۹۳	۱۸	۱۰۰۰۰۰ یہود شہیر	۱۳۰۰۰ حضور خود	(۱۹) غزوہ خیبر محرم ۷ ۵۷
	۱۱	۱	دادی القرئی	۱۳۸۲ حضور خود	(۲۰) غزوہ دادی القرئی ۷ ۵۸
	۲	x	۵۰۲ ہذیل بن عوف جزری	۵۰۰۰ زید بن حارثہ	(۲۱) سریہ حسی بنادی ۲ ۵۷
	x	۴۹	یوسلیم	۱۰۵۰ ابن ابی العویاء	(۲۲) سریہ ابن ابی العویاء ذی الحجہ ۷ ۵۸
	x	۱۳	ہو قضاہ	۱۵ کعب بن عمیر انصاری	(۲۳) سریہ ذات الطح ربيع الاول ۸ ۵۸
نامعلوم		۱۲	ایک لاکھ شریحیل غسانی	۳۰۰۰ زید بن حارثہ	(۲۴) سریہ موتہ بنادی الاولیٰ ۸ ۵۸
	۱۲	۲	قریش مکہ	۱۲ ہزار۔ حضور خود	(۲۵) غزوہ مکہ رمضان ۸ ۵۸
مقتولین کا خون بہا ادا کیا گیا۔	۹۵		ہو خزیمہ	۳۵۰۔ خالد بن ولید	(۲۶) سریہ خالد بن ولید شول ۸ ۵۸
محاصرہ روک لیا گیا۔ سب مسلمان ہو گئے۔	۷۱	۶	بنو ہوازن۔ بنو ثقیف وغیرہ	۱۲ ہزار۔ حضور خود	(۲۷) غزوہ حنین ۸ ۵۸
	x	۱۲	بنو ثقیف	۱۲۰۰۰۔ حضور اکرم ﷺ	(۲۸) غزوہ طائف ۵۸
	۸۴۲	۳۲۳			

یہ نقشہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق رحمۃ اللعالمین جلد دوم سے پیش کیا گیا ہے۔ گو آپ نے کل غزوات و سرایا کی تعداد ۸۴۲ گنوائی ہے۔ لیکن ہم نے صرف ان غزوات و سرایا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں فریقین میں سے کسی کا کوئی آدمی مارا گیا ہو۔ ان میں سے اکثر سرایا

ایک عظیم جرنیل کے ذاتی اوصاف

ایسے ہیں کہ بعض قبائل نے تبلیغ کے لیے آنحضرت ﷺ سے معلمین کا مطالبہ کیا تو کفار نے راستہ میں دھوکہ سے انہیں شہید کر ڈالا۔ کچھ ایسے ہیں جو گشتی دستوں کی صورت میں نکلے اور دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔ بعض ڈکیتی کے کیس تھے۔ بعض ایسے سرایا ہیں جنہیں مقبروں کو مسمار کر کے زمین کے برابر کرنے یا بتوں کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اگر صرف ان جنگوں کا ذکر کیا جائے جن میں باقاعدہ فریقین میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو ان مقتولین کی تعداد صرف درج ذیل رہ جاتی ہے۔

دشمن	مسلمان	
۷۰	۲۲	(۱) غزوہ بدر
۳۰	۷۰	(۲) غزوہ احد
۱۰	۶	(۳) غزوہ احزاب
۳۰۰	۴	(۴) غزوہ بنو قریظہ
۹۳	۱۸	(۵) غزوہ خیبر
نامعلوم	۱۲	(۶) سریہ موتہ
۱۲	۲	(۷) غزوہ مکہ
۷۱	۶	(۸) غزوہ حنین
X	۱۲	(۹) غزوہ طائف
۶۸۶	۱۵۲	کل تعداد

گویا حضور اکرم ﷺ کے زندگی بھر کے معرکوں میں مقتولین کی اصل تعداد ایک ہزار تک نہیں پہنچی۔ ان جنگوں میں آٹھ سال کا عرصہ لگا اور دس لاکھ مربع میل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ وسعت ۲۷۳ مربع میل فی دن نکلتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس مدت کو ۸ سال کے بجائے تقریباً دس سال شمار کرتے ہیں۔

فتح مکہ کی سرگزشت

پھر اگر دور نبوی کے معرکوں سے بھی انتخاب کیا جائے تو فتح مکہ جیسی ’پُر امن جنگ‘ کی

مثال کہیں دنیا میں نہیں مل سکے گی۔ آپ نے حجاز کے مرکزی شہر مکہ کو فتح کیا تو صرف ۲ مسلمان شہید ہوئے۔ اور ۱۲ مشرکین مکہ۔ آپ ﷺ کو حرم میں اتنی خوزریزی بھی گوارا نہ تھی۔ تاہم مکہ کی زیریں جانب سے آنے والے دستہ جس کی کمان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی..... سے کچھ مشرکین الجھ گئے۔ چھڑپ ہوئی تو اتنے آدمی خلاف توقع یہ تیغ ہو گئے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس شاندار فتح کے حصول کے لیے آپ ﷺ نے کیا تدابیر اختیار فرمائی تھیں؟ اور وہ درج ذیل ہیں:-

- (۱) آپ ﷺ نے مکہ کی طرف اقدام کا مسئلہ انتہائی رازداری سے سرانجام دیا۔ آپ ﷺ نے حلیف قبائل کو جو پیغامات بھیجے۔ ان میں بھی پوری طرح یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی تھی۔
- (۲) آپ ﷺ نے فتح مکہ سے ایک دن پیشتر رات کو مضافات مکہ مراً الظہر ان پر پراؤ ڈالا تو لشکر اسلامی کو میلوں میں پھیلا دیا۔ اور انہیں حکم دیا کہ ہر خیمہ میں آگ کے الاؤ روشن کئے جائیں۔ دشمن اس واقعہ سے نفسیاتی طور پر اتنا مرعوب ہوا کہ مقابلے کی تاب ہی ختم ہو گئی۔

- (۳) ابوسفیان سپہ سالار دو آدمیوں کو ساتھ لے کر حالات کا جائزہ لینے نکلا۔ لیکن گرفتار ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھایا تاکہ جلد از جلد دربار نبوی سے امان کا پروانہ حاصل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی جلد از جلد دربار نبوی میں پہنچے تاکہ امان لینے سے پیشتر قتل کر دیا جائے۔ حضرت عباس پہلے پہنچ گئے۔ تو آپ ﷺ نے ابوسفیان کو دیکھ کر فرمایا:-

”ابوسفیان ابھی وقت نہیں آیا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں؟“

ابوسفیان نے جواب دیا۔ ”ہاں میں سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو ضرور میری مدد کرتا۔“

پھر آپ ﷺ نے پوچھا۔ ”کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟“

ابوسفیان نے جواب دیا۔ ”البتہ اس میں ابھی مجھے کچھ تردد ہے۔“

حضور ﷺ اگر چاہتے تو اس سوال کے جواب سے پیشتر ہی اس ازلی دشمن اسلام اور جاسوس کو قتل کا حکم دے سکتے تھے۔ اور تاریخ عالم میں یہ واحد مثال ہے کہ اتنے بڑے دشمن کو کمال فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے معاف کر دیا گیا ہو۔ لیکن آپ ﷺ کو اس کے قتل سے اس کا اسلام لانا زیادہ عزیز تھا۔ پھر وہ بھی کسی جبر واکراہ یا دباؤ سے نہیں بلکہ ضمیر کے اطمینان کے ساتھ۔ ابوسفیان کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا ابھی اسے اپنے خیمے میں اپنے پاس لے جائیں۔ حضور ﷺ کے اس کردار نے ابوسفیان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

(۳) دوسرے دن آپ ﷺ نے ابوسفیان کو پہاڑی کے ایک بلند مقام پر کھڑا کیا۔ اور اسلامی لشکر کو..... جو قبائل کے لحاظ سے مختلف فوجی دستوں میں بنا ہوا تھا۔ حکم دیا کہ ابوسفیان کے سامنے سے پوری شان و شوکت سے گزرتے جائیں۔ یہ فوجی دستے اپنے الگ الگ علم سنبھالے ابوسفیان کے سامنے سے پہروں گزرتے رہے۔ اس نظارہ نے صرف ابوسفیان کو نہیں بلکہ تمام دیکھنے والوں کے دلوں میں اسلام کی دھاک بٹھا دی۔ مخالف فریق کے کسی فرد کو نہ یہ فرصت ملی، نہ تاب ہی باقی رہی کہ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو۔ اس طرح یہ مرکزی شہر بلا مقابلہ ہی فتح ہو گیا۔

(بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب ابن رکن النبی الرایۃ یوم الفتح)

(۵) آپ ﷺ فاتحانہ حیثیت سے سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ عثمان بن طلحہ کلید بردار سے چابی منگوائی۔ کعبہ کو اس کے اندر پڑے ۳۶۰ بتوں کی آلائش سے پاک کیا۔ آپ ﷺ اپنی چھڑی سے بتوں کو گراتے اور توڑتے جاتے اور ساتھ یہ قرآنی آیت پڑھتے جاتے تھے:-

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (۸۱:۱۷) (باطل بھاگ کھڑا ہونے والا ہے۔)

(۶) فتح مکہ کے بعد بھی آپ ﷺ نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ کعبہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی حقانیت پر خطبہ ارشاد فرمایا اور اہالیان مکہ سے پوچھا۔ ”بتاؤ آج تم مجھ سے کیسے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟“۔ وہ بھیڑیے جو آج تک پیغمبر اسلام کے خون کے پیاسے رہے اور جن کی مظالم کی داستائیں سن کر کلیجہ مندہ کو آتا ہے اگر ان میں کچھ بھی

انصاف اور جرأت ہوتی تو کبھی رحم کی اپیل نہ کرتے۔ انہیں اپنے مظالم خوب یاد تھے۔ مگر جب جان پر بن گئی تو کہنے لگے:-

خَيْرًا آخِ كَرِيمٍ وَابْنِ آخِ كَرِيمٍ - ہمیں بھلائی کی توقع ہے آپ ﷺ شریف بھائی اور شریف برادر زادہ ہیں۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں بھی حضرت یوسفؑ کی طرح تم سے وہی کچھ کہوں گا، جو انہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ یعنی

((لَا تَنْزِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ اِذْ هَبُوا)) (آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد اَنْتُمْ الطَّلَقَاءُ)۔))

(ہو۔)

(طبری ج ۱۔ باب فتح مکہ)

آپ ﷺ معافی کے اس عام اعلان سے پہلے ہی مندرجہ ذیل فرامین جاری کر چکے

تھے:-

- (۱) جو شخص ہتھیار پھینک دے اسے قتل نہ کیا جائے۔
- (۲) جو خانہ کعبہ کے اندر پہنچ جائے اسے قتل نہ کیا جائے گا۔
- (۳) جو شخص ابوسفیان یا حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے لے اسے بھی قتل نہ کیا جائے۔
- (۴) معذور کا تعاقب نہ کیا جائے۔
- (۵) بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے۔

(مسلم، کتاب الجہاد والسیر۔ باب فتح مکہ)۔

اب دیکھ لیجئے کہ باقی کون رہ جاتا ہے جسے قتل کیا جائے؟ الا یہ کہ کوئی شخص خود ہی اپنی موت کو دعوت دے رہا ہو۔

(۶) مہاجرین مکہ نے حضور اکرم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ انہیں ان کی مملوکہ جائیداد تو واپس دلا دی جائے۔ جس پر بعد میں قریش قابض ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ”جو چیز اللہ کی راہ میں چھوڑ چکے ہو اب اس کا مطالبہ نہ کرو“۔ چنانچہ مہاجرین نے آپ ﷺ کے اس ارشاد کے سامنے برضا و رغبت سر تسلیم خم کر دیا۔

(سیرت النبی ج ۱ ص ۵۳۵)

یہ تھی سر زمین حجاز کی وہ مرکزی جنگ جس میں قتل ہوا نہ قتل عام، نہ قیدی بنائے گئے

اور نہ مالِ غنیمت تقسیم ہوا۔ بلکہ مہاجرین اپنی مملو کہ جائیداد سے بھی دستبردار ہو گئے۔ اب اس سپہ سالارِ عظیم کے عظیم کردار کا نتیجہ قرآن کی زبان سے سنئے!

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ
النَّاسَ يَنْدُخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ
أَفْوَاجًا﴾ (۲۱:۱۱۰) میں داخل ہو رہے ہیں۔

قبائل عرب کی ایک کثیر تعداد معرکہ مکہ کے انجام کی منتظر تھی۔ ان کے خیال کے مطابق مکہ کی فتح ہی اسلام کی حقانیت کی دلیل بن سکتی تھی۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا تو بہت سے قبائل حلقہ گوش اسلام ہو گئے اور سرزمینِ حجاز کا بیشتر علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔

ان حقائق کی وضاحت کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یا یہ کہ مسلمانوں کی جنگیں بھی ملک گیری کی ہوس اور لوٹ مار کی رغبت کی بنا پر ہوئی تھیں؟

جہاد اور دوسری جنگوں کا تقابل

فتح مکہ اور اس کے نتائج کے مطالعہ کے بعد اب ذرا عرب کی قبائلی جنگوں کی طرف نظر دوڑائیے۔ یا اس دور کی مہذب حکومتوں..... ایران و روم کی باہمی جنگوں پر..... انسانوں کے بے دریغ کشت و خون اور وحشت و بربریت کی جو تصویر سامنے آتی ہے۔ اسلام کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسی لڑائیوں سے تقابل لا حاصل ہے۔ ہم تقابل کے لیے صرف دو قسم کی لڑائیاں ملحوظ رکھیں گے۔

- (۱) مقدس لڑائیاں یعنی مذہب کے نام پر لڑی جانے والی جنگیں۔
- (۲) عصر حاضر کی مہذب ترین اقوام کی جنگیں۔ جنہیں بین الاقوامی قانون صلح و جنگ پر ناز ہے۔ اور یہ امن و بقا اور تکریم انسانیت کا دعویٰ لے کر اٹھی ہیں۔

(۱) مذہبی جنگیں

(۱) صلیبی جنگوں کے مقاصد پر ایک عیسائی مصنف کا تبصرہ:

دنیا صلیبی جنگوں کو دینی جنگیں شمار کرتی ہے۔ ان جنگوں کا آغاز عیسائی دنیا کی طرف

سے ہوا جنہوں نے دین عیسیٰ کی حمایت میں تلوار اٹھائی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ قوانین عیسیٰ کی جو بے رحمی ان عیسائیوں نے کی وہ اور کسی جگہ نہ ہوئی تھی۔ ان نام نہاد دینی جنگوں کا مقصد گنہگاروں کے الفاظ میں یہ تھا۔

”انہیں امید تھی کہ ترک امیروں سے ہاتھ آئی ہوئی لوٹ کھسوٹ ہر ایک شریک شہری کو امیر بنا دے گی۔ غیروں کی بیویوں کی خواہش اور یونان کی تمنا صلیب کے ان علمبرداروں کے قلب سے اتنی ہی قریب تھی۔ جتنا کہ ان کی زبانوں سے دور تھی۔“

(رومی سلطنت کا زوال اور تباہی از ایڈورڈ گنہگار)

(۲) فتح کے بعد بے دریغ کشت و خون:

صلیبی جنگوں میں پاپائے روم نے اپنی پوری طاقت سے امراء کے باہمی تنازعات ختم کر کے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر حضرت عیسیٰ کے مدفن کو مسلمانوں سے آزاد کرائیں۔ ان جنگوں کے متعلق یہی عیسائی لکھتا ہے کہ: ”یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صلیبی جنگوں میں شمولیت کا مقصد دین کی نسبت دنیوی فوائد کا حصول زیادہ تھا۔“

۱۰۹۶ء کے موسم گرما میں صلیبی فوج نے ارض مقدس کا رخ کیا۔ ارض مقدس کے چند حکمرانوں کے سوا پوری دنیائے اسلام بے حسی کا شکار تھی۔ جبکہ یورپ کے اکثر ممالک اس صلیبی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ ۱۰۹۸ء کو بیت المقدس بھی صلیبی فوج نے فتح کر لیا۔ فتح کے بعد کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ عورتیں اور بچے بھی بے دریغ قتل کیے گئے۔ گلیوں میں ہر طرف خون بہہ رہا تھا۔ اور جب ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہا تو ان بے رحم سپاہیوں نے اپنے کپڑوں سے گرد اور خون کو جھاڑا اور عیسیٰ کے گرجا میں شکرانہ بجالانے کے لیے دوڑا نو ہو گئے۔“

(صلیبی جنگوں کی کہانی صفحہ ۲۷۳ بحوالہ جہاد ص ۵۵)

یہ وہی بیت المقدس تھا کہ جب اسے مسلمانوں نے فتح کیا تو عیسائیوں کا ایک قطرہ بھی خون نہ بہایا گیا۔ اور باوجود بطریق کے اصرار کے حضرت عمرؓ نے کلیسا میں نماز اس لیے ادا نہ کی کہ بعد میں کہیں کلیسا کو مسجد بنانے کی ریت نہ پڑ جائے۔

ہمیں تفاوت میں از کجا سمت تا کجا

(۳) عہد شکنی اور پاپائے روم کا کردار:

اب عیسائیوں کے ہاں عہد نامہ کے احترام کا حال بھی سن لیجئے۔ مسلمانوں سے عہد شکنی میں اہل یورپ کو اذیت حاصل ہے۔ یورپ کے ایک جرنیل ہولڈی نے ترکوں پر کئی بار حملے کیے اور ہر بار شکست کھائی پھر صلح کا عہد کرتا۔ پھر دوسرے ہی سال مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دیتا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس پوپ کا فتویٰ موجود تھا۔ کہ ”مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد ناموں کو توڑنا جائز ہے“۔ ہولڈی اور اس دور کے دوسرے بادشاہوں کو پاپائے روم عہد ناموں کو توڑنے کے احکام جاری کرتا تھا۔ اوڈیسی آس ODYSSEOUS لکھتا ہے کہ پولینڈ اور ہنگری کے نوجوان بادشاہ کو پوپ کے نمائندے نے عہد نامہ توڑنے پر اکسایا۔

(ترکی یورپ میں ص ۴۵، بحوالہ جہاد از بریگیڈیئر گلزار احمد ص ۲۶۷)

موقع کو دیکھ کر عہد نامہ توڑنے کی داستان تو بڑی پرانی ہے۔ البتہ اسے توڑنے کے لیے مذہب کی طرف سے مقدس اختیارات مل جانا یہ مسیحیت کی مقدس جنگوں کو ہی شرف حاصل ہوتا رہا۔

(۴) امان دینے کے بعد لوٹ مار اور قتل:

اب صلیبی جنگوں میں ”امان“ کے احترام کا قصہ بھی سن لیجئے:

پہلی صلیبی جنگ کے بعد طرابلس کے مسلمان بادشاہ نے کاؤنٹ بوہیمانڈ کو پیغام بھیجا کہ وہ معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ ساتھ ہی دس گھوڑے اور سونا بھی خیر سگالی کے طور پر بھیجا۔ مگر کاؤنٹ نے کہا کہ وہ صرف ایک شرط پر معاہدہ کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ وہ عیسائی ہو جائے۔ (پہلی صلیبی جنگ، ص ۹۷، بحوالہ جہاد) اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب کاؤنٹ امان دے چکنے کے بعد پورے شہر کے زن و مرد کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ بوہیمانڈ نے ترجمان کے ذریعہ مسلمان امیروں کو بتایا کہ اگر وہ صدر دروازے کے اوپر والے محل میں پناہ لے لیں، تو ان کو، ان کی بیویوں اور ان کے بچوں کو پناہ دے دی جائے گی اور ان کا مال واپس کر دیا جائیگا شہر کا ایک کونہ بھی مسلمانوں کی لاشوں سے خالی نہ تھا اور چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تھا بوہیمانڈ نے جن کو امان دی تھی ان کو پکڑا کر ان کا سونا چاندی اور زیورات ان سے لے لیے اور ان میں بعض کو مروادیا اور باقی ماندہ کو غلام بنا کر انطاکیہ بھیج دیا گیا۔ (ایضاً ص ۷۷)

صلیبی جنگوں سے متعلق جو چند واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ان سب میں ایک بات قدر مشترک کے طور پر بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ ہے بے دریغ کشت و خون اور قتل ناحق۔ فتح کے بعد صلح کرنے کے بعد بھی اور امان دینے کے بعد بھی اور یہی بات ہم اس وقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ جہاد میں انسانی خون کی قدر و قیمت کیا تھی اور ان میں کیا نسبت رہی۔

یہ تو تھا عیسائیوں کا مفتوح مسلمانوں سے سلوک۔ اب دیکھئے انہوں نے آپس میں کیا کچھ کیا۔ قاضی سلیمان منصور پوری رحمۃ اللعالمین ج ۲ کے صفحے ۲۱۴ پر رقمطراز ہیں کہ:-

(۱) یورپ کی مقدس مذہبی انجمنوں نے جس قدر نفوس کو ہلاک کیا۔ ان کی تعداد لاکھوں سے زائد ہے۔

(۲) جان ڈیوڈ پورٹ نے اپنی کتاب ”اپالوجی آف محمد اینڈ قرآن“ میں مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاک شدہ نفوس کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی ہے۔ جو عیسائیوں کے ہاتھوں عیسائیوں کی ہوئی تھی۔

(۳) اکیلی سلطنت سپین نے تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا تھا۔ جس میں بتیس ہزار زندہ جلائے گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے پانچ لاکھ یہودیوں کو محض اس بنا پر قتل کر دیا تھا کہ وہ یہودی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

جنگ مہا بھارت:

یہ ہندوؤں کے دو بڑے خاندانوں..... کو رو اور پانڈو..... کے درمیان ہوئی۔ خالص مذہبی جنگ تھی۔ جس میں کرشن مہاراج..... جو ہندوؤں میں اوتار تسلیم کیے جاتے تھے پانڈوؤں کے سرپرست اور طرف دار تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کو بھڑکانے اور اسے طویل تر بنانے میں کرشن جی کے اُپدیشوں کو بہت دخل تھا۔ اس مقدس مذہبی جنگ میں فریقین کے متتولوں کی تعداد کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ (رحمۃ اللعالمین ج ۲ ص ۲۱۴ اور تاریخ پاک و ہند۔ ایم ٹی س ال دین ص ۷) پھر ہندوؤں میں مذہب کے نام پر چندوؤں ہی کو قتل کرنے کا ایک اور محاذ بھی کھلا ہے۔ وہ ہے ان میں ذات پات کی تمیز اور اونچ نیچ کا تفاوت..... اونچی ذات کی ہر وقت شور سے چپقلش اور جنگ جاری رہتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں خبر شائع ہوئی تھی کہ ہندوستان میں ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء اور

سال کے دوران اونچی ذات والے ہندوؤں نے نیچی ذات والے ہندوؤں (ہریجنوں) پر سچی طور پر جو حملے کیے اس میں ۱۸۵۲ء ہریجن قتل ہوئے۔ اور ۱۹۳۱ء کو انہیں قتل کیا گیا۔

(نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۸۱ء)

(ب) عصر حاضر کی مہذب اقوام کی جنگیں

یوں تو ایسی جنگیں بہت ہیں۔ ہم یہاں صرف جنگ عظیم اول اور دوم کا ذکر کریں گے۔ کیونکہ ان جنگوں میں حصہ لینے والے سب کے سب انسانیت کے علمبردار تھے جو آپس میں بے دریغ کشت و خون بہا کر انسانیت اور امن و آشتی کا علم بلند کر رہے تھے۔

پہلی جنگ عظیم میں ابتداء ۶ ممالک نے حصہ لیا، جنگ کے اختتام تک یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۴ تک پہنچ گئی تھی۔ جرمنی اور آسٹریا ایک طرف تھے۔ دوسری طرف حق پرست اتحادی تھے یعنی برطانیہ، اٹلی، فرانس اور روس۔

اتحادی اس جنگ کا یہ مقصد بتاتے تھے کہ چھوٹی سلطنتوں کی آزادی اور حفاظت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے اس چھوٹے سے مقصد کے حصول کے لیے جس قدر قتل و غارت ہوئی اس کا نقشہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اس نقشہ کو پیش کرنے سے مقصد صرف یہی نہیں کہ ہلاک شدہ نفوس کی تعداد کا صحیح پتہ چل جائے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ آئندہ ابواب میں جنگوں کے مقاصد یورپی اقوام کے خفیہ معاہدات اور اندرونی جھگڑے، عربوں سے غداری اور عہد شکنی کے بیشمار واقعات کے حوالہ جات آئیں گے۔ یہ نقشہ آپ کو ابتدائی معلومات مہیا کرے گا۔

سردست اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ حق پرست اتحادیوں نے ظاہری اتحاد کے پردے میں خفیہ معاہدات کے ذریعہ اس "غرض و غایت" کی اس قدر مٹی پلید کی کہ چھوٹی سلطنتوں کا کچھ مر نکل گیا۔ اس جنگ میں مقتولین کی تعداد ایک محتاط اندازہ کے مطابق پچاس لاکھ اٹھائیس ہزار کے لگ بھگ مجروحین، قیدی اور لاپتہ لوگوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مصارف جنگ اربوں ڈالر تک جا پہنچے اور اس کا نتیجہ کیا نکلا! صرف یہ کہ بڑی طاقتوں نے بندر بانٹ کے ذریعہ چھوٹی سلطنتوں کی آزادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دوسری جنگ عظیم میں (۱۹۳۹-۴۵) میں ۲۸ ممالک شریک ہوئے۔ مقتولین کی تعداد

ایک کروڑ ۵۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگا سا کی پرائیٹم بم پھینک کر جان و مال اور زمین کی جو بربادی کی گئی وہ سب کے سامنے ہے۔

دوسری جنگ عظیم 1945 تا 1939	پہلی جنگ عظیم 1918 تا 1914	ہلاک	قیدی یا لاپتہ	ہلاک	قیدی یا لاپتہ
26976					آسٹریلیا ہنگری صرف پہلی جنگ
280	2200000	1200000			آسٹریا
149496	600	650			اطلی
291557	4500	126			امریکہ
943					برازیل
357116	991652	908371			برطانیہ
8460	34659	13716			بلجیئم
6671	27029	87500			بلغاریہ
	12318	7222			پرتگال
664					پولینڈ
	250	325			ترکی
1270	3	300			جاپان
3250	1152800	1773700			جرمنی
2473					جنوبی افریقہ
6683					چیکوسلواکیہ
1324516					چین

	4339			ڈنمارک
	6115000	2500	1700	روس
	350	80	335706	رومانیہ
		152958	45	سربہ
	201568	537	1357800	فرانس
	79047			فن لینڈ
	32412			کینیڈا
	200			ناروے
	6500			نیدر لینڈ
	11625			نیوزی لینڈ
	32121			ہندوستان
	147435			ہنگری
	305			یوگوسلاویہ
	17024	1	5	یونان
	14942962	8543919	8528315	

مندرجہ بالا اعداد و شمار عالمی معلومات مطبوعہ فیروز سنز سے انتہائی احتیاط سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس نقشہ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) پہلی جنگ متواتر ۴ سال جاری رہی۔ اس میں ۱۴ ممالک نے حصہ لیا۔ ۸۵ لاکھ سے زائد آدمی مارے گئے اور اتنے ہی ہلاک ہوئے۔ اور مقتولین ڈیڑھ کروڑ تھے۔ عرصہ جنگ ڈیڑھ گنا، شریک ممالک دو گنا اور مقتولین ۲ گنا ہے۔

(۲) دوسری عظیم متواتر چھ سال جاری رہی اس میں ۲۸ ممالک نے حصہ لیا اور مقتولین ڈیڑھ کروڑ تھے۔ عرصہ جنگ ڈیڑھ گنا شریک ممالک دو گنا اور مقتولین بھی دو گنا تھے۔

(۳) پہلی جنگ میں جن ۱۴ ممالک نے حصہ لیا۔ ان میں صرف دو ممالک پرنگال اور ترکی نے دوسری جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ باقی سب کے سب دوسری جنگ میں شریک رہے۔

(۴) ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت جنگیں اور ان کے بعد سمجھوتے علاقہ میں امن قائم نہیں کرتے بلکہ فتنہ و فساد اور ظلم کو اور زیادہ بھڑکا دیتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ فرسائی میں شرائط طے پا گئیں تو اکثر سیاسی مبصرین نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ اس معاہدہ میں آئندہ جنگ کا بیج بو دیا گیا ہے۔



اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۱)

اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان ہدایات پر عمل کر کے اس کا عملی نمونہ بھی پیش فرما دیا ہے۔ ان احکام و ہدایات کی اتباع ہر مسلمان پر تھی کہ رسول اللہ ﷺ پر بھی واجب تھی۔ اور آج بھی واجب الاتباع ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ یہاں ہم صرف ان قوانین کا ذکر کریں گے جو جنگ اور صلح سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) جنگ کن صورتوں میں ضروری یا جائز ہے ؟

اگر مندرجہ ذیل اسباب میں سے کوئی ایک سبب یا زیادہ پیدا ہو جائیں تو جنگ کرنا

ضروری ہو جاتا ہے:

(۱) جان و مال کی حفاظت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(جن مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی رہی ہے ان کو بھی لڑائی کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اتنی بات کہنے پر ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔)

﴿اِذْنٌ لِّلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌۭ ۝۵ الَّذِيْنَ اٰخَرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ (۳۹/۲۲)

جہاد سے متعلق سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ یہی آیت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں یا ان کے گھر بار چھین کر انہیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کر دیا ہے اور ان کے مذہبی عقائد پر تشدد کر کے انہیں دکھ پہنچایا ہے۔ ان سے اپنی

مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کی بحالی کی خاطر جنگ کرنا ضروری ہے۔

(۲) مدافعتانہ جنگ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (۱۹۰/۲)

(اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے لڑو۔ مگر زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔)

جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں نکل آئیں۔

(۳) مظلوم مسلمانوں کی فریاد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَا يَتِيهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّى يُهَاجِرُوا - وَإِنْ اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ﴾ (۷۲/۸)

(اور جو لوگ ایمان لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں ہاں وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد چاہیں۔ تو ان کی مدد کرنا لازم ہے۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی جگہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہوں۔ اور وہ کسی مسلمان ملک سے مدد طلب کریں تو ان پر ان کی مدد کرنا اور جنگ کے ذریعہ ان کو آزادی دلوانا فرض ہو جاتا ہے۔

(۴) احکام شرعیہ کی تکمیل میں رکاوٹ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ

(اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے نکال جس

ہذہ الْقَرْيَةَ الظَّالِمِ أَهْلِهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٤٥/٣﴾

کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مظلوم مسلمان امداد طلب نہ بھی کریں تب بھی ان کی مدد کو پہنچانا ان کی تکالیف کا مدد اور ایک آزاد مسلم ریاست پر فرض ہوتا ہے۔

(۵) بدعہدی یا عہد شکنی:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَيْمَةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَلَا نُنْقِصُ لَنْفُسِهِمْ فَمَا نَكُثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوا وَكُنْمُ أَوْلَىٰ مَرَّةً ۖ اتَّخَشَوْنَهُمْ ۚ قَالَ لَئِن لَّمْ يَآخُذُوا بِبِعْثِهِمْ لَأَنزِلُنَّهُمْ ۚ قُلْ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَهُ فَيُؤْتِكُمْ آلَهُمْ وَأَسْرَارَهُمْ فَيَنْقَسِبُوا عَلَيْكُمْ فَلْيَنْقَسِبُوا ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ لَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَمْرٍ ۚ﴾ (۱۳:۹)

اور اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعن کرنے لگیں تو ان کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ یہ بے ایمان لوگ ہیں اور ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔ بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور اللہ کے رسول ﷺ کو جلا وطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔ کیا تم ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ ڈرنے کے لائق صرف اللہ ہے بشرطیکہ تم ایمان رکھتے ہو۔

یعنی معاہدہ صلح کے بعد بدعہدی کرنا دراصل جنگ کے لیے ایسی میٹم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں معاہدہ کو ماننا چاہیے اگر وہ باز نہ آئے تو جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

(۶) دفعیہ فتنہ و فساد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاقْتُلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۚ﴾ (۱۹۳/۲)

(اور ان سے اس وقت تک لڑائی کرو کہ فتنہ نیست و نابود ہو جائے اللہ ہی کا دین (نظام حیات رائج) ہو جائے۔)

فتنہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو جنگ کے جواز کی سب صورتوں میں فتنہ ہی کی کوئی نہ کوئی قسم پائی جاتی ہے۔ یہاں فتنہ سے مراد خدا فراموش اور لادینی حکومت ہے۔ جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس صورت میں یہ جنگ مدافعتاً نہیں بلکہ اصلاحی جنگ کہلائے گی۔ دنیا سے فتنہ کا خاتمہ ہی اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔

(۷) قتل سفراء:

بین الاقوامی تعلقات کی استواری کے لیے ”ایفائے عہد“ کے بعد دوسری ضروری چیز سفارتی آداب کو اچھے طریقے پر ملحوظ رکھنا ہے۔ سفارتی آداب اور وفود کا احترام اتنا ہی اہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات کے وقت اس کی خصوصی وصیت فرمائی تھی۔ سفارتی آداب کا انتہائی بگاڑ یہ ہوتا ہے کہ سفیر کو قتل کر دیا جائے۔ مغرور حکمران بالعموم ایسی حرکت کرتے تھے۔ سفیر کا قتل درحقیقت جنگ کا الٹی میٹم ہوتا ہے۔ اور کوئی خود دار حکومت اسے برداشت نہیں کرتی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کیے جائیں۔ میلہ کذاب نے جب اپنا قاصد عبادہ بن حارث بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:-

((لَوْلَا اَنْ الرِّسْلِ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ غُنُقَكَ -)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب تیری گردن اڑا دیتا۔)

(الرسول)

صلح حدیبیہ کے وقت جب یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے پورے کے پورے چودہ موصحابہ رضی اللہ عنہم سے خون پر بیعت لی۔ کیونکہ یہ قومی وقار کا مسئلہ تھا اور اگر خدا نخواستہ یہ خرابی ہو جاتی۔ تو اس موقع پر جنگ یقیناً ناگزیر تھی۔ جنگ موتہ بھی اسی لیے شام کے ساحل پر جا کر لڑی گئی تھی کہ عیسائیوں کے رئیس شرییل بن عمرو نے رسول اللہ ﷺ کے پہلے قاصد جیحہ کلبی کو لوٹ لیا تھا اور دوسرے حارث بن عمرو کو قتل کر دیا تھا۔ لہذا قصاص کی خاطر آپ ﷺ نے یہ لشکر کشی کی تھی۔ (سیرۃ النبی از شبلی نعمانی ص ۵۱۹ مطبوعہ ماثرین قرآن لئینڈلاہور)

داخلی انتشار

داخلی انتشار بعض دفعہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اس سے ریاست کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور فوج طلب کرنا پڑتی ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں:-

ارتداد:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُرِدْ دُ مَنكُمُ عَنْ دِينِهِ فِيمَثْ
وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۲۱۷/۲)

(اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر
کافر ہو جائے گا اور کافر ہی مرے تو ایسے لوگوں
کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد
ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ میں جانے
والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔)

اسلام ہر شخص کو دین اختیار کرنے میں پوری آزادی دیتا ہے۔ لیکن اسلام لانے کے بعد دین سے پھر جانے کو سخت جرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام ایک تحریک ہے اور اس سے پھر کے دشمن سے جا ملنا بغاوت کے مترادف ہے۔ جس کی سزا دنیا کے ہر قانون میں قتل ہے۔ مرتد ہونے والے فرد یا جماعت کو پہلے گفت و شنید کے ذریعہ توبہ کی تلقین کی جائے گی۔ یہ تلقین تین بار ہونی چاہیے اور مرتدین کو سوچنے کا موقع دینا چاہیے۔ جیسے حضرت علیؑ نے حلو لیوں کو، جو حضرت علیؑ کو خدا سمجھتے تھے تین دفعہ تلقین کے بعد زندہ جلا دیا تھا یا گروہ کثیر کی صورت میں ان سے باقاعدہ جہاد کیا جائے گا جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ اور دوسرے مرتدین سے کیا۔ اسی طرح جو لوگ نبوت کا دعویٰ کریں، ان سے اور ان کے حواریوں سے بھی جنگ کی جائے گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے ان جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف فوج کشی کی۔ اور جہاد کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچایا۔

(۹) بغاوت:

بغاوت کی وجوہ عموماً یہ ہوتی ہیں کہ:

(۱) سربراہ مملکت کا اپنا کردار ٹھیک نہ ہو۔ یا اس کے عقائد و نظریات سے اختلاف ہو۔

(۲) وہ رعایا پر ظلم کرتا ہو۔ اپنے حقوق تو جبراً وصول کرے لیکن رعایا کے حقوق پر توجہ نہ دے۔

(۳) ذاتی مفادات مثلاً ہوس ملک گیری کی بنا پر کوئی طبقہ سربراہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ یا کوئی اطاعت گزار قوم اطاعت گزاری یا جزیہ کی ادائیگی سے انکار کر دے۔

ان تمام صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی اسلام بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے اگر امام کا رعایا پر ظلم کرنا جرم ہے۔ تو اس کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اس سے بڑا جرم ہے البتہ اسلام سے پھرنے والوں کے خلاف جہاد کر کے ان کا خاتمہ کیا جائے گا۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ آتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَيَّ رَجُلٍ
وَاحِدٍ يُرِيدُ أَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ أَوْ يُفَرِّقَ
حَمَاةَكُمْ فَاقْتُلُوهُ-))
(مسلم، کتاب الامارۃ والقضاء)

(اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں (یعنی تم سب کا کسی ایک شخص کی امارت پر اتفاق ہو) پھر کوئی شخص تمہاری قوت یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔)

نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ:

((إِذَا بُوِعَ الْخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْآخِرُ
مِنْهُمَا-)) (مسلم، ایضاً)

(جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کر دو۔)

اور ظاہر ہے کہ باغی عنصر بھی اپنے الگ سردار کے ماتحت ہو کر بغاوت کرتا ہے۔ خلافت راشدہ میں بغاوت کے خلاف جہاد کی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج کے خلاف جنگ کر کے اس فتنہ کو دبانا ہے۔ دور نبوی میں اکثر معاہد قبیلے اور بالخصوص یہود عہد شکنی کر کے بغاوت کرتے رہے جن کی بروقت سرکوبی کی جاتی رہی۔

(۱۰) رہزنی اور ڈکیتی:

رہزنی اور ڈکیتی کے انفرادی مقدمات تو عدالتوں میں پیش کیے جائیں گے۔ البتہ اگر ایسی غنڈہ گردی شدید صورت اختیار کر جائے تو فوج طلب کی جاسکتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے

لڑائی لڑیں اور ملک میں فساد کرنے کو
 دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل
 کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیے
 جائیں یا ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری
 طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک
 بدر کر دیا جائیں۔

وَيَسْعُونَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقْتَلُوا
 أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ
 مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ - ﴿٣٣:٥﴾

آیت مذکور میں یہ مختلف سزائیں ان کی تخریب کاری کی نوعیت کو ملحوظ رکھ کر تجویز کی گئی
 ہیں حاکم وقت ان کے جرم کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر ایک سزا بھی تجویز کر سکتا ہے۔ اور بیک وقت کئی
 سزائیں بھی دے سکتا ہے۔

شوال ۶ھ میں قبیلہ عکل اور غرینہ کے کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس آکر اسلام لائے
 اور وہیں رہنا شروع کیا۔ ان لوگوں کو مدینہ کی آب و ہوا اس نہ آئی اور آپ ﷺ سے اس تکلیف
 کی شکایت کی۔ حضور ﷺ نے انہیں بیت المال کی چراگاہ میں رہنے کو کہا کہ وہاں رہ کر خوب
 اونٹنیوں کا دودھ پیئیں اور یسار نامی ایک چرواہا ساتھ کر دیا۔ یہ لوگ چند دنوں میں خوب موٹے
 تازے ہو گئے۔ ان کو شرارت جو سو جھی تو یسار چرواہے کو بڑی بے دردی سے مار ڈالا۔ اور اونٹ ہنکا
 کر چلتے بنے۔ آپ ﷺ نے ان کے تعاقب میں آدمی بھیجے جو جا کر انہیں پکڑ لائے۔ آپ ﷺ
 نے اسی بے دردی سے ان کو مروایا جو سلوک انہوں نے چرواہے کے ساتھ کیا تھا۔ ان کی آنکھوں
 میں گرم سلانیاں پھیری گئیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ پھر حرہ کے ایک کونے میں ڈال
 دیئے گئے جہاں وہ مر گئے۔ (بخاری - کتاب المغازی - باب قصۃ عکل و غرینہ)

(۲) تخریب کاریاں منافی:

ایسے لوگوں سے باقاعدہ جنگ تو نہیں البتہ ان کی ہر ممکن طریقہ سے سرکوبی ضروری
 ہے۔ اور وہ ہے تخریب کاری یعنی (فقہہ کالمسٹ FIFTH COLOUMAST) یا منافقین کا
 طبقہ۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے کوئی جنگ نہیں کی تاہم بوقت ضرورت اس طبقہ کی سرکوبی کے
 لیے اگر ضرورت ہو تو فوج کی مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اسلام میں جنگ کا مقصد محض فتنہ و فساد کا
 دفعیہ ہے وہ ملک کے اندر ہو یا باہر ایک ہی بات ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-
 ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ (اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے لڑو
 وَأَغْلظْ عَلَيْهِمْ - ﴿٤٣/٩﴾ اور ان پر سختی کرو۔)

جنگ اُحد کے موقعہ پر منافقین نے اسلامی فوج کو سخت نقصان پہنچایا ایک ہزار کی جمعیت مقابلہ کو لگی۔ تو عبداللہ بن ابی ریس المنافقین اپنے تین سوساتھیوں کو لے کر واپس چلا آیا اور کہنے لگا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے میرا مشورہ (مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کا) قبول نہیں کیا۔ لہذا میں اس جنگ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس واقعہ سے ایک تو اسلامی فوج میں بے دلی پھیلی دوسرے باقی مسلمان فوج دو طرح کے نظریات میں بٹ گئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ اب ہمیں پہلے ان منافقوں سے نبٹ لینا اور ان سے جنگ کرنا چاہیے۔ اور دوسرا گروہ اور اکثر صحابہ اور حضور اکرم ﷺ یہ چاہتے تھے کہ کفار کے ساتھ لڑائی کی طرف توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اگر مسلمان اس وقت منافقین سے الجھ جاتے تو یہ داخلی انتشار ان کی شکست فاش کا موجب بن سکتا تھا۔ قرآن حکیم نے اس کا نقشہ یوں پیش فرمایا ہے:-

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِتْنَةٍ وَاللَّهُ أَرَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا﴾ (۸۷/۳)

(مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان بدکاریوں کی سزائیں ان کو (کفر کی طرف پھیر) اُلٹ دیا ہے۔)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((أَنَّهَا طَيْبَةٌ تُنْفِئُ الذُّنُوبَ كَمَا تُنْفِئُ النَّارُ حَيْثُ الْفِصَّةُ)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوة احد)

(مدینہ کا نام طیبہ (پاکیزہ) ہے وہ گنہگاروں کو اس طرح نکال پھینک دیتا ہے جیسے بھٹی چاندی کا میل نکال دیتی ہے۔)

چونکہ اس موقعہ پر منافقین کی خبر لینا شدید خطرہ شکست کا باعث بن سکتا تھا۔ لہذا اس موقعہ پر بھی منافقین مسلمانوں کی سختی سے بچ گئے۔

منافقین کا طبقہ دراصل اقتدار کی پیداوار ہوتا ہے۔ جنگ بدر سے پیشتر جبکہ مسلمانوں کے پاس اقتدار نہ تھا یہ طبقہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا منافقین کا نفاق یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق تو سارے وصول کر لیتا ہے لیکن فرائض سے حتی الوسع گریز کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر منافق کا اصول مفاد پرستی ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنا مفاد کفار کی طرف دیکھے تو درپردہ اس کے ساتھ روابط قائم کر لیتا ہے۔ جنگ میں یہ لوگ صرف اس وقت شریک ہوتے تھے جب مال غنیمت کا یقینی مفاد ان کے سامنے ہوتا تھا۔ غزوة حدیبیہ میں کسی منافق نے شرکت نہیں کی۔ اس لیے کہ یہ لوگ عمرہ کی نیت

سے گئے تھے۔ وہاں مال غنیمت کا سوال ہی نہ تھا۔ غزوہ تبوک میں سفر طویل اور تکلیف دہ موسم شدید گرم۔ فصلیں پک کر تیار کھڑی تھیں۔ دشمن لاکھوں کی تعداد میں تھا لہذا اس موقع پر بھی منافقین نے زیادہ تر بہانہ سازی سے کام لیا۔

منافقوں کی فتنہ انگیزیاں:

دور نبوی میں ان کی فتنہ انگیزیوں کے کارنامے کچھ اس طرح ہیں۔

(۱) جنگ بدر سے پہلے اور بعد قریش اور عبداللہ بن ابی کی خط و کتابت۔

(۲) غزوہ بنو قیقاع کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی یہود کے لیے طرفداری۔ یہود جب

محاصرہ کے بعد صلح پر آئے تو عبداللہ بن ابی جو ان کا حلیف تھا رسول اللہ ﷺ سے پر زور سفارش کی تھی کہ انہیں جلا وطن کر دیا جائے اور اس سے زیادہ کوئی سزا نہ دی جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کی بات مان لی۔

(۳) جب بنو نضیر کو آپ ﷺ نے جلا وطنی کا حکم دیا تو عبداللہ بن ابی انہیں امداد کے پیغامات

بھیجتا اور انہیں تسلی دیتا رہا کہ اگر چاہو تو یہ حکم قبول کرو۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مگر جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا تو عبداللہ بن ابی نے ان سے منافقت کی اور ان کے نزدیک تک نہ پھٹکا۔

(۴) غزوہ بنو مصطلق میں ایک دفعہ چشمہ سے پانی لینے پر ایک انصار اور ایک مہاجر میں جھگڑا

پیدا ہو گیا۔ انصار نے قدیم دستور کے موافق یا لانسار کا نعرہ مارا۔ اسی طرح مہاجر نے بھی ایسا ہی نعرہ لگایا دیا۔ قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے لیکن آپ ﷺ نے وہاں پہنچ کر بیچ بچاؤ کر دیا۔ اس موقع پر عبداللہ بن ابی نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا:

”تم نے مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دے کر خواستخواہ بلا مول لے لی۔ تم نے انہیں پال کر اتنا موٹا کر دیا کہ وہ اب تمہارے مقابلے پر آگئے ہیں۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، دستگیری سے ہاتھ اٹھالو۔ تو یہ لوگ تتر بتر ہو جائیں گے۔“ اسی تقریر کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے:-

﴿يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ (۸/۶۳)

(کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینے پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو مدینے سے نکال باہر کریں گے۔)

اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور عبد اللہ بن ابی کے قتل کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ لوگ کہنے لگیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔“ (بخاری۔ کتاب التفسیر تحت سورہ منافقون ۶۳)

(۵) اسی غزوہ سے واپسی پر واقعہ افک پیش آیا۔ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر جیسے اُسے مشہور کیا اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔

(۶) جنگ احزاب کے موقع پر مدینہ کے اندر موجود بنو قریظہ کے ساتھ منافقین مل گئے اور فتنہ گری میں برابر کے شریک رہے۔

(۷) جنگ خیبر کی تیاریوں کی خفیہ اطلاع عبد اللہ بن ابی نے یہودیوں کو پہنچائی۔ ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیجا کہ: ”تم مسلمانوں سے نہ ڈرنا۔ ان کی ہستی کیا ہے۔ مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک موجود نہیں۔“ اس پیغام پر یہود چوکس ہو گئے اور بنو غطفان وغیرہ سے اتحاد کے معاہدے کئے۔

(۸) اپنی تخریبی سرگرمیوں کو منظم بنانے کے لیے ۹ھ میں مسجد ضرار تعمیر کی۔ آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ اس مسجد کا افتتاح فرمائیں۔ آپ ﷺ نے وعدہ بھی فرمایا کہ غزوہ تبوک کے بعد اس میں افتتاحی نماز پڑھائیں گے۔ دریں اثنا اس مسجد کو جو امت میں افتراق و انتشار کا ایک سبب بن سکتا تھا۔ مسمار کر دیا۔

یہ ہے منافقین کے کارناموں کی مجمل فہرست۔ آپ ﷺ چاہتے تو عبد اللہ بن ابی رضی اللہ عنہ نہیں المنافقین کو قتل کرا سکتے تھے۔ وَاغْلَبْ عَلَيْهِمْ كُرُوسِے آپ ﷺ کو اس بات کی اجازت بھی تھی۔ یہ آپ ﷺ کی طبیعت کی نرمی تھی کہ آپ ﷺ ہر موقع پر درگزر فرماتے رہے۔ ان سے باقاعدہ جنگ اس لیے مشکل ہوتی ہے کہ نفاق کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔ ظاہر سے نہیں۔ ظاہری طور پر وہ مسلمان ہوتے ہیں۔ اور احکام کا اطلاق ظاہر پر ہوتا ہے۔ باطن پر نہیں۔ ان پر سختی کا مطلب ان سے جنگ یا جہاد نہیں بلکہ ان سے باز پرس میں نرمی کے بجائے سختی کرنا ہے۔

یہ دور نبوی ﷺ کے منافقین کی بات تھی۔ آج کے منافقین کی فتنہ گری کے اطوار بدل چکے ہیں۔ حکومت وقت کے خلاف خفیہ سازشیں، دشمن کو خفیہ راز مہیا کرنا۔ سرکاری املاک کو برباد کرنا، بیرونی طاقتوں اور ان کے نظریات کے لیے میدان ہموار کرنا، ادب و ثقافت کے نام پر

لوگوں کو اسلامی شعائر سے متفر کرنا اور باطل نظریات کا پرچار کرنا وغیرہ ہیں۔ ان کے متعلق یہ احکام ہیں کہ جس منافق کے جرم کے متعلق ثبوت مہیا ہو جائے۔ اس کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ منافقین کا طبقہ کھلے دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

(۲) جنگ کن صورتوں میں ناجائز ہے؟

(۱) دنیوی اغراض و مقاصد:

ذاتی اغراض خواہ ہوس ملک گیری پر مبنی ہوں یا مفادات کے تحفظ یا نسلی مفاخرت پر مبنی ہوں۔ وطنیت اور قومیت کی جنگ ہو۔ یا محض انتقام کے جوش میں لڑی جائے، ان سب قسموں کی جنگ ناجائز بلکہ حرام ہے۔ اس جنگ میں مرنے والوں کا خون حملہ آور کی گردن پر ہوگا۔ اور جو مال یا زمین حاصل کی جائے گی وہ غصب میں شمار ہوگی۔

خون ناحق، غصب کردہ اموال کے متعلق جو احکام قرآن کریم میں آئے ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہیں تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ صرف وہ ہے جو اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑا جائے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی جنگ حرام ہے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

(۲) عہد کی پابندی (جب تک میعاد ختم نہ ہو):

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُضُوا عَهْدَهُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتَيْتُمُوهُمْ وَعَاهَدْتُمْ إِلَيْهِمْ﴾ (۴/۹)

(مگر جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور بھی نہیں کیا۔ نہ ہی تمہارے مقابلے میں کسی دوسرے کی مدد کی تو جس مدت تک ان کے

ساتھ عہد کیا ہو، اسے پورا کرو۔)

اگر کسی ملک کے مسلمان فریاد بھی کریں۔ تو اگر اس ملک سے معاہدہ ہے۔ تو جنگ نہیں

کی جاسکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنِ اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ
النَّصْرُ إِلَّا عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِثَاقٌ﴾ (۷۳/۸)

(اگر (مظلوم مسلمان) دین کے معاملہ میں
مدد طلب کریں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے الا یہ
کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح کا)
معاہدہ ہو چکا ہو۔)

(۳) غیر جانبدار قوم:

جو لوگ ظالم یا بدکار نہیں۔ نہ وہ دین حق کو مٹانے یا دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو
خلق خدا کے امن کو غارت نہیں کرتے وہ خواہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے دینی عقائد
کیسے ہی باطل ہوں، ان سے جنگ نہیں کی جاسکتی۔ ارشاد باری ہے:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدِّينِ لَمَّا يُقَاتِلُوْكُمْ
فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتَقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ
الدِّينِ قَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّينِ وَاَخْرَجُوْكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى اَخْرَاجِكُمْ
اَنْ تَوَلُّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (۹۰/۶۰)

(اللہ تمہیں ان لوگوں سے بھلائی کرنے اور
انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا
جنہوں نے تم سے دین کے سلسلہ میں لڑائی
نہیں لی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے۔
اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا
ہے۔ اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ دوستی
کرنے سے روکتا ہے۔ جنہوں نے تم سے
دین کے معاملہ میں جنگ کی، تمہیں
تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہیں نکالنے
میں دشمنوں کی مدد کی ہے۔ انہیں جو کوئی
دوست بنائے وہ ظالم ہے۔)

(۴) صلح کی پیشکش:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِنِ اعْتَزَلْتُمْ لَكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَالْقَوٰ
اِيْلَيْكُمْ السَّلْمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
سَبِيْلًا ۝﴾ (۹۰/۴)

(پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی
کریں اور نہ لڑیں۔ اور تمہاری طرف صلح (کا
پیغام) بھیجیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان
پر (زیادتی کرنے کی) کوئی گنجائش نہیں رکھی۔)

اور ایک دوسرے مقام پر یہ صراحت بھی فرمادی کہ اگر تمہیں خطرہ ہو کہ دشمن اس صلح
سے وغادے جائے گا تو بھی صلح کی پیشکش قبول کرنا ہی چاہیے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ﴾ (۲۳:۶۱:۸)

(اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم لوگ بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ یہ چاہیں کہ تمہیں فریب دیں تو اللہ تمہیں کفایت کرے گا۔)

یہ آیات اس بات کی واضح شہادت ہیں کہ اسلام دنیا میں تخریب کاری کے لیے نہیں بلکہ اسے منانے آیا ہے۔

پھر اگر کسی قوم سے بدعہدی اور خیانت کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ تو کھلے بندوں معاہدہ کو منسوخ قرار دے دینا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ﴾ (۵۸:۸)

(پھر اگر تمہیں کسی قوم سے دغا بازی کا خطرہ ہو تو معاہدہ برابری کی بنیاد پر فسخ کر دو۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا۔)

اس معاہدہ کی تیغ کے بعد ہی ان سے جنگ لڑی جاسکتی ہے۔ پہلے نہیں۔

(۵) سیاسی پناہ یا امان:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾ (۶:۹)

(اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دو۔ حتیٰ تک کہ اللہ کا کلام (اچھی طرح) سن لے۔ پھر (بھی) اسلام نہ لائے تو اسے امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔)

یہ پناہ خواہ میدان جنگ میں دی گئی ہو یا پہلے سے۔ دونوں صورتوں میں اس پناہ کا احترام لازم ہے پناہ کا جائز اختیار خواہ وہ کسی فرد کو دی جائے یا کسی قوم کو امیر یا سپہ سالار کو ہی ہوتا ہے۔ تاہم ایک عام مسلمان، حتیٰ کہ غلام یا عورت بھی اگر پناہ دے دے تو وہ موثر ہوتی ہے۔

(بخاری کتاب الجہاد والسير۔ باب امان النساء اور باب ذمۃ المسلمین وحوارہم واحدة یسعی بہا اذناہم)

اور اسکو تمہیں مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ امان دراصل عہد ہی کی ایک قسم ہے۔ عہد وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ امان صرف جان و مال و آبرو کی حفاظت کا عہد

ہے۔ متامن کے کچھ حقوق و فرائض معین ہوتے ہیں۔ مثلاً جاسوسی اور بغاوت کے سوا کوئی جرم اس کی امان کو ختم نہیں کر سکتا۔ البتہ اس کے جرم کی سزا ملکی قانون کے مطابق دی جائے گی جہاں وہ رہائش پذیر ہے۔

آج کل حکومتیں جو دوسرے ملکوں کے بعض افراد کے لیے visa جاری کرتی ہیں۔ ان کی حقیقت بھی امان ہی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ویزا اسٹم تو دو مسلم ریاستوں میں بھی چلتا ہے۔ جبکہ امان صرف مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ہوتی ہے۔

(۶) اظہار اسلام یا کوئی علامت دیکھنے پر:

اگر حریف مقابلہ پر آکر زبان سے یا کنا یا اسلام کا اظہار کر دے۔ تو جنگ سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتُ مُؤْمِنًا﴾ (۹۳/۴)

(اے ایمان والو۔ جب تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکل کھڑے ہو تو تحقیق سے کام لیا کرو اور جو شخص تم سے سلام علیکم کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔)

اب دوزنبوی رضی اللہ عنہ کے درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

((كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يَغْزُ حَتَّىٰ يُصْبِحَ فَإِن سَمِعَ إِذَا نَا أَمْسَكَ وَإِن لَمْ يَسْمَعْ إِذَا نَا أَعَارَ)) (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب دعاء النبی الی الاسلام والنبوة)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم پر جہاد کرتے تو صبح تک حملہ نہ کرتے پھر اگر (صبح کی) اذان سن لیتے تو حملہ کرنے سے رُک جاتے اور اگر نہ سنتے تو حملہ آور ہو جاتے۔)

(۲) ابن عصام المزنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سر یہ پر روانہ کیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ:-

((إِذَا رَأَيْتُمْ مَسْجِدًا وَسَمِعْتُمْ مُؤَذِّنًا فَلَا تَقْتُلُوا أَحَدًا-)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ تو پھر کسی شخص کو قتل نہ کرو۔)

باب فی دعاء المشرکین

(۳) امام بخاری نے درج ذیل عنوان سے باب قائم کیا ہے۔

((إِذَا قَالُوا صَبَانًا وَلَمْ يُحْسِنُوا أَسْلَمْنَا
وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ فَجَعَلَ خَالِدٌ يَقْتُلُ فَقَالَ
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبْرَأُ إِلَيْكَ
مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ وَقَالَ عُمَرُ إِذَا قَالَ
"مترس" فَقَدْ آمَنَهُ إِنْ اللَّهُ يَعْلَمُ الْأَلْسِنَةَ
كُلَّهَا)) (بخاری۔ کتاب الجہاں والسریر۔ باب
مذکورہ)

اگر کافر لڑائی کے وقت (گھبرا کر) اچھی
طرح یوں نہ کہہ سکیں کہ ہم مسلمان ہوئے
بلکہ یوں کہیں کہ دین بدل دیا۔ عبد اللہ بن
عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے
(بنی مدینہ کی جنگ میں) کافروں کو مارنا
شروع کر دیا (حالانکہ وہ کہتے جاتے تھے ہم
نے دین بدلا۔ ہم نے دین بدلا)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو فرمایا۔ یا
اللہ میں خالد کے کام سے بیزار ہوں اور
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ جب کسی مسلمان
نے کلمہ کہا "مترس" (یعنی نہ ڈرو) تو اس کو
امان دے چکا (اس کو مارنا درست نہیں)
کیونکہ اللہ تو سب زبانیں جانتا ہے۔
"مترس" کے معنی ہیں "نہ ڈرو" یہ فارسی
زبان کا لفظ ہے۔

(۴) علامہ طبری اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سرایا
صرف دعوت اسلام کے لیے بھیجے تھے لڑنے سے منع کیا گیا تھا اس کے باوجود حضرت
خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تلوار سے کام لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو قبلہ رو کھڑے ہو کر تین
بار کہا یا اللہ! میں خالد کے کام سے بری ہوں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جنہوں نے
ایک ایک بچے کا یہاں تک کہ کتوں کاخوں بھاوا کیا اور اس پر مزید رقم دی۔

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶۵۱)

(۵) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

((بَعَثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ سَرِيَّةً إِلَى الْحُرُكَاتِ فَنَدَرُوا بِهَا
فَهَرَبْنَا فَأَدْرَكْنَا رَجُلًا فَلَمَّا غَشِينَاهُ قَالَ
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَصَرَبْنَاهُ حَتَّى قَتَلْنَاهُ،
فَذَكَرْتُهُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
(ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرقات کی
طرف ایک سریہ پر بھیجا..... وہ لوگ ہمیں
دیکھ کر اپنا علاقہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ایک
شخص کو ہم نے جالیا۔ تو اس نے کہہ دیا.....
لا الہ الا اللہ، ہم نے اُسے تلوار سے مارا یہاں

تک کہ جان سے مار ڈالا۔ پھر میں نے حضور ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن جب وہ اس کلمہ کے ساتھ تم سے جھگڑے گا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟“ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اس نے تو ہتھیاروں کے ڈر سے کلمہ کہہ دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی اسی وجہ سے اس نے کلمہ پڑھا۔ پھر آپ برابر یہی الفاظ دہراتے رہے۔ ”قیامت کے دن تمہارا کیا حال ہوگا“ یہاں تک کہ میں چاہنے لگا۔ کاش! میں آج کے دن ہی اسلام لایا ہوتا۔

فَقَالَ: مَنْ لَكَ بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟“ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ: إِنَّمَا قَالَهَا مَخَافَةَ السَّلَاحِ. قَالَ: أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ حَتَّى تَعْلَمَ مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ قَالَهَا أَمْ لَا؟ مَنْ لَكَ بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ فَمَا زَالَ يَقُولُهَا حَتَّى وَدِدْتُ أَنِّي لَمْ أُسَلِّمْ إِلَّا يَوْمَئِذٍ ((ابوداؤد- کتاب الجہاد- باب علی ما یقاتل المشرکون بخاری - کتاب المغازی- باب بعث النبی اسامہ بن زید الی الحرقات))

(۶) حضرت مقداد بن عمرو الکندی ؓ روایت کرتے ہیں:-

(حضرت مقداد ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بتلائیے۔ اگر میں ایک کافر سے مقابلہ کروں پھر وہ کافر تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اُس کے بعد ایک درخت کی پناہ لے کے مجھ سے کہے میں اللہ کا تابع دار بن گیا۔ (مسلمان ہو گیا) اب میں اسے قتل کر دوں جبکہ وہ الفاظ کہہ چکا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں اس کو قتل نہ کرو۔“ مقداد ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس نے تو میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا اور ہاتھ کاٹنے کے بعد ایسا کہنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (کچھ بھی ہو) اس کو قتل نہ کرو۔)

((أَنَّهُ قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرَأَيْتَ إِنْ لَقَيْتَ رَجُلًا مِنَ الْكُفَّارِ فَأَقْتَلْنَا فَضْرَبَ أَحَدِي يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا ثُمَّ لَا دَمِينِي بِشَجَرَةٍ فَقَالَ أَسَلَّمْتُ لِلَّهِ أَقْتَلُهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَعْدَ أَنْ قَالَهَا؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلُهُ“ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّهُ قَطَعَ أَحَدِي يَدَيَّ ثُمَّ قَالَ ذَلِكَ بَعْدَ مَا قَطَعَهَا؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَقْتُلُهُ)) (بخاری- کتاب المغازی باب بلا عنوان)

(۷) حضرت خالد بن ولید ؓ کسی شخص کے متعلق حضور اکرم ﷺ سے سوال کرتے ہیں:-

((قَالَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَلَا

کی گردن اڑا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔
 ”نہیں شاید نماز پڑھتا ہو۔ خالد رضی اللہ عنہ نے
 عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ بہت سے نمازی
 ایسے ہیں۔ جو زبان سے کچھ کہتے ہیں اور
 دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے
 فرمایا: مجھ کو یہ حکم نہیں ملا کہ میں لوگوں کے
 دل کی بات کھود کر نکالوں یا ان کے پیٹ
 چیروں۔“

أَضْرَبُ عُنُقَهُ قَالَ لَا لَعَلَّهُ أَنْ يَكُونَ
 يُصَلِّي؟ فَقَالَ خَالِدٌ وَكَمْ مِنْ مُضَلٍّ
 يَقُولُ بِلِسَانِهِ مَا لَيْسَ فِي قَلْبِهِ. قَالَ
 رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي
 لَمْ أَوْمَرَنْ أَنْفَلِبْ قُلُوبَ النَّاسِ وَلَا أَسُقُّ
 بَطُونَهُمْ“ ((بخاری۔ کتاب المغازی)

ان سب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

- (۱) کوئی کافر اگر محض جان بچانے کی خاطر یا دھوکہ سے ہی اپنے اسلام کا کسی طرح اظہار
 کر دے تو اس سے فوراً ہاتھ روک لینا چاہیے۔
- (۲) اسلام نے نہ تو انتقامی کارروائی کو جائز قرار دیا ہے اور نہ ہی لوٹ مار اور ذاتی مفادات کو
 بلکہ ان کے مقابلہ میں کسی شخص کا ایمان لانا خواہ وہ کیسا ہو۔ اسے سب سے زیادہ عزیز

www.KitaboSunnat.com ہے۔

(۳) جنگ سے قبل

(۱) لوٹ مار اور تباہ کاری کی ممانعت:

ایک مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جہاں کہیں فوج ڈیرے ڈالتی تو چاروں طرف
 پھیل جاتی۔ راستے بند ہو جاتے۔ اور راہگیروں کا مال و متاع لٹ جاتا۔ کسی لڑائی کے دوران
 اسلامی فوج سے بھی ایسی حرکات سرزد ہوئیں تو آپ ﷺ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا
 اس کا جہاد ہی نہیں۔ چنانچہ معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:-

((عَزَّوْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 وَسَلَّمَ عَزْوَةً كَذَا وَكَذَا فَصَيَّقَ النَّاسُ
 الْمَنَازِلَ وَقَطَعُوا الطَّرِيقَ فَبَعَثَ النَّبِيُّ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنَادِيًا ينادى فى
 النَّاسِ أَنْ مَنْ صَيَّقَ مَنْزِلًا وَقَطَعَ طَرِيقًا
 (میں فلاں غزوہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا،
 لوگوں نے دوسرے کی منازل کو تنگ کر دیا اور
 راہگیروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ آپ ﷺ نے
 ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو
 دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹ مار

قُلَّا جِهَادٌ لَّهٗ -)) (ابوداؤد - کتاب الجہاد - باب کرے تو اس کا جہاد قبول نہیں۔)

مابو مرمن انضمام العسکر)

(۲) دشمن پر جنگ کی شرائط پیش کرنا:

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا یہ دستور تھا کہ لڑائی شروع کرنے سے پیشتر تین باتیں دشمن کی پیش کی جاتی تھیں اور اسے اختیار دیا جاتا تھا کہ ان میں سے جوئی شرط چاہے قبول کرے۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) دشمن کو بذریعہ سفارت پیغام بھیجا جاتا تھا کہ وہ اسلام لے آئیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جس طرح مسلمان دنیا سے فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اگر وہ اسلام لے آتے اور مسلمانوں کے مشن میں ان کے ممد و مددگار ثابت ہوتے تو ان کو مسلمانوں جیسے جملہ حقوق مل جاتے تھے۔ اور ان کا ملک، علاقہ انہی کے پاس رہنے دیا جاتا تھا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہوتی تھی کہ اگر وہ اسلام لانا گوارا نہیں کرتے تو مسلمانوں کے مشن میں کم از کم رکاوٹ نہ بنیں۔ اندریں صورت انہیں اپنے مذہبی حکام، مجالانے اور اپنی شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کی مکمل آزادی ہوتی تھی۔ البتہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ آ جاتا تھا پھر انہیں اسلام یا پیغمبر اسلام کے خلاف زہر افگنی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اور اس قوم کی دفاعی ذمہ داریاں مسلمانوں پر آ پڑتی تھیں۔ جس کے عوض انہیں معمولی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جسے شرعی زبان میں جزیہ کہتے ہیں:-

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ
وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ
عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ (۲۹/۹)

(جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ زیر دست ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں۔)

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نہ تو کسی قوم کا دشمن ہے، نہ نسل کا اور نہ علاقہ یا ملک کا۔ اسے ان امور میں سے کسی سے بھی دلچسپی نہیں۔ اسے غرض ہے تو صرف دنیا سے فتنہ و فساد مٹانے سے اور اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے سے یہ مقصد اگر بلا جنگ حاصل ہو جائے تو اسے جنگ کی قیمت پر گوارا نہیں۔

دستور تھا کہ اسلامی فوج کا سپہ سالار سالانہ رسالہ دعوت کے بعد تین دن تک انتظار کرتا۔ اگر اس مدت انتظار میں دشمن گفت و شنید پر آمادہ ہوتا تو اس کا انتظام کیا جاتا۔ گفت و شنید کا اکثر نتیجہ یہ نکلتا کہ لڑائی رُک جاتی۔ مثلاً شام و عراق میں مخالفوں نے چند شہر مسلمانوں کے حوالے کر کے صلح کر لی۔ لیکن بعض اوقات اختلاف فکر و رائے باقی رہتا تو اس صورت میں جنگ چھڑ جاتی۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر رستم کی انتہائی کوشش تھی کہ لڑائی کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ لیکن مسلمانوں کے نمائندہ مغیرہ بن شعبہ نے یہی تین شرائط پیش کیں اور ان میں کچھ بھی کمی پیشی نہ کی پہلی دونوں باتوں کو رستم اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ لہذا چاہتا تھا کہ مسلمان ویسے ہی کچھ مال و دولت لے کر واپس چلے جائیں۔ جب مسلمانوں نے انہی شرائط پر اصرار کیا تو مایوس ہو کر کہنے لگا۔ ”میرے اور مسلمانوں کے درمیان صلح کا کوئی امکان نہیں رہا“۔ چنانچہ قادسیہ کی جنگ ہو کر رہی جس میں رستم کو اور ایرانیوں کو فیصلہ کن شکست نصیب ہوئی۔

اسلام کی اصل غرض یہ ہے کہ لوگ علیٰ وجہ البصیرت اور برضا و رغبت اسلام قبول کر کے فتنہ و فساد سے رُک جائیں اور احکام الہی کے تحت امن و عافیت کی زندگی بسر کریں۔ جہاد سے درحقیقت یہی غرض ہوتی ہے۔ اسلام کو نہ جزیہ سے رغبت ہے، نہ اموال غنیمت سے یہ تو دوسری اور تیسری قسم کی چیزیں ہیں۔ جنگ خیبر اور درہ ربیعہ میں پہلا غزوہ تھا جب آپ ﷺ نے کوئی علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو جھنڈا عنایت فرمایا تو انہوں نے عرض کی۔ ”کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں؟ ارشاد ہوا کہ نرمی سے ان پر اسلام قبول کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری تبلیغ سے اسلام لے آئے تو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے“۔ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ خیبر)

(۳) اور اگر وہ جزیہ ادا کرنے پر، جو ان کی زبردستی کی علامت کے طور پر ان سے وصول کیا جاتا ہے، بھی رضامند نہ ہوں یا بالفاظ دیگر فتنہ و فساد کرنے پر مصر ہوں یا اسے روکنے کی

کوششوں میں رکاوٹ بنے رہیں تو پھر ان سے جنگ کی جائے جیسے کہ آیت بالا سے ثابت ہے۔ اور جنگ کسی مخصوص علاقہ یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فتنہ کو ختم کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ:-

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً﴾ (اور ان سے اس وقت تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے۔) (۱۱۳/۲)

(۴) معرکہ کارزار میں

(۱) شبنون کی ممانعت:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى خَيْبَرَ لَيْلًا وَكَانَ إِذَا أَتَى قَوْمًا بَلِيلٍ لَمْ يُغْزِيَهُمْ حَتَّى يَصْبَحَ)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوه خيبر)

(آنحضرت ﷺ خيبر میں رات کو پہنچے اور آپ ﷺ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب تک صبح نہ ہوتی ان پر حملہ نہ کرتے۔)

لیکن اگر جنگ گور یا قسم کی ہو اور یہ خطرہ ہو کہ حملہ کے وقت دشمن سامنے آنے کے بجائے اپنی کمین گاہوں میں گھس جائے گا۔ اور بعد میں فوج کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ آور ہوگا۔ تو اس صورت میں بے خبری میں بھی حملہ کرنے کی اجازت ہے۔ جیسے غزوہ بنو لحيان اور ذات الرقاع میں بدوؤں نے اسلامی دستے دیکھ کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر پناہ لے لی تھی۔ چنانچہ سر یہ علی بن ابی طالب (۶ھ) میں اسلامی دستہ کے ۱۰۰ آدمی تھے جو رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے۔ اس طرح انہوں نے بنو سعد کو جالیا۔ پھر بھی وہ مستورات کو لے کر فرار ہو گئے تھے البتہ کچھ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور سر یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (۷ھ) میں بھی یہی کچھ ہوا اور ہوازن کے لوگ فرار ہو گئے۔

(۲) دشمن سے ڈبھیڑ کی آرزو نہ کرنی چاہیے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

((لَا تَسْمَنُوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ فَإِذَا لَقَيْتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا)) (بخاری۔ کتاب الجہاد والاسیر۔ باب مکان النبی اذالم یقاتل اول النہار)

(دشمن سے ٹڈ بھیز ہونے کی آرزو مت کرو۔ اور جب ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو۔)

عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَسْمَنُوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْتَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقَيْتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ الشُّيُوفِ)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد فی کراہیۃ تسمی لقاء العدو بخاری حوالہ ایضاً)

(اے لوگو! دشمن سے ٹڈ بھیز کی آرزو نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ پھر اگر کبھی ٹڈ بھیز ہو جائے تو صبر و استقلال سے کام لو۔ اور خوب جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔)

پھر اگر دشمن سے مقابلہ کرنا پڑے تو پورے صبر و ثبات اور استقلال سے یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔

(۳) اسلحہ بیکار ضائع نہ کیا جائے:

حضرت ابواسید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-

((قَالَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ بَدْرٍ إِذَا كُتِبُواكُمْ فَاصْبِرُوا وَاسْتَبْقُوا نَبْلَكُمْ)) (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوه بدر)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ہم سے فرمایا۔ جب کافر تمہاری زد پر آجائیں اس وقت تیر چلاؤ۔ اور اپنے تیروں کو بچائے رکھو۔)

اسلحہ کا محتاط استعمال اور اس سے حتی الوسع بھرپور استفادہ کرنا اقتصادی کفایت شعاری میں داخل ہے جو اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔

(۴) امیر اور بنیادی حقوق کا احترام:

اسلام میں امیر کی اطاعت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور میدان جنگ میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مگر اسلام نے اطاعت کے بارے میں ایک عام اصول بیان فرمادیا ہے کہ:-

﴿ لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي ﴾ (خدا کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ المعروف ﴿ (متفق علیہ) اطاعت صرف بھلائی کے کاموں میں ہے۔)

اس مضمون کی دوسری حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:-

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ (خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت
الْخَالِقِ)) (شرح السنہ) (نہیں۔)

مثلاً اگر خاوند بیوی کو نماز سے یا فریضہ حج ادا کرنے سے یا پردہ کرنے سے روکے تو بیوی پر خاوند کی اطاعت واجب نہیں۔ اسی طرح اگر حاکم رعایا کو یا سپہ سالار فوج کو یا آقا غلام کو کسی کام کے کرنے کو کہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو اس صورت میں اطاعت جائز نہ ہوگی۔

میدان جنگ میں بھی یہ اصول برقرار رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی حقوق میدان جنگ میں بھی برقرار رہتے ہیں۔ آج کل اکثر حکومتیں ہنگامی حالات کا سہارا لے کر عوام الناس کے بنیادی حقوق کو تا اطلاع ثانی معطل کر دیتی ہیں۔ یہ بات از روئے اسلام جائز نہیں۔ حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں:-

((بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرِيَّةً فَاسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ وَأَمَرَهُمْ أَنْ يَطِيعُوهُ. فَغَضِبَ وَقَالَ: أَلَيْسَ أَمْرُكُمْ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَطِيعُونِي؟ قَالُوا بَلَى، قَالَ فَأَجْمَعُوا حَطْبًا فَجَمَعُوا فَقَالَ: أَوْقِدُوا نَارًا فَأَوْقِدُوا. فَقَالَ ادْخُلُواهَا فَهَمُّوا وَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يُمْسِكُ بَعْضًا وَيَقُولُونَ فَرَرْنَا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ النَّارِ فَمَا زَالُوا حَتَّى حَمِدَتِ النَّارُ فَسَكَنَ غَضَبُهُ فَبَلَغَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "لَوْ دَخَلْتُمْهَا مَا خَرَجْتُمْ"

(آنحضرت ﷺ نے ایک دستہ بھیجا اور ایک انصاری (عبداللہ بن حذافہؓ) سمی) کو امیر لشکر بنایا۔ اور لوگوں کو حکم دیا کہ امیر کی اطاعت کریں۔ یہ امیر کسی بات پر مشتعل ہو گیا اور ساتھیوں سے کہنے لگا۔ ”کیا حضور ﷺ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا؟“۔ لوگ کہنے لگے کیوں نہیں۔“۔ امیر نے کہا۔ ”اچھا لکڑیاں جمع کرو۔“۔ انہوں نے اکٹھی کیں تو کہنے لگا: آگ روشن کرو۔“۔ انہوں نے آگ بھڑکادی تو کہنے لگا۔ ”اب اس میں داخل ہو جاؤ۔“۔ لوگوں نے قصد کیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے ”آگ (عذاب قیامت) سے بچنے کے لیے ہی تو ہم حضور

مِنْهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ الطَّاعَةُ فِي
الْمَعْرُوفِ - ((بخاری - کتاب المغازی - باب
سر یہ عبد اللہ بن حرافہ سہمی))

اکرم ﷺ کی طرف بھاگ آئے (تو اب
اس میں کیوں داخل ہوں) اسی بحث تحقیص
میں آگ بجھ گئی اور اتنے میں امیر کا غصہ فرو
ہو گیا۔ جب یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ
ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم آگ میں داخل
ہو جاتے تو قیامت تک اس سے نہ نکلتے۔
(یاد رکھو) اطاعت صرف ان باتوں میں
ہے جو خلاف شریعت نہ ہوں۔“

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:-

- (۱) شریعت کے خلاف حکم دینے والا خواہ بادشاہ ہو یا امیر لشکر، مولوی ہو یا امیر لشکر، مولوی ہو یا پیر، ولی ہو یا قطب، خاوند ہو یا آقا والد ہو یا والدہ کسی کی اطاعت نہ کرنی چاہیے۔
- (۲) جو خلاف شریعت کاموں میں اطاعت کرے گا۔ وہ خود بھی گناہ گار ہوگا۔ اگر یہ فوجی دستہ حکم مان لیتا۔ تو ایک اسے غیر معروف میں اطاعت کی سزا ملتی دوسرے خود کشی کی۔
- (۳) بادشاہ یا امیر لشکر کو بنیادی حقوق جو شریعت کے مقرر کر دیئے ہیں انہیں پامال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ خواہ حالات کتنے ہی ہنگامی ہوں رعایا کی جان کی حفاظت امیر کی ذمہ داری ہے اور رعایا کا حق ہے۔ حق کے بغیر بادشاہ بھی نہ کسی کی جان لے سکتا ہے۔ نہ دوسرے بنیادی حقوق معطل کر سکتا ہے۔

(۵) امیر کی اطاعت:

یہ ایک پہلو چھوڑ کر باقی ہر طرح کے معاملات میں امیر کی اطاعت لازم ہے۔ خواہ اس کے حکم کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور خواہ یہ حکم بظاہر صریح زیادتی معلوم ہو رہا ہو۔ اور میدان جنگ میں تو اس اطاعت کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ میدان جنگ میں امیر سے تنازعہ کا واضح مطلب خود شکست کو دعوت دینا ہے۔ جنگ احد میں یہی کچھ ہوا۔ پہاڑی درہ پر رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا۔ ان کا امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ انہیں حکم یہ تھا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں یہ دستہ اسی جگہ پر ڈیوٹی دیتا رہے گا۔ پھر جب مسلمانوں کو فتح کے آثار نظر آ گئے اور وہ غنیمت کا مال سمیٹنے لگے۔ تو اس دستہ میں اختلاف پیدا

ہوا۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ اب مقصد حاصل ہو چکا لہذا اب یہاں ڈیوٹی دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب مال غنیمت کے اکٹھا کرنے کے لیے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے حالات کچھ بھی ہوں یہاں سے نہیں ملنا چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی فیصلہ تھا کہ یہاں سے ہٹنا نہیں چاہیے۔ چنانچہ اس تنازعہ میں صرف بارہ اصحاب امیر کا حکم مان کر دیں رہے اور باقی ۳۸ ذرہ کو چھوڑ کر غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ ذرہ خالی دیکھ کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (جو اس وقت کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے) نے اس طرف سے بھرپور حملہ کیا اور مسلمانوں کی حاصل شدہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔

اس موقع پر ذرہ چھوڑنے والے مسلمانوں نے دو غلطیاں کی تھیں۔ ایک تو اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے سرتابی کی حالانکہ حکم کے بعد اجتہاد کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ دوسرے امیر لشکر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تنازعہ بھی کیا اور ان کے حکم سے سرتابی بھی کی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّوهُمُ
بِأَذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَيَسْتَأْمِرُوا وَتَأْتَاكُمْ فِي الْأَمْرِ
وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرْكَبُونَ﴾
(۱۵۲:۳)

(اللہ تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ (فتح) تم سے پورا کر ہی دیا جبکہ تم دشمن کو اس کے حکم سے تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم نے نامردی دکھلائی (یعنی ذرہ چھوڑ دیا) اور معاملہ میں تنازعہ پیدا کر دیا اور (امیر لشکر اور حضور ﷺ) کی نافرمانی کی جب تم نے وہ چیز دیکھی جس کو تم چاہتے تھے (یعنی مال غنیمت)

(۶) عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل کی ممانعت:

دشمن کے لشکر میں اگر عورتیں یا بچے اور بوڑھے شامل ہوں اور معرکہ کارزار میں موجود ہوں تو بھی مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ ارشاد نبوی ہے:-

((۱)) لَا تَقْتُلُوا امْرَأَةً وَلَا صَبِيًّا وَلَا
شَيْخًا قَانِيًا--))
(مکتوٰۃ۔ کتاب الجہاد۔ باب القتال فی الجہاد)

(۲) اور حضرت عبد اللہ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:-

(رسول اللہ ﷺ کے غزوہ میں ایک دفعہ میدان جنگ میں ایک مقتولہ عورت کو پایا گیا تو آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کے قتل کرنے سے منع فرمادیا۔“)

((وَجَدْتُ امْرَأَةً مَقْتُولَةً فِي بَعْضِ مَغَازِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصَّبِيَّانِ))
(بخاری۔ کتاب الجہاد والسریر۔ باب قتل النساء فی الحرب)

(۳) آپ ﷺ نے ایک دفعہ میدان جنگ میں عورت کی ایک لاش پڑی دیکھی تو ناراض ہو کر فرمایا:-

(مَا كَانَتْ هَذِهِ تَقَاتِلُ فِيمَنْ يِقَاتِلُ -)
(ابن ماجہ۔ کتاب الجہاد۔ باب الغارة والبيات و قتل النساء والصبيان)
(کس نے قتل کیا۔ یہ توڑنے والوں میں شامل نہ تھی۔)

اس حدیث سے صرف یہی معلوم ہوتا کہ میدان جنگ میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانا ممنوع ہے۔ بلکہ اس حدیث سے مقاتل اور غیر مقاتل لوگوں کے حقوق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

جنگ احد میں قریش مکہ کے سپہ سالار ابوسفیان کی بیوی ہندہ اور دیگر ۱۴ عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔ ان کا اصل کام یہ تھا کہ وہ بھاگنے والوں کو عار دلائیں تاکہ پورا لشکر جم کر لڑے اور فتح حاصل ہو۔ یہ عورتیں جنگ شروع ہونے سے پیشتر جلوس کی شکل میں دف بجاتی ہوئی سامنے آئیں۔ یہ بدر کے مقتولین کے مریھے پڑھ پڑھ کر کفار کے جوش انتقام کو بھڑکار رہی تھیں۔ پھر کبھی نسلی فخر و مباہات اور رجز کے اشعار پڑھنے کی خدمات بھی انجام دے رہی تھیں۔

جنگ شروع ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار بلند کر کے فرمایا۔ ”کون ہے جو آج

اس تلوار کا حق ادا کرے گا؟“ سب صحابہ رضی اللہ عنہم اس سعادت کے آرزو مند تھے اور دیکھ رہے تھے کہ انتخاب نگاہ کس پر پڑتی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ تلوار حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو عطا کی۔ آپ ﷺ پہلوانوں کی طرح بڑی ناز و ادا سے اڑتے ہوئے بڑھے انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ چال عام حالات میں پسند نہیں مگر آج بہت پسند ہے۔ صفوں کو زیر کر کے کشتوں کے پستے لگاتے چلے جا رہے کہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ جو عورتوں کی سالار تھی سامنے آگئی آپ کی تلوار اس کے سر تک پہنچ چکی تھی کہ آپ ﷺ کا فرمان یاد آ گیا آپ نے فوراً تلوار روک لی اور

فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے شایان شان نہیں کہ ایک عورت کے خون سے رنگین ہو“۔

(طبری۔ ج ۱۔ غزوہ احد)

(۷) مقاتل اور غیر مقاتل:

مقاتل ہر وہ شخص ہے۔ جو عملاً جنگ میں حصہ لے رہا ہو یا کم از کم عرفاً جنگ میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے اشخاص سے قتال جائز ہے۔ اور ہر وہ شخص جو عرفاً جنگ کے قابل نہ ہو یا مزاجاً جنگ میں حصہ لینے کا مزاج نہ رکھتا ہو وہ غیر مقاتل ہے۔ اور اس کا قتل جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں مندرجہ ذیل اشخاص کو غیر مقاتل قرار دیا ہے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں۔ درویش اور صوفی قسم کے لوگ، معبدوں سے تعلق رکھنے والے، اندھے، لنگڑے لوگ اور دوسری قسم کے معذور لوگ۔ بعد میں خلفائے اسلام نے غیر مقاتل میں کاشتکاروں اور تاجروں کو بھی شامل کر دیا تھا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مزاج طبعاً جنگ سے لگا نہیں کھاتا۔

(۸) جنگ کے دوران ہر وقت مسلح رہنا چاہیے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَذُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ
أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ
مَيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ
بِكُمْ أَدَىٰ مَن مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَنْ
تَضَعُوا أَسْلِحَتِكُمْ. وَخُذُوا حِذْرَكُمْ﴾
(۱۰۱:۳)

آیت مذکورہ میں ہتھیار اتارنے کی صرف دو صورتوں میں اجازت ہے۔ بارش ہو رہی ہو۔ کپڑے اور ہتھیار وغیرہ بھیگ رہے ہوں یا کوئی شخص بیماری کی وجہ سے ہتھیار بند رہنے کا متحمل نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہتھیار اتارنے کی اجازت نہیں۔ اسی لیے آخر میں تاکید پھر فرمادیا **وَخُذُوا حِذْرَكُمْ** اور **وَخُذُوا حِذْرَكُمْ** کے الفاظ بڑے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے معنی ہوشیار اور چوکنا رہنا مسلح رہنا اور اپنے بچاؤ کے تمام ذرائع اختیار کرنا ہے۔ مورچوں کی

حفاظت کرنا اور ان میں پناہ پکڑنا، لڑائی سے پیشتر سامان جنگ تیار رکھنا، دشمن کے نقل و حرکت سے باخبر رہنا اس کا مدد اور سوجنا، دشمن کی بے خبری میں حملہ کے لیے تیار رہنا سب کچھ خُذُوا حِذْرَکُمْ کے مشہوم میں سما جاتا ہے۔

دور نبوی میں اسلحہ جنگ ہر سپاہی کی انفرادی ملکیت ہوتا تھا۔ لیکن آج اسلحہ جنگ مہیا کرنا حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ لہذا اسلحہ جنگ تیار کرنے والے کارخانوں، سنٹوروں کا تحفظ اور بچاؤ بھی خُذُوا حِذْرَکُمْ میں آتا ہے۔ غرض قوم و ملک کا تحفظ افراد و فوج کے تحفظ کی تدابیر، آلات جنگ کا تحفظ، لڑائی کے منصوبوں کو راز میں رکھنا۔ سب کچھ اس حکم میں داخل ہے۔ آج دشمن سب سے پہلے اسلحہ کے محفوظ ذخائر کو اچانک حملے کے ذریعہ تباہ کر دیتا ہے۔ ان سب امور کی طرف اس آیت میں مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے۔

(۹) میدان جنگ سے فرار گناہ عظیم ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمْ إِلَّا ذُبَابًا وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ يَكُونُ مِنَ الَّذِينَ هُمْ يَكْفُرُونَ﴾
 (اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔ اور جو شخص جنگ کے روز، سوائے اس کے کہ پینتر بدل کر لڑنا چاہتا ہو یا اپنی فوج سے جا ملنا چاہتا ہو، دشمن سے پیٹھ پھیرے گا تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔)

وجہ یہ ہے کہ اسلام میں بھاگنے، ہتھیار ڈالنے اور شکست کھانے کا کوئی تصور نہیں۔ مسلمان کے لیے بس دو ہی راستے ہیں یا تو فتح یاب ہو کر واپس لوٹے اور غازی کہلائے۔ یا پھر شہید ہو کر شہادت کا بلند مقام حاصل کرے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾
 (اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرے، پھر مارا جائے یا غالب آجائے۔ تو دونوں صورتوں میں ہم اس کو بہت بڑا اجر دیں گے۔)

جنگ سے فرار کی کوئی شکل اللہ نے نہیں بتائی البتہ اس کا گناہ بہت بڑا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ سے فرار انفرادی جرم نہیں جب ایک شخص راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھیوں کے دلوں میں بھی خوف کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح دو چار آدمیوں کے بھاگ کھڑا ہونے سے پوری ٹولی کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ اس طرح صف یعنی محاذ میں شکاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دشمن اس شکاف سے داخل ہو کر پورے لشکر کو گھیرے میں لے سکتا ہے۔ اسی لیے محاذ سے بھاگنے والوں کو دنیا کی ہر فوج میں گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

فرار ہونے والا سپاہی اپنی ہی موت کا سبب نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کے تحفظ و بقا پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ ماؤں بہنوں، بیٹیوں کی عصمت کے نگہبان ہاتھ جب دشمن کی ہتھکڑیاں پہن لیں یا بھاگتے ہوئے مارے جائیں تو پھر قوم کی ماؤں بہنوں کی عصمت بھی پناہ سے عاری ہو جاتی ہے۔

(۱۰) معرکہ کارزار میں نماز کی ادائیگی:

﴿وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِزْبَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ﴾ (۱۰۲:۳)

(اور اے پیغمبر ﷺ! جب تم ان مجاہدین کے لشکر میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ تسلیح ہو کر کھڑی رہے۔ جب وہ سجدہ ادا کر چکیں تو پرے ہو جائیں۔ پھر دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی، ان کی جگہ آجائے اور ہوشیار اور مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کرے۔)

جنگ کے دوران نماز صرف دو رکعت ہوتی ہے۔ (یعنی قصر اس کی ادائیگی کی صورت):

(۱) آدھی فوج امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ کر مقابلے کو چلی جائے۔ مگر ہتھیار نہ اتارے۔

(۲) بقایا آدھی فوج امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ لے۔

(۳) اب امام کی دو رکعت پوری ہو گئیں۔ اور فوج کی ایک ایک بقایا ایک رکعت وہ خود اکیلے اکیلے حسب موقعہ پڑھ لیں۔

(۴) شام کی نماز ۳ رکعت ہی رہے گی۔ پہلی فوج دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے گی اور دوسری ایک رکعت۔ بقایا اکیلے پڑھ لیں۔

(۵) اگر جماعت کی فرصت نہ ملے۔ تو اکیلے پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔ سواری سے اترنے کا موقع نہ ملے تو سواری پر ہی اشارہ سے پڑھ لی جائے۔

دور حاضر میں فوج کے مختلف شعبوں میں نماز اور قصر کے احکام مختلف ہوں گے۔ مثلاً ایک ہوائی جہاز کا پائلٹ محض اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ جب کہ اس جہاز میں سوار دوسرے فوجی اپنی جگہ پر بیٹھے ارکان نماز بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اور ٹینک کے اندر بیٹھنے والے غالباً نماز با جماعت بھی ادا کر سکتے ہیں۔ غرض موقع و محل کی مناسبت سے نماز کی جو صورت بھی عملی طور پر ممکن ہو اسے ہی اختیار کرنا چاہیے لیکن کسی صورت میں بھی نماز کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۱) کھیتوں، باغات اور درختوں کی تباہ کاری کی ممانعت:

بعض دفعہ دشمن کسی جنگی تدبیر یا فوجی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض دہشت پھیلانے کے لیے وسائل خوراک کو تباہ و برباد اور شہری املاک کا نقصان کر دیتا ہے۔ مکانات کو منہدم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بے جا ضیاع اموال سے آپ ﷺ نے منع فرما دیا۔

اب ہم رسول اللہ ﷺ کی وہ ہدایات درج کرتے ہیں۔ جو آپ نے موتہ کی طرف لشکر روانہ کرتے وقت ارشاد فرمائیں۔ یہ دراصل میدان جنگ سے تعلق رکھنے والے جملہ احکام کا خلاصہ ہے۔ آپ ﷺ نے فوج کو واداع کرتے ہوئے فرمایا۔ ”پہلے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر قبول کر لیں تو لڑنے کی ضرورت نہیں“۔ پھر حسب ذیل احکام دیئے:

((أَوْصِيَكُمْ بِتَقْوَى اللَّهِ وَلِمَنْ مَعَكُمْ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا أَعْزُوا بِسْمِ اللَّهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ لَا تَعْدُوا وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا وَلَا امْرَأَةً وَلَا كَبِيرًا فَأَيْنَا وَلَا مُنْعَزِلًا بِصَوْمَعَةٍ وَلَا تَقْرَبُوا الْخَلَا وَلَا تَقْطَعُوا شَجْرًا وَلَا تَهْدُوا بِنَاءً))

(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں (۱) اپنے اللہ کے ساتھ پرہیزگاری کی (۲) مسلمانوں کے ساتھ نیکی کرنے کی (۳) جو اللہ سے کفر کرے اس سے اللہ کے نام سے فی سبیل اللہ جہاد کی (۴) وعدہ شکنی نہ کرنا (۵) بچے عورت بوڑھے کھوسٹ اور گوشہ نشینوں کو قتل نہ کرنا (۶) درخت نہ کاٹنا اور نہ باغ کے

نزدیک جانا اور عمارتوں کو نہ ڈھانا۔)

مگر جب یہ چیزیں کسی فوجی ضرورت میں رکاوٹ بن رہی ہوں۔ تو ان کو دُور کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ بنو نضیر کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں کو یہودی چند کھجوروں کا کاٹنا پڑا تھا۔ مسلمان اس سلسلہ میں متردد تھے کہ آیت نازل ہوئی۔

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْنَةٍ أَوْ نَرَكْتُمْوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۵/۵۹) ڈالے یا ان کی جڑوں پر قائم رکھے تو یہ اللہ کے حکم سے تھا۔)

اور مفسرین نے یہ بھی تصریح کی ہے۔ کہ لینہ کھجور نکلی قسم کی کھجور تھی۔ جس کے درخت کاٹنے گئے تھے۔ اچھی قسم مثلاً۔ عجوہ اور برنی کے درختوں کو کاٹنے سے احتراز کیا گیا تھا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۶۶)

(۱۲) صبر و ثبات اور ذکر الہی:

اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مسلمان مادی مسائل سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد بھی اس کا انجام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے میدان جنگ میں ثابت قدمی الہی نصرت کا طلب گار رہتا ہے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَبِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۲۵/۸) (مسلمانو! جب تمہاری کسی گروہ سے ٹک بھیر ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفت یہ بیان فرماتے ہیں:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلِيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾ (۱۲۳/۹) (اے ایمان والو! اپنے نزدیک والے کافروں سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں۔)

گویا کفار سے جنگ کے وقت صبر و ثبات کے یہ معنی ہیں کہ ان پر تازہ توڑ حملے کیے جائیں۔ وہ مسلمانوں میں کسی قسم کی کمزوری محسوس نہ کریں۔ اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہنی چاہیے جب تک کہ فتح حاصل نہ ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ میں خطبہ جو دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:-

(اے لوگو! (۱) دشمن سے بھڑنے کی آرزو نہ کرو۔ (صلح پسند رہو)۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے سلامتی مانگو۔ (۳) اور جب لڑائی آن پڑے تو صبر کیے رہو۔ اور یاد رکھو کہ بہشت تلواروں کے سایہ تلے ہے۔ پھر یوں دعا کی: ”اے اللہ قرآن نازل کرنے والے! بادل کو چلانے والے! فوجوں کو شکست دینے والے! ان کافروں کو شکست دے اور ہم کو ان پر فتح دے۔“ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے باب ہذا زیر عنوان مسلمان اور شکست)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ
الْعَدُوِّ وَاسْتَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا
لَقَيْتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ
تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ قَالَ: اللَّهُمَّ
مُنزِلَ الْكِتَابِ وَمَجْرَى السَّحَابِ وَهَازِمَ
الْأَحْزَابِ أَهْزِمْهُمْ وَأَنْصِرْنَا عَلَيْهِمْ﴾
(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب كان النبي اذا
الم يقاتل اول النهار)

(۱۳) پابندی عہد:

اسلام میں عہد کی پاسداری اتنی ہی اہم ہے۔ کہ عین میدان جنگ میں بھی اس کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے خواہ اس سے کتنا ہی نقصان ہو رہا ہو۔ جنگ سے پیشتر دو صحابی ابو حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ابو حنیبلہ رضی اللہ عنہ مکہ سے مدینہ جا رہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روک لیا پھر جب ان دونوں نے شریک جنگ نہ ہونے کا عہد کیا تب جا کر ان کی جان چھوٹی۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کے پاس سامان اسلحہ اور افرادی قوت ہر چیز کی شدید کمی تھی یہ دونوں صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت چاہی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وعدے کا پورا کرنا ہر حال میں مقدم ہے۔ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتے ہیں۔“ (مسلم۔ کتاب۔ الجہاد والسیر۔ باب الوفاء بالعہد)

(۱۴) میدان جنگ اور رجز یہ اشعار:

رجز یہ اشعار کا مقصد فوج کو جوش دلانا ہوتا ہے۔ جنگ حنین میں مسلمان فوج کے پاؤں اکھڑنے لگے تو آپ بلند آواز سے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔
أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبُ
أَنَا إِنْ عُبِدَ الْمَطْلَبُ
(میں سچا نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں؛ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں)

اسی طرح جنگ خندق کے دوران مٹی ڈھور ہے تھے تو ترنم سے درج ذیل اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اَهْتَدَيْنَا
وَلَا تَصَدَّقْ وَلَا صَلِّنَا
وَاَنْزِلْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا
وَتُبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَا قِيْنَا
اِنَّ الْاَوْلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا
اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب حفز الخندق)

ترجمہ: (اے اللہ! اگر تو ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہمیں کیسے مل سکتی تھی اور ہم کیونکر نمازیں ادا کرتے اور زکوٰۃ دے سکتے تھے۔ تو ہی ہم پر تسلی اور اطمینان نازل فرما۔ اور اگر دشمن سے مذہب بھڑھو تو ہمیں ثابت قدم رکھ دشمن ہم پر بلا و جرح نہ آیا ہے۔ جب بھی انہوں نے فتنہ (جنگ) کا ارادہ کیا ہم انکار ہی کرتے رہے۔)

آپ ﷺ آخری مصرعہ پر زور دے کر پڑھتے اور دوبارہ سے بارہ پڑھتے تھے۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کے پاس رجزیہ اشعار کا نعم البدل بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے نعرہ تکبیر اور یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ مسلمانوں کے بلند آواز سے اللہ اکبر کہنے سے دشمن کا دل سہم جاتا ہے۔ جنگ بدر احد احزاب اور حنین میں دعوت مبارزت دینے والوں کو جن مسلمانوں نے جنم واصل کیا اور کرنے کے ساتھ ہی بلند آواز سے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ جب خیبر پہنچے تو فرمایا:-

اللہ اکبر عَظِيْمًا عَظِيْمًا۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب التکبیر عند الحرب)

(۱۵) شان و شوکت کا مظاہرہ:

مسلمانوں کے لئے عام حالات میں تکبیرانہ چال منع ہے مگر جب دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے میدان جنگ میں اختیار کی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی حمایت میں اختیار کی جاتی ہے۔

جنگ اُحد میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی تلوار بلند کر کے فرمایا: کون اس کا حق ادا کرے گا؟ سب صحابہ اس سعادت کے حصول کے لیے متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ کی نگاہ انتخاب حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو اس عزت افزائی نے بجا طور پر فخر کا موقع بخشا۔ آپ پہلوانوں کی طرح اکڑتے ہوئے صف سے میدان کی طرف نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: یہ چال ناپسندیدہ ہے۔ لیکن اس وقت یہ بھی اللہ کو پسند ہے۔ (طبری۔ ج ۱۔ غزوة اُحد)

اسلامی جھنڈا:

اسی طرح کا مظاہرہ مکہ میں داخلے کے وقت لشکر اسلام نے کیا۔ آپ ﷺ نے کفار مکہ کے سپہ سالار ابو سفیان کو بلند مقام پر کھڑا کیا اور افواج اسلام کو حکم دیا کہ وہ بڑی آن بان سے اپنے جھنڈے بلند کیے سامنے سے باری باری گزریں۔ حالانکہ عام حالات میں یہ باتیں فخر و تکبر پر معمول کی جاتی ہیں۔

جھنڈے کو بلند رکھنا بھی افواج کے حوصلے بلند رکھتا ہے۔ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے اپنا جھنڈا ایک بلند مقام پر گاڑنے کا حکم فرمایا تھا اور آپ ﷺ کا جھنڈا قیس بن سعد انصاری اٹھائے ہوئے تھے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب ما قبل فی لواء النبی)

جب آپ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا۔ تو خیبر کا ایک مضبوط ترین قلعہ سر ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں کل جھنڈا اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر خیبر فتح ہوگا۔ چنانچہ دوسرے دن آپ ﷺ نے جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا۔ جنہوں نے یہ قلعہ بھی سر کر لیا۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

اسلام میں جھنڈے کی ابتدا غزوة خیبر سے ہوئی۔ اور یہی وہ پہلا معرکہ ہے جس میں مسلمانوں نے کچھ علاقہ سر کیا تھا۔ اس سے پہلے کی جنگیں بیشتر مدافعتی قسم کی تھیں۔ اس کے بعد ہر جنگ میں جھنڈا قومی شعار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ (اسلام کے قوانین صلح و جنگ)



اسلام کے قوانین صلح و جنگ (۲)

فتح مکہ کے بعد

(۱) رنگ رلیوں کی بجائے سجدہ شکر:

دنیا کا یہ پرانا دستور ہے اور آج تک موجود ہے کہ جب فوج فتح حاصل کرتی ہے تو اس خوشی میں اچھلتی ہے کودتی ہے، ناچتی ہے، گاتی ہے، پتی ہے پلاتی ہے اور خرمستیاں کرتی ہے لیکن حضور جب حجاز کا مرکزی شہر فتح کرتے ہیں تو آپ کو یہ حکم نہیں ملتا کہ شہر میں چراغاں کیا جائے، کوئی جلوس نکالا جائے یا جلسے اور مظاہرے کیے جائیں۔ حکم ہوتا ہے تو یہ کہ:-

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ (۳/۱۱۰) تسبیح کیجئے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیجئے بیشک وہ معاف کرنے والا ہے۔

مسلمانوں نے آپ ﷺ کو فتح مکہ کے دن اس حال میں دیکھا کہ آپ کا سر مبارک پالان پر جھکا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے رونیں رونیں سے بے انتہا انکسار ظاہر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھی پالان کے وسط کو چھو رہی تھی۔ آپ ﷺ کو اس فتح کی اہمیت کا احساس جس قدر زیادہ ہوتا اتنا ہی آپ ﷺ اپنی سواری پر خدا کے حضور جھکتے جاتے۔

(ابن ہشام ج ۳ ص ۲۸)

فتح کے بعد اس بنیادی فرق کی وجہ یہ ہے کہ کافر اور مادہ پرست فتح کو اپنے مادی وسائل کا نتیجہ سمجھتا ہے جبکہ مسلمان تمام مادی وسائل کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی فتح کا اصل سبب اللہ کی مہربانی سمجھتا ہے۔ لہذا فتح کے بعد اسے شکر بھی اللہ تعالیٰ کا کرنا چاہیے۔

(۳) اموال غنیمت پر حدود و قیود:

فوجیں بالعموم جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران بھی دشمن کی املاک سے فائدہ اٹھانا

اور ان کو غصب کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ پھر فتح کے بعد تو ایک بالادست قوت کے لحاظ سے اس حق کا خوب استعمال کرتی ہیں۔ سالار لشکر کی طرف سے اس بات کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ مثلاً تین دن تک فوج کو اجازت دی جاتی ہے۔ کہ وہ دشمن کا جو نسا اور جتنا مال سمیٹ سکتی ہے سمیٹ لے اور ایسی لوٹ مار کو اموال غنیمت کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پیشتر عربوں کا محبوب پیشہ یہی لوٹ مار تھا۔ محنت کی کمائی سے وہ لوٹ مار سے حاصل شدہ دولت کو بہت عزیز سمجھتے تھے۔ عرب جیسے بے آب و گیاہ علاقے میں وسائل معاش بہت کم تھے۔ لہذا قبائل عرب ایک دوسرے کو ہی نہیں اکثر تجارتی قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔ لوٹے ہوئے مال کی محبت ان کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ چنانچہ اسلام لانے کے بعد بھی اموال غنیمت سے محبت مسلمانوں میں بسا اوقات غیر شعوری طور پر ابھر آتی تھی۔ اور حقیقت میں دیکھا جائے تو جنگ احد میں مسلمانوں کو ابتداءً جو شکست ہوئی۔ تو اس کا اصل سبب یہی اموال غنیمت سے محبت تھی۔ اسلام نے اموال غنیمت سے اس اندھی محبت کا علاج یوں کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر بتا دیا کہ:۔ جو شخص اموال غنیمت کے لیے لڑتا ہے۔ اس کا جہاد، جہاد نہیں اسے آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا۔

(نسائی کتاب الجہاد۔ باب من غزا بلتمس الاجر)

اسلام نے اموال غنیمت کو کلیتاً حرام قرار نہیں دیا وجہ یہ تھی کہ فوج کو تحفہ ہیں دینے کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ البتہ اس پر اتنی پابندیاں اور حدود و قیود عائد کر دیں کہ اموال غنیمت کا وہ مفہوم ہی نہ رہ گیا۔ جو دور جاہلیت میں یا آج بھی بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ ان حدود و قیود کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) اموال غنیمت اور لوٹ کا فرق:

اموال غنیمت صرف وہ مال سمجھا جائے گا۔ جو کوئی فوجی دستہ مرکز کی طرف سے لڑنے کی اجازت اور لڑنے کے بعد حاصل کرے گا۔ اگر کوئی فوجی دستہ مرکز کی اجازت کے بغیر کسی کافروں کے دستہ سے لڑ کر فتح یاب ہو کر مال حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ مال غنیمت نہیں بلکہ غصب ہوگا۔ اسی طرح اگر مرکز کی طرف سے اجازت تھی لیکن لڑنے سے پہلے دشمن کے اموال کو لوٹ لیا گیا تو ایسا لوٹا ہوا مال بھی غنیمت کی تعریف سے نکل جائے گا۔

سریہ ۲ھ میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جو مال غنیمت لائے۔ اس پر آپ ﷺ

نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ یہ چھڑپ آپ ﷺ کی اجازت بغیر ہوئی تھی۔
 ہوا یہ تھا کہ چند آدمی تجارت کا مال لیے شام سے واپس آرہے تھے۔ اس دستہ نے ان
 پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا ایک آدمی مر گیا اور دو گرفتار ہوئے اور مال بھی ہاتھ آیا۔ عبد اللہ ﷺ نے واپس
 مدینہ آکر واقعہ بیان کیا اور مال غنیمت بھی پیش کیا۔ آپ ﷺ سخت برہم ہوئے اور فرمایا:-

((صَنَعْتُمْ مَالَكُمْ تَوْمَ مَرُوا بِهِ وَقَاتَلْتُمْ فِيهِ الشُّهُرَ الْحَرَامَ وَلَمْ تَوْمَرُوا بِقِتَالِ-))
 (تم نے وہ کام کیا جس کا تمہیں حکم نہیں دیا گیا اور ماہ حرام میں تم لڑے اس میں لڑنے
 کا حکم نہ تھا۔)
 (طبری ج ۱۱، صفحہ ۱۰۰)

قریش نے اس لڑائی کو خوب اُچھالا کہ محمد ﷺ اور اس کے اصحاب ﷺ نے حرمت کے
 مہینے کو حلال کر دیا۔ جس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے دیا:-

﴿وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الشُّهُرِ الْحَرَامِ..... إِنْ اسْتَطَعُوا﴾ (۲: ۲۱۷)

(ترجمہ: اللعالمین جلد ۲ ص ۱۸۷)

وحی الہی کی رو سے معاملہ میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ تو آپ ﷺ نے مال غنیمت قبول
 کر لیا۔ قیدیوں کو چھوڑ دیا اور مقتولین کا خون بہا ادا کر دیا۔

دوران جنگ اگر رسد میں کمی واقع ہو جائے تو عموماً افواج کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ کہ وہ
 ادھر ادھر سے لوٹ مار کر کے خوراک کا سامان حاصل کر لیں۔ اور اس میں کچھ قباحت نہیں سمجھی جاتی
 تھی۔ آپ ﷺ نے ایسی حاصل کردہ خوراک کو بھی لوٹ مار اور حرام قرار دیا۔ ابو داؤد میں ایک
 انصاری سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ سفر پر گئے۔ خوراک کی سخت قلت تھی۔ اتفاق سے بکریوں
 کا ایک ریوڑ نظر آیا تو سب اس پر لوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو دیکھا کہ
 کہ ہڈیوں میں گوشت پک رہا ہے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں کمان تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے
 ہڈیاں الٹ دیں۔ پھر فرمایا:- ”ایسی لوٹ مار کا گوشت مردار کے برابر ہے۔“

(ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی النہی فی الشہی اداکان فی الطعام قلۃ)

(۲) اموال غنیمت سے کچھ چھپا لینا بدترین خیانت ہے:

انفرادی طور پر لوٹا ہوا مال سارے کا سارا امیر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یا مقررہ

شور میں جمع کرایا جائے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:-

﴿كَانَ عَلِيٌّ يُقَالُ لَهُ كِبْرُكْرَةٌ فَمَاتَ
وَسَلَّمَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ كِبْرُكْرَةٌ فَمَاتَ
فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
هُوَ فِي النَّارِ فَذَهُبُوا يَنْظُرُونَ إِلَيْهِ
فَوْحَذُوا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا﴾
(بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب القليل من الغلول)

(آنحضرت ﷺ کے زمانہ پر ایک آدمی متعین تھا۔ جس کا نام کر کرہ تھا (وہ حبشی تھا اور تہامہ کے حاکم نے آپ ﷺ کو بطور تحفہ بھیجا تھا) وہ مر گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ دوزخ میں ہے۔ لوگوں نے اس کو چا کر دیکھا (اس کے مال اسباب کی تلاشی لی) تو لوٹ کے مال کی ایک کھلی اس میں پائی جو اس نے چرائی تھی۔)

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ:-

((ثُمَّ انصرفت مع رَسُولِ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُ عَبْدٌ يُقَالُ لَهُ مِدْعَمٌ أَهْدَاهُ لَهُ أَحَدَ بَنِي الطَّبَابِ فَيَنْمِئُ هُوَ يَحْطُ رَجُلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهُ سَهْمٌ عَائِرٌ حَتَّى أَصَابَ ذَلِكَ الْعَبْدَ - فَقَالَ النَّاسُ هَبْنَاهُ لَهُ الشَّهَادَةَ - فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلَى وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنْ الشَّمْلَةَ الَّتِي أَصَابَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ - لَمْ تُضْبَحْهَا الْمَقَاسِمُ تُشْتَعَلُ عَلَيْهِ نَارٌ - فَجَاءَ رَجُلٌ حِينَ سَمِعَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِرَاكِ أَوْشِرَاكَيْنِ فَقَالَ! هَذَا شَيْءٌ كُنْتُ أَصْبَتُهُ - فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(پھر ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ (خیبر) واپس لوٹے اور وادی القری میں آئے۔ آپ کے ساتھ ایک غلام تھا جسے مدعم کہتے تھے۔ یہ غلام آپ ﷺ کو ضباب کے ایک شخص نے بطور تحفہ بھیجا تھا یہ غلام آپ ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا اتنے میں ایک ناگہانی تیر اس کو آگیا۔ جس سے وہ مر گیا۔ لوگ کہنے لگے اس کو مبارک ہو شہید ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں نہیں۔ اس نے ایک چادر جو خیبر کے دن تقسیم سے پہلے چرائی تھی وہ آگ ہو کر اس کو جلا رہی ہے۔ یہ سن کر ایک شخص آپ کے پاس جوتی کا ایک تمہہ یا دو تہے لے کر آیا۔ اور کہنے لگا میں نے یہ لوٹ کے مال سے لیے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا (اگر تو داخل نہ کرتا) تو یہ ایک تمہہ یا دو تہے آگ بن جاتے، قیامت میں تجھ کو

شِرَاكٌ اَوْ شِرَاكَيْنِ مِنْ نَارٍ -)) جلاتے۔))

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:-

((سَمِعْتُ اَبِي يُحَدِّثُ عَنْ غَمْرِ بْنِ الْخَطَّابِ
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "قَالَ اِذَا
وَجَدْتُمْ الرَّجُلَ قَدْ عَدَلَ فَاخْرُقُوا مَتَاعَهُ
وَاصْرِبُوهُ -))
(ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی عقوبة الغال)

(میں نے اپنے باپ (عبداللہ بن عمر) سے
وہ عمر بن الخطاب سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکرم
سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ "جب تم کسی کو دیکھو کہ اس نے
مال غنیمت سے کچھ چھپا لیا ہے۔ اس کا
سامان جلا دو اور اسے بدنی سزا دو۔)

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے "چور کے لیے موقع کے لحاظ سے
تین سزائیں بھی تجویز کی گئیں۔ (۱) اس کے سامان کو جلا دیا جائے۔ (۲) مال غنیمت سے اس کا
حصہ نہ نکالا جائے۔ (۳) اسے بدنی سزا بھی دی جائے۔

اور سرہ بن جندب..... کہتے ہیں کہ:-

((كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَقُولُ: "مَنْ كَتَمَ غَالًا فَإِنَّهُ
مِثْلُهُ -)) (ابوداؤد۔ حوالہ ایضاً) ڈالنے والا بھی اسی چور ہی کی مانند ہے۔"

البتہ ایسی اشیاء جو خوراک سے تعلق رکھتی ہوں اور جلد خراب ہو جانے والی ہوں ان
کے استعمال کی اجازت ہے۔ یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:-

((كُنَّا نَصِيبُ فِيهِ مَعَازِنَا الْعَسَلَ
وَالْعَنْبَ فَمَا كُلُّهُ وَلَا نَرْفَعُهُ -))
(بخاری کتاب الجہاد۔ باب ما یصیب من الطعام)

من ارض الحرب)

(۳) سلب:

یعنی مقتول کے بدن پر جو سامان ہو (کپڑے، ہتھیار وغیرہ) وہ مال غنیمت میں شامل
نہیں ہوگا نہ اس سے ٹمّس نکالا جائے گا بلکہ وہ قاتل کو ملے گا۔

امام بخاری نے کتاب الجہاد میں اس عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

(۴) خمس:

جمع شدہ مال میں سے پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کرنے کے بعد باقی مال تقسیم ہوگا۔ ارشاد باری ہے:-

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ (۴۰/۸)

(اور جان رکھو جو چیز تمہیں غنیمت میں ملے تو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔)

(۵) اموالِ فتنے:

ایسا مال جو بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے وہ مال غنیمت نہیں بلکہ مالِ فتنے ہے اور یہ سارے کا سارا بیت المال کی ملکیت ہوگا۔ ارشاد باری ہے:-

﴿مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ (۶/۵۹)

(جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے بغیر لڑائی کے دلوادیا ہے۔ وہ اللہ کے پیغمبر کے (پیغمبر کے) قرابتداروں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے اور مسافروں کے لیے ہے۔)

اب ان شرائط کے تحت جو مال اکٹھا ہوتا ہے۔ وہ حلال اور طیب ہے۔ اسی کی تقسیم ہوگی۔ یہ اموال بھی سپہ سالار کی ذاتی جاگیر نہیں ہوتی۔ وہ اس میں سے صرف حصہ رسد ہی لے سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کسی اعرابی نے برسر عام یہی اعتراض کیا تھا کہ اموالِ غنیمت سے جو کچھ حصہ رسد ملا ہے۔ اس سے قیص تو بن نہیں سکتی تھی۔ آپ... کی کیسے بن گئی؟ مگر آپ نے قطعاً نہ منایا بلکہ معقول جواب سے اس کی تسلی کر دی۔

ہاں امیر لشکر کو یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ تالیفِ قلوب کے لیے کچھ لشکریوں کو حصہ زیادہ دیدے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب امن الدلیل علی ان الخمس لنواب المسلمین)

ان چند در چند قیود کے بعد بھی مالِ غنیمت کے حصول کے جذبہ کی حوصلہ شکنی ہی کی گئی ہے۔ جنگِ احد اور حنین میں شکست کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی حصولِ غنیمت کا طمع

تھا۔ جسے قرآن کریم نے ”بتغنون عرض الدنيا“ کے ناپسندیدہ الفاظ سے بیان فرمایا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مال غنیمت کے لیے جہاد کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی اجر نہیں۔ اور ایسے مجاہد جو مال غنیمت کی حرص کے بغیر جہاد کرتے ہیں۔ غازی ہو کر واپس ہوں اور اموال غنیمت سے حصہ پالیں ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو تہائی اجر انہوں نے وصول پایا۔ اب صرف تیسرا حصہ اجر انہیں آخرت میں ملے گا اور جو مجاہد لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ اس کا مکمل اجر آخرت میں اُسے ملے گا۔ (نسائی۔ کتاب الجہاد۔ باب ثواب السرية التي تحقق)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شہید زندہ غازی سے، جس نے غنیمت سے حصہ پایا ہے، بہت زیادہ افضل ہے۔

دور حاضر اور اموال غنیمت:

رسول اللہ ﷺ کے دور میں باقاعدہ تنخواہ دار افواج نہیں تھیں۔ لہذا انہیں اپنے اخراجات اور سامان جنگ کی تیاری کے لیے اموال غنیمت سے حصہ مل جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فوج کا باقاعدہ محکمہ قائم ہو گیا۔ لشکر یوں کو تنخواہیں ملنے لگیں تو اموال غنیمت بھی بیت المال کا حق قرار پایا۔ اور یہ دستور آج تک چلا آتا ہے۔ سب ”اسلاب“ بھی سٹور میں جمع ہیں اور حکومت اعلان کرتی ہے کہ مثلاً ہر فوجی ایک ایک کوٹ یا ایک ایک گھڑی اپنے پاس رکھنے کا حق دار ہے۔ باقی اسباب جمع ہوگا۔ بہر حال ایسے ذیلی قوانین حسب موقع و محل بنائے جاسکتے ہیں۔

عصمت کی پاسبانی:

فاتح قوم کا یہ بھی حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ مفتوح قوم کی عورتوں کی بے دریغ عصمت دری کریں اور اس میں اپنی برتری محسوس کرتی ہیں اسلام کی نظر میں یہ جتنا بڑا جرم عام حالات میں ہے اتنا ہی میدان جنگ میں اور فتح کے بعد بھی ہے۔

فوجیوں کو بسا اوقات بہت مدت گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ جن سے ان کی جنسی بھوک تیز ہو جاتی ہے۔ تو فتح کے بعد وہ اس سلسلے میں ایسی وحشت و بربریت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ کبچہ منہ کو آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا علاج یہ سوچا تھا کہ ہر فوجی کو زیادہ سے زیادہ ۴ ماہ بعد چھٹی ضرور دی جائے۔ تاکہ فوج میں فحاشی کا رجحان نہ پھیل سکے۔

۴ ماہ کی مدت انسانی نفسیات کا جائزہ لے کر مقرر کی گئی تھی بلکہ سالار کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ فوج کے اخلاق اور کردار کا پورا پورا خیال رکھے۔ جو فوجی مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتا تو اُسے سخت سزائیں دی جاتیں۔ فوجیوں کے اندر مکارم اخلاق پیدا کرنے میں ایک تو حرمت شراب نے بڑی مدد کی دوسرے اس بات سے بھی بڑی مدد ملی کہ جب کوئی سپاہی اپنے خاندان سے دور مقام پر متعین ہوتا تو وہاں چار مہینے رہنے کے بعد گھر جانے کے لیے رخصت دی جاتی تھی۔

علاوہ ازیں مجاہدین کے لیے یہ حکم تھا کہ جو شادی شدہ ہوں وہ روانہ ہونے سے قبل اپنی بیوی سے صحبت کر کے جائیں۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عزرا نبی من الأنبياء فقال لقومه لا يُتبعن بی رجل ملک بضع امرأة وهو یورید ان ینبی بہا ولم ین بہا)) (بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب من احب البناء قبل الغزو) عقید کیا ہو) اور ابھی اس سے صحبت نہ کی ہو۔

جنسی اشتہاء اور فحاشی بے راہ روی کا دوسرا حل جو شریعت نے تجویز فرمایا ہے۔ وہ روزہ ہے۔ روزہ جنسی رجحانات کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص نوجوان ہو اور نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزے رکھے۔ روزہ اس کی شہوت کو توڑ دے گا۔ (بخاری۔ کتاب الصوم۔ باب الصوم لمن حاعلی نفسه العزوبۃ)

لونڈیوں کا مسئلہ:

ہم آگے چل کر وضاحت سے بتائیں گے۔ کہ اسلام نے فتح کے بعد لونڈی غلام بنانے کے طریق کو مستحسن نہیں سمجھا۔ تاہم بعض صورتوں میں اس کا جواز موجود ہے۔ جیسا کہ غزوہ بنو قریظہ میں ہوا۔ تو جس طرح اموال غنیمت پر اسلام نے حدود قیود عائد کی ہیں۔ اس طرح لونڈیوں پر بھی عائد کی ہیں مثلاً:

(۱) لونڈی کا اطلاق صرف اس وقت ہوگا۔ جبکہ وہ امیر کی وساطت سے تقسیم ہو کو کسی مجاہد کے قبضہ میں آجائے۔ اس کے علاوہ جو صورت بھی ہوگی زنا شمار ہوگی۔ لہذا جنگ کے

- دورانِ فاتح کے بعد دشمن کی عورتوں کی عصمت دری کرنا خالص زنا میں شمار ہوگا۔
- (۲) امیر کے ذریعہ تقسیم میں کسی عورت کا کسی مجاہد کے حصہ میں آ جانا ہی نکاح کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ منکوحہ تھی تو اس کا سابقہ نکاح از خود ٹوٹ جاتا ہے۔
- (۳) عام حالات میں ایک ماہ کے بعد اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل کے بعد اس سے صحبت روا ہے۔ (نودی میں شرح مسلم۔ باب جواز و وطی المسببہ بعد الاستبراء) پھر اس کے ساتھ ہی وہ پابندیاں بھی عائد ہو جاتی ہیں جو اسلام نے اس سلسلہ میں عائد کی ہیں۔ مثلاً بہتر سلوک۔ حسن معاشرت اور ان کی آزادی کے حقوق وغیرہ۔
- (۴) تقسیم میں آنے کے بعد بھی بہتر صورت یہ ہے کہ لونڈی کو آزاد کر کے اس سے باقاعدہ نکاح کر لیا جائے۔ جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (بنت حبیب بن اخطب) کو آزاد کر کے اپنے نکاح میں لائے تھے۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں لونڈی غلام بنانے کی اجازت کی حوصلہ شکنی کر کے اسے تقریباً ختم ہی کر دیا۔ آج کل لونڈی غلام بنانے کا دستور ختم ہو چکا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ لیکن یہ اچھی بات اس صورت میں سمجھی جاسکتی ہے جب کہ فحاشی کا پورا سد باب بھی کیا جاسکے۔ اور اگر فحاشی اور عصمت دری کے تمام دروازے کھلے رہیں۔ تو اس سے لونڈی بنانے کی اجازت ہزار درجہ بہتر ہے۔ بشرطیکہ تمتع کے بعد کی تمام تر پابندیاں گوارا کی جائیں۔

(۶) فاتحین کا جوش انتقام

فاتح افواج فتح کی خوشیاں منانے، لوٹ مار اور عصمت دری پر بس نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنے حریف کو ہر ممکن طرح سے رسوا کرنے اور اس کے علاقہ میں دہشت کے لیے کئی قسم کی ناجائز حرکات بھی کرتی ہیں۔ بموجب قول باری تعالیٰ:-

﴿إِنَّ الْمَلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْرَآةَ أَهْلِهَا آذِلَّةً وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ (۳۴/۲۷)

(بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ فاتح افواج اس جوش انتقام میں کیا کچھ کرتی ہیں اور اسلام نے اس سلسلہ میں کیا احکام دیئے ہیں:-

(۱) دشمن کی لاشوں کی بے حرمتی:

دور جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ دشمن کی لاشوں کو اپنی سواریوں کے پاؤں تلے روندتے ان کا مثلہ کرتے یعنی ناک، کان وغیرہ کاٹ دیتے۔ یوں بھی انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تو ان کے کٹے ہوئے اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے۔ لاشوں کا کایجہ نکال کر دانتوں میں چباتے، اس کی کھوپڑی میں شراب پیتے تھے۔ اسلام نے ایسی تمام اخلاق سوز حرکات سے منع فرمادیا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:-

((كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ (حضور اکرم ﷺ ہمیں صدقہ کی ترغیب

وَسَلَّمَ يَحُشُّنَا عَلَى الصَّدَقَةِ وَيَنْهَانَا عَنِ دیتے اور مثلہ سے روکا کرتے تھے۔)

الْمُثَلَّةِ)) (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی النهی

عن المثلة)

سہیل بن عمرو خطیب قریش کے لقب سے مشہور تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی طرف سے یہی نمائندہ بن کر آیا تھا۔ یہ نہایت فصیح اللسان تھا اور اکثر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ جنگ بدر میں گرفتار ہو کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر فرمایا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ اس کے نچلے دودانت اکھڑا دیجئے تاکہ آئندہ اسلام کے خلاف تقریریں نہ کر سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اگر میں اس کے عضو بگاڑوں (مثلہ کروں) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میرے عضو بگاڑ دے گا۔ (طبری ج انزوہ بدر)

آپ ﷺ نے جس طرح انسانی جان کو محترم قرار دیا۔ اسی طرح انسانی لاش کو بھی محترم قرار دیا۔ جنگ بدر میں مشرکین کی لاشیں کھلے میدان میں پڑی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ ان لاشوں سے بدبو پھیل رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے اکثر پر مٹی ڈلوادی۔ باقی لاشوں کو بدر کے ایک کنویں میں پھینک دیا گیا۔

جنگ خندق میں ”اتحادی“ خندق کی وجہ سے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں بے بس ہو گئے تھے ایک دن چار شہسواروں نے گھوڑوں کو پیچھے سے دوڑا کر جست لگائی تو وہ ایک کم چوڑائی

والی جگہ سے خندق پار کر گئے۔ ان میں ایک شہسوار عمرو بن عبدود نے مقابلہ کے لیے لاکارا۔ تو حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ باقی تین مقابلہ سے پیچھے ہٹ گئے۔ ان پیچھے ہٹنے والوں میں ایک نوفل تھا جو خندق میں گر پڑا۔ مسلمانوں نے نیزوں پر دھریا اور حضرت علیؓ نے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ قریش مکہ نے نوفل کی لاش حاصل کرنے کے لیے دس ہزار درہم کی پیشکش کی۔ کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہیں مسلمان بھی شاید اس کی لاش سے وہی سلوک کریں گے۔ جو عام دستور ہے۔ ان کی اس پیشکش پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو فرمایا۔ لاش دے دو۔ قیمت کی ضرورت نہیں ہم لاشوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

(۲) قتل عام:

اسلام اپنے حریف کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک مقاتل یعنی وہ لوگ جو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں پہنچ گئے ہوں دوسرے وہ جسے شہری آبادی کہا جاتا ہے یا جو جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیتے۔ اسلام صرف پہلی قسم کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور وہ بھی جنگ کے دوران فتح کے بعد نہیں۔ پھر میدان جنگ میں پہنچنے والوں میں بھی اگر عورتیں اور بچے یا بوڑھے کھوسٹ ہوں تو ان کا قتل بھی درست نہیں سمجھتا۔ تو جنگ کے بعد شہریوں کا قتل عام کس طرح جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

جنگ سے اسلام کا مقصد فتنہ و فساد کو ختم کرنا ہے۔ جب فتح حاصل ہوگئی تو یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب فتح کے بعد قتل عام از سر نو فتنہ و فساد پیا کرنے کے زمرہ میں آتا ہے۔ اسلام اسے بھلا کیونکر برداشت کر سکتا ہے؟

(۳) نذر آتش:

اسی طرح فاتح قوم اپنے ”خطرناک دشمنوں“ کو خواہ وہ قیدی ہوں یا شہری زندہ جلا دیتی ہیں اور کبھی مفتوحہ شہر ہی کو جلا دینے کا حکم دے دیتی ہیں آپ... نے اس سے منع فرمادیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:-

((بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ (آنحضرت ﷺ نے ہم کو ایک فوج میں
وَسَلَّمَ فِي بَعْثٍ وَقَالَ لَنَا إِنْ لَقِينُمْ فَلَانَا بھیجا اور قریش کے دو آدمیوں کا نام لے کر

وَقَلَانَا لِرَجُلَيْنِ مِنْ قُرَيْشٍ سَمَّا هُمَا فَحَرَفُوهُمَا بِالنَّارِ قَالَ ثُمَّ آتَيْنَا نُوْدُعُهُ حِينَ أَرَدْنَا الْخُرُوجَ فَقَالَ: إِنِّي كُنْتُ أَمْرُكُمْ إِنْ تَحَرَّفُوا قَلَانَا وَقَلَانَا بِالنَّارِ وَإِنَّ النَّارَ لَا يُعَذَّبُ بِهَا إِلَّا اللَّهُ فَإِنْ أَخَذْتُمُوهُمَا فَاقْتُلُوهُمَا)) (بخاری)

فرمایا اگر ان کو پاؤ تو انہیں جلا دینا۔ پھر ہم آپ ﷺ سے رخصت ہونے کو آئے جب نکلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”میں نے پہلے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ دو شخصوں کو آگ میں جلا دینا۔ لیکن آگ اللہ ہی کا عذاب ہے۔ آگ میں جلانا اسی کو سزاوار ہے۔ اگر تم ان کو پکڑ لو تو انہیں قتل کر دینا۔

کتاب الجہاد باب لا یعذب بالنار الا رب النار

(۴) عبادت گاہوں کی بربادی:

فاتح انواع عموماً حریف کے معبدوں سے گھوڑوں کے اصطلبل یا اسٹور کا کام لیتی ہیں۔ اسلام میں ایسی باتوں کی قطعاً اجازت نہیں وہ دوسری اقوام کے عبادت خانوں کی حفاظت کی خود ذمہ داری لیتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کو رخصت کرتے وقت جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ دشمن کے معبدوں کا احترام بحال رکھا جائے۔

(موطا۔ کتاب الجہاد۔ باب النهی عن قتل النساء والولدان فی الغزو)

مندرجہ بالا تمام منقمانہ کاروائیوں سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ (۵/۸) مذکورہ بالا قوانین میں مستثنیات کے لیے دیکھئے باب ۵ زیر عنوان جنگی ضروریات)

(تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو۔ یہی پرہیز گاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ پرہیز گاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔)

اسیران جنگ سے برتاؤ

اسیران جنگ سے سلوک کے متعلق مندرجہ ذیل صورتیں ممکن ہیں۔

- (۱) اسیر بنانے سے پہلے ہی آزاد کر دیا جائے۔
- (۲) بلا معاوضہ ازراہ احسان چھوڑ دیا جائے۔
- (۳) معاوضہ (فدیہ) لے کر چھوڑ دیا جائے۔
- (۴) جنگی قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے۔
- (۵) غلام بنا لیا جائے۔
- (۶) تہ تیغ کر دیا جائے۔

اسیران جنگ سے متعلق قرآن کریم نے ایک عام اصول بیان فرمادیا:

﴿فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ (۴:۴۷) (پھر ان قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر۔)

اب ہم دیکھیں گے کہ دور نبوی میں کل کتنے اسیر ہوئے اور ان سے کیا سلوک ہوتا رہا۔

(۱) اسیر بنانے سے پہلے آزاد کر دینا:

یہ صورت صرف فتح مکہ کے بعد اختیار کی گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں سے غنودرگزر سے کام لیا اور فرمایا:

«(إِذْهَبُوا أَنْتُمْ الطَّلَفَاءُ)» (جاؤ تم سب آزاد ہو۔)

اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہزار ہا کی تعداد میں تھے جو باوجود قدرت کے غلام بنائے نہیں گئے۔ ان میں سے کچھ تو مسلمان ہو گئے۔ اور کچھ غیر مسلم ہی رہے۔

(۲) ازراہ احسان چھوڑ دیا جائے:

اس صورت کے مندرجہ ذیل غزوات و سرایا کے قیدی آزاد کیے گئے:-

- | | | |
|-----|-------------------------|---------|
| (۱) | سریہ نخلہ رجب ۲ھ | ۲ قیدی |
| (۲) | غزوہ بنو مصطلق شعبان ۵ھ | ۱۹ قیدی |

شہلی نعمانی سیرۃ النبی ص ۱۱۳ پر اسیروں کی تعداد تقریباً چھ سو بتلائی ہے۔ اور ساتھ ہی ص ۱۲۷ پر یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہ سب چھوڑ دیئے گئے تھے۔

(۳) سریہ جموم ربیع الاخر ۶ھ ۱۰ قیدی

(۴) سریہ عیص صفر ۷ھ ۹ قیدی

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ اور عقبہ بن اسید رضی اللہ عنہ (ابو بصیر) کے جتنے نے تجارتی قافلہ پر حملہ کر کے قیدی بنائے اور غنیمت حاصل کی۔ پھر حکم نبوی کے مطابق سب کچھ واپس کر دیا۔

(۵) سریہ حسی جمادی الآخر ۷ھ ۱۰۰ قیدی

(۶) غزوہ حنین شوال ۸ھ ۶۰۰۰ قیدی

آزاد کر دینے کے علاوہ قیدیوں کو کپڑے بھی عطا فرمائے۔

(۷) سریہ عینہ محرم ۹ھ ۶۳ قیدی - قبیلہ بنو تمیم نے بغاوت کی تھی

(۸) سریہ بنو طے ۹ھ دختر حاتم مسماة سنانہ اور اس کی پوری قوم

آپ نے دختر حاتم کو باکرام رخصت فرمایا اور اس کی وجہ سے ساری قوم کو چھوڑ دیا۔

کل تعداد ۶۲۰۲ کم از کم

(۳) فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے:

جنگ بدر ۲ھ کے قیدیوں کا فدیہ لیا گیا۔ اس کے بعد فدیہ کی بھی صورت پیش نہیں آئی۔ عموماً ازراہ احسان ہی چھوڑ دیا جاتا رہا۔ فدیہ لے کر چھوڑنے کی داستان بھی عجیب ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحیمی اور غفور گزر کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ کسی قیدی نے کہا۔ میرے پاس فدیہ دینے کو کوئی چیز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟“ قیدی نے اثبات میں جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اچھا اس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دو۔ یہی تمہارا فدیہ ہے۔ کسی نے کہا میں خود مکہ جا کر فدیہ بھیج سکتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی اعتبار کر کے اسے چھوڑ دیا۔ کسی نے کہا۔ میرے پاس تو نہ کوئی رقم ہے اور نہ میں پڑھنا لکھنا جانتا ہوں اور غریب آدمی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دوبارہ جنگ میں حصہ نہ لینے کے وعدہ پر چھوڑ دیا اور اس کے وعدہ پر اعتبار کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ابو العاص سے ہوا تھا جو اس جنگ میں گرفتار ہوا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اس کے فدیہ میں اپنے گلے کا وہ ہار بھیجا جو اس کی والدہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسے دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ننگسار، اطاعت گزار اور با وفا بیوی کی یاد تازہ ہو گئی۔ آنسو ڈبڈبائے۔ ایسے شدید جذبات کی رو میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا۔ کہ اپنے اختیار سے کام لیکر ابو العاص کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے اور ہار

اپنی بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ بلکہ یہ معاملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ اگر کہو تو حضرت خدیجہ کی یہ نشانی زینب رضی اللہ عنہا کو واپس کر دی جائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رضامندی کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار واپس کر دیا اور ابو العاص کو بھی رہا کر دیا۔

یہ تھے فدیہ کی رقم کی وصولی کے وہ مختلف طریقے جو جنگی قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں بروئے کار لائے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فدیہ لینا ہی نہ چاہتے تھے۔ ان قیدیوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نواؤں کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نواؤں کی رائے یہ تھی کہ ان قیدیوں سے فدیہ لیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو اس لیے پسند فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی طبیعت کے نرم تھے۔

(۴) تبادلہ:

دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جنگی قیدیوں کے تبادلے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی بھی جنگ میں مسلمان قیدی نہیں بنائے گئے۔ جبکہ کفار کو ہر بار شکست ہوتی رہی۔ اور قیدی بھی ہاتھ آتے رہے۔

مگر کہ کارزار کے علاوہ دوسری مہموں یعنی غشتی اور تبلیغی دستوں کی شکل میں بعض مسلمان کافروں کی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے شہید ہوئے۔ اور قید بھی پھر کچھ مسلمان محض اسلام لانے کی وجہ سے قریش مکہ کی قید میں تھے۔ ایسے مسلمان قیدیوں کو چھڑانا اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے اور ایسے قیدیوں کے تبادلے کا بھی دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت مل جاتا ہے۔ مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔ ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرفتار شدہ لڑکی اہل مکہ کو دے کر ان سے دو مسلمان رہا کرائے۔ (الجہاد فی الاسلام ص ۲۵۳)

(۵) قیدی کو غلام بنانا یا تہ تیغ کرنا:

غزوہ بنو قریظہ ذی الحجہ ۵ھ پورے عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ ایک ہی موقع ہے جبکہ اسیران جنگ کو غلام بنایا گیا ہے یا تہ تیغ کیا گیا۔ ان کے ۴۰۰ لڑائی کے قابل آدمیوں کو مارا گیا اور ۲۰۰ بچوں، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں کو غلام بنایا گیا۔

دراصل ان کو یہ سزا سیران جنگ ہونے کی حیثیت سے نہیں ملی تھی۔ بلکہ یہ یہود کی مسلسل عہد شکنیوں، غدار یوں اور سازشوں کی سزا تھی۔

(۲) یہود نے فیصلہ کے لیے قبیلہ اوس (جو یہود کے حلیف تھے) کے سردار سعد بن معاذ کو بطور ثالث منتخب کیا تھا جو حضور ﷺ نے تسلیم کر لیا۔ بنو قریظہ کے متعلق انہوں نے فیصلہ یہ دیا تھا کہ:-

(۱) جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں قتل کیے جائیں۔

(۲) عورتیں، بچے اور معذور قیدی بنا لیے جائیں۔

(۳) مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔

چنانچہ فریقین نے یہ ثالثی فیصلہ تسلیم کر لیا۔ پھر یہ فیصلہ چونکہ تورات کی شریعت کے عین مطابق تھا لہذا یہود نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ یہ ہے اس گھناؤنے الزام کی حقیقت کہ اسلام میں سیران جنگ کو لوٹڈی غلام بنا لیا جاتا ہے۔ دور نبوی ﷺ کے کل سیران جنگ کی تعداد ۶۸۷۲ ہے۔ جن میں سے ۷۰۷۰ فدویہ لے کر چھوڑے گئے۔ ۶۲۰۲ صرف ازراہ احسان چھوڑی ہی نہیں دیئے گئے بلکہ ان پر مزید احسان بھی کیے گئے۔ ۱۳۰۰ سیران جنگ (یہودیوں) کو لوٹڈی غلام اور ۳۰۰ کو تہ تیغ کیا گیا۔ یہ فیصلہ انہی کے پسندیدہ ثالث کا فیصلہ تھا اور یہ ان کی مسلسل عہد شکنیوں اور سازشوں کی سزا انہیں قدرت کی طرف سے ملی تھی۔

غلامی کا مسئلہ:

سیران جنگ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو اقہآت زمانہ سے متعلق ہے۔ دور نبوی میں جیل خانے موجود نہیں تھے۔ ان کی حفاظت کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان کی رہائش، خوراک، نگہداشت اور حراست کی ذمہ داری حکومت کے بجائے عام مسلمان پر ہو۔ تاآنکہ ان کو آزاد نہ کر دیا جائے۔ اس عبوری دور میں قیدیوں سے سلوک سے متعلق احکام یہ ہیں۔

۱۔ بنو قریظہ کے متعلق الزامات یہ تھے۔

(۱) تجدید معاہدہ کے باوجود انہوں نے عہد شکنی کی۔ اور مسلمانوں کے خلاف اتحادیوں سے مل گئے جس سے اندرونی خطرہ لاحق ہو گیا۔

(۲) انہوں نے عورتوں اور بچوں کے قلعہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔

(۳) جنگ کے بعد جی بن اخطب کو ساتھ ملا کر مدینہ میں مزید اشتعال کی وجہ پیدا کی اور معاہدہ شکنی پر افسوس کی بجائے مقابلہ کی ٹھانی۔

(۱) آقا اور غلام کی خوراک، لباس اور رہائش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔ بدر کے قیدیوں میں ایک ابو عزیز تھے جو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک انصاری نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا۔ یہ لوگ مجھے تو کھانا دیتے اور خود کھجوریں کھا کر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیتا مگر وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور روٹی مجھے واپس کر دیتے (ابن ہشام بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۳۶) اور یہ تو واضح ہے کہ ابو عزیز فدیہ کے بعد چھوڑ دیئے گئے تھے۔

(۲) غلام کی جان، مال اور آبرو قانون کی نظروں میں آقا کے برابر ہے۔ غلام کی جان، مال اور آبرو کی قیمت ایک آزاد مسلمان کے برابر قرار دی گئی۔ اور دوہر فاروقی میں ایک ذمی کے قتل کا مسلمان قاتل سے قصاص لیا گیا۔

پھر اگر کوئی غلام مستقل طور پر کسی کی ملکیت میں ہو تو مندرجہ بالا حقوق کے علاوہ درج ذیل حقوق بھی اسے حاصل ہوتے ہیں:-

(۳) غلام کی ذہنی آزادی کا احترام کیا جائے گا اگر وہ جوہر قابل ہے تو اس کی کما حقہ تربیت کی جائے۔

(۴) غلام کو شادی کرنے اور اپنی انفرادی معاشرتی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۵) غلام کو اپنی آزادی خریدنے کا حق حاصل ہے۔ جسے شرعی زبان میں مکاتبہ کہتے ہیں۔ اب ہم اس ضمن میں چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں:-

((سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ لَطَمَ مَمْلُوكًا أَوْ ضَرَبَهُ كَفَّارَتُهُ أَنْ يَغْتَقَهُ -)) (مسلم - باب صحبة طمانچہ لگایا یا اسے مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کر دے۔)

اور اس کو آزاد کرنے میں ثواب کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ کفارہ ہے۔ (حبیہ ایضاً)

(۲) اس حدیث کی تشریح میں امام نووی (شارح مسلم) لکھتے ہیں۔ سبحان اللہ لو نڈی غلام رکھنا ان لوگوں کا حق تھا جو اولاد کی طرح ان کی تعلیم اور تربیت کرتے تھے۔ جو آپ

- کھاتے تھے وہی ان کو کھلاتے تھے اور جو آپ پہنٹے تھے وہی ان کو پہناتے تھے۔ طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لیتے تھے کبھی مارتے پینٹتے نہ تھے۔ اگر ان کا کوئی بچہ اس غلام کو مارتا تو اسے وہی سزا دیتے جو سلوک اس نے غلام سے کیا۔ (حوالہ ایضاً)
- (۳) ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا پیچھے سے ایک آواز آئی۔ ”ابو مسعود رضی اللہ عنہ! جان لے جتنی تو اس غلام پر قدرت رکھتا ہے اللہ تجھ سے زیادہ تجھ پر قدرت رکھتا ہے۔“ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ میں نے کہا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! یہ غلام اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”اگر تو ایسا نہ کرتا تو جہنم کی آگ تجھے جلا دیتی۔“ (حوالہ ایضاً)
- (۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر کسی کا غلام کسی کے لیے کھانا تیار کرے اور اس طرح آگ اور دھوئیں کی گرمی اور تکلیف برداشت کرے تو مالک کو چاہیے کہ کھانا کھاتے وقت اسے ساتھ بٹھائے۔ اور اگر کھانا کم ہو تو لقمہ دو لقمہ اس کے لیے چھوڑ دے۔ (مسلم، باب ایضاً)
- (۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک ایسے غلام کے لیے جو اللہ کی بھی اطاعت کرتا ہے اور اپنے مالک کی بھی..... دو ہر ا ثواب ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابو ہریرہ کی جان ہے۔ اگر جہاد اور حج اور ماں سے بہتر سلوک کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں خواہش کرتا کہ میں غلام ہو کر مروں۔ (مسلم حوالہ ایضاً)
- (۶) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو غلام کے عضو کے بدلے دوزخ سے آزاد کر دے گا۔ (بخاری۔ کتاب العتق باب فی العتق وفضلہ)
- (۷) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دو آدمیوں کا غلام ہو۔ پھر ایک مالک اپنا حصہ آزاد کر دے تو یہ مالک اگر مال دار ہو تو دوسرے کے حصے کی بھی قیمت ادا کر دے تاکہ غلام آزاد ہو جائے۔ (بخاری۔ کتاب العتق۔ باب إذا عتق عبداً بین اثنين)
- (۸) جس شخص کے پاس لونڈی ہو، وہ اس کی اچھی طرح پرورش کرے۔ پھر آزاد کر کے اس سے صحبت کرے تو اس کا دو ہر ا ثواب ہے۔ (بخاری۔ حوالہ ایضاً)

(۹) کوئی شخص اپنے غلام سے یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلایا پانی پلا بلکہ یوں کہے کہ اپنے سردار کو یا اپنے آقا (سیدی و مولائی) کو پلاؤ۔ اور کوئی آقا میرا غلام (عبدی) یا میری لونڈی (امینی) بھی نہ کہے بلکہ یوں کہے میرا آدمی یا لڑکا یا خدمت گار۔ (فتنای و فتنائی و غلامی)۔ (بخاری حوالہ ایضاً)

اور غلام کو مکاتبت (بالاقساط اپنی آزادی کی قیمت ادا کر دینے کی تحریر) کا حق تو قرآن سے ثابت ہے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿وَالَّذِينَ يَبْتِغُونَ الْكِتَابَ بِمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَمَا بُوْهُمُ أَنْ عَلَّمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَأَتَوْهُمُ مِنْ مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ﴾ (۳۳/۲۳)

(لونڈی غلاموں میں جو مکاتب بننا چاہیں۔ ان سے مکاتبت کر لو اگر تم ان میں بھلائی (اس کی اہلیت) دیکھو۔ پھر اس مال سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے انہیں بھی دو۔)

گویا صرف مکاتبت کا حق ہی نہیں ان کی مالی امداد کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

اس دور میں دنیا بھر میں غلامی کا دور دورہ تھا اور غلام معاشرہ کا ایک اہم جز و مقصود ہوتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے تو اسیران جنگ کے متعلق یہ فیصلہ کر کے کہ ”انہیں احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے“۔ غلامی کی اصل بنیاد پر کاری ضرب لگائی۔ غلاموں سے بہتر سلوک اور اونچ نیچ کا امتیاز ختم کر کے انہیں مساوی مقام پر لاکھڑا کیا۔ ”غلام کو آزاد کرنا“ بہترین نیکی قرار دیا اور زکوٰۃ میں سے ایک حصہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے مختص کیا۔ کئی گناہوں کا کفارہ ”غلام کو آزاد کرنا“ قرار دیا۔ ان سب عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی کی یہ رسم بتدریج ختم ہوتی گئی۔

اسلامی فتوحات کے لحاظ سے دور نبوی ﷺ کے بعد دور فاروقی کا نمبر ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر نے یہ علاقہ فتح کر لیا حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگوں کو لونڈی اور غلام بنا لیا اور وہ فروخت ہو کر عرب میں پھیل گئے۔ یہ سلسلہ حضرت عمرؓ کو اسلامی روح کے منافی معلوم ہوا تو انہوں نے سرکاری سطح پر اس کے خلاف اقدامات کیے اور بڑی کاوش سے ہر جگہ سے ان کو واپس لے کر مصر بھیج دیا اور لکھ بھیجا کہ ان کو اختیار ہے خواہ اسلام لائیں یا اپنے مذہب پر رہیں۔ چنانچہ ان میں سے قصبہ باہیب کے رہنے

والے اپنی خواہش سے مسلمان ہو گئے۔ (الفاروق ۱۰۳)

تاہم اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ اسلام میں اسیران جنگ کو غلام بنانا گناہ یا حرام ہے۔ بعض دفعہ ایسے حالات پیش بھی آسکتے ہیں جیسا کہ غزوہ بنو نضیر کے موقع پر ہوا۔ اور اس اجازت کا ثبوت پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ملتا ہے۔

﴿يُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ (۸:۷۶)

(اور یہ لوگ باوجودیکہ ان کو خود طعام کی خواہش ہے۔ مسکین کو یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔)

لیکن غلام کو اتنے حقوق عطا کر دیے گئے کہ نام کے علاوہ کچھ بھی فرق باقی نہ رہ گیا۔

غلاموں کا فقہیہ اور محدث ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متبنی بنایا۔ اپنی پھوپھی زاد بہن سے نکاح کیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ دونوں کو سپہ سالار لشکر بنایا۔ جن کے تحت بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم جہاد میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جو حبشی غلام تھے سیدنا کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے مولیٰ سالم رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ نامزد کر دیتا۔ حالانکہ وہ آزاد کردہ غلام تھے۔ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے:-

((إِنَّ أَمْرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُّجَدَّدٌ يُقَوِّدُكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا))

(مسلم۔ کتاب الامارۃ) ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

چنانچہ تاریخ میں بے شمار ایسے مسلمان بادشاہ گزرے ہیں۔ جو غلام تھے۔ محمود غزنوی مشہور فاتح بھی آزاد کردہ غلام تھا۔ ہندوستان اور مصر میں غلاموں کے خاندان نے صدیوں تک حکومت کی۔ اب کونسا وہ اعزاز باقی رہ جاتا ہے۔ جو صرف آزاد کے ساتھ مخصوص ہو اور غلام اس سے بے بہرہ ہو۔

اسلام سے پہلے کے اسیر اور قتل صبر:

اسلام سے پہلے اسیران جنگ کے متعلق دو ہی متفقہ فیصلے تھے۔ ایک قتل، دوسرے دائمی

غلامی۔ تیسرا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ غلاموں کو معاشرہ میں پست ترین تصور کیا جاتا تھا۔ لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کیا جاتا کیونکہ وہ مردوں کی طرح محبت کر کے اپنے آقا کے حضور ﷺ آمدنی پیش نہ کر سکتی تھیں۔ بچے جو آمدنی پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتے انہیں چاند ماری کی مشقیں کر کے موت گھاٹ اتار دیا جاتا۔ پھر ان غلاموں کی باقاعدہ خرید و فروخت کی جاتی تھی۔

بعض قیدیوں کو درندوں کے آگے ڈال دیا جاتا۔ روم میں یہ دستور تھا کہ وہ لاقعداد قیدیوں کو سکھائے ہوئے درندوں کے سامنے چھوڑ دیتے اور ان کا مقابلہ دیکھتے۔ یہ ان کا مرغوب سامان تفریح تھا۔ کبھی ان قیدیوں کو کسی درخت وغیرہ سے باندھ کر ان پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی تا آنکہ وہ مر جاتا۔ اس طرح باندھ کر بے دست و پا کرنے کسی کو جان سے مار دینے کو عربی میں قتل صبر کہتے ہیں۔ اسلام نے اس وحشت و بربریت سے حکماً منع کر دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے ایک جنگ میں چند قیدیوں کو اس طرح قتل کر لیا تھا پھر جب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور کہا اللہ تعالیٰ کی قسم میں مرغے کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں سمجھتا۔ تو آپ نے کفارہ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔ (ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب قتل الاسیر بالنیل)

غلامی اور مستشرقین:

آج کی تمدن دنیا اسلام کو غلام بنانے کے جواز پر، بدنام کرتی ہے۔ حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ عملاً اسلام نے غلامی کو ختم کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسیران جنگ کے لیے بھی یہ ریت ڈال دی۔ کہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔ بعد میں اگر ہمیں اس رسم غلامی کے آثار ملتے ہیں تو اس کا ذمہ وارا اسلام نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جنہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے تقدس کو پارہ پارہ کر کے اسے عام دنیوی جنگوں کی سطح پر لے آئے اور وہ سب کچھ کرنے لگے جو عام دنیا دار جرنیل اور بادشاہ اختیار کرتے ہیں۔

اسلام پر اعتراض یہ ہے کہ وہ اسیران جنگ کو غلام بنانا جائز رکھتا ہے۔ اور اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو جنگ کے بغیر بھی لوگوں کو غلام بنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اہل یورپ خصوصاً انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی تمام دولت افریقہ سے لائے ہوئے

قیدیوں اور غلاموں پر موقوف رہی ہے۔ یورپین اپنے جہازوں سے اتر کر افریقہ کے جنگلوں میں سیاہ انسانوں کا شکار کرتے اور قیدی بنا کر انہیں اپنے وطن لاتے اور ان کی خرید و فروخت کرتے رہے ہیں۔

مفتوح قوم سے سلوک:

اس سلسلہ میں ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ دور نبوی میں مشہور غزوات و سرایا ہوئے تو مفتوحین سے کیا سلوک روا رکھا گیا۔

(۱) جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق تینوں مدافعتیہ جنگیں تھیں۔ فتح کے باوجود یہاں مفتوح اقوام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) سریہ موتہ مسلمان سفیر کے قتل کے قصاص کی بنیاد پر سرحد شام پر عیسائیوں سے لڑی گئی۔ اسلامی سرحدوں پر رومی فوجوں نے گڑ بڑ پیدا کر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان کی سرکوبی کو فوراً وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن منتشر ہو چکا ہے۔

(۳) فتح مکہ کے دوران مفتوح قوم کو جس فران دلی سے آزاد کیا گیا اور اس سے درگزر بھی کیا گیا۔ اس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔

(۴) غزوہ حنین میں چھ ہزار غلام ہاتھ لگے۔ ان سب کو ازراہ احسان چھوڑ دیا گیا۔

یہود سے غزوات اور نتائج:

اب باقی صرف وہ غزوات رہ جاتے ہیں جو یہود سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مختصر حال بھی ملاحظہ فرمائیے:-

آپ کو یاد ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آتے ہی مدینہ اور مضافات مدینہ کے یہود کو جو تین قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قریظہ پر مشتمل تھے۔ بیثاق مدینہ کی رو سے اپنا حلیف بنا لیا تھا۔ لیکن یہود ایک موقعہ شناس اور عمدہ شکن قوم ہے۔ جو سازشوں میں مصروف رہتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی بالادستی تو انہوں نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن بنی اسرائیل سے نہ ہونے کی وجہ سے یہودی آنحضرت ﷺ سے کینہ رکھتے تھے۔ ان کی سود خوری اور سرمایہ پرستی کی عادت نے بھی انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام سے متنفر کر دیا تھا۔ انہوں نے

- (۱) جنگ بدر کے بعد قریش سے خفیہ ساز باز شروع کر دی۔
- (۲) مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے اوس و خزرج کی دیرینہ عداوتوں خصوصاً جنگ بعاث کے تذکرے چھیڑ کر انہیں آپس میں لڑانے کی کوشش کی اور رسول اللہ کی بروقت مدافعت سے یہ فتنہ فرد ہوا۔

غزوہ بنو قینقاع:

ان میں بنو قینقاع زرگر اور سود خور سب سے زیادہ مال دار اور اس طرح مغرور بھی تھے۔ جنگ بدر کے فوراً بعد کا واقعہ ہے کہ ایک انصار عورت دودھ بیچنے ان کے محلہ میں گئی۔ چند یہودیوں نے اس سے زیادتی کی اور اسے ننگا کر دیا۔ عورت چلائی تو ایک مسلمان نے ان شرارتیوں کے سرغنہ کو قتل کر دیا۔ یہودیوں نے مل کر اس مسلمان کو بھی قتل کیا اور بلوہ عام بھی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سمجھانے کوشش کی تو اُلٹا کہنے لگے۔ ”بدر میں تمہیں اس قوم سے پالا پڑا ہے جو جانتے ہی نہیں کہ جنگ کیا چیز ہے؟ ہم سے پالا پڑا تو سمجھ لگ جائے گی۔ اور ساتھ ہی معاہدے کا کاغذ بھی واپس کر دیا۔ یہ گویا ان کا جنگ کے لیے الٹی میٹم تھا۔

بالآخر حضور ﷺ نے جنگ کی تیاری کر لی۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن جاری رہا۔ آخر جنگ آ کر انہوں نے حضور ﷺ کے حکم پر رضا دے دی۔ آپ ﷺ نے انہیں جلاوطنی کا حکم دیا۔ یہ سات سوا شخاص تھے جن میں ۳۰۰ زُہر پوش تھے۔ یہ لوگ شوال میں مدینہ سے نکل کر شام کے علاقہ میں جا بے ملاحظہ فرما لیجئے کہ مفتوح قوم سے کیا سلوک کیا گیا۔

غزوہ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ:

سر یہ بڑ معونہ (صفر ۴ھ) ۶۹ عالمان دین قبائل رعل و ذکوان نے دھوکا سے شہید کر دیئے صرف ایک صحابی عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہما نکلے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے راستہ میں بنو عامر کے آدمی قتل کر دیئے۔ ان کا خونبہ ادا کرنا تھا۔ میثاق مدینہ کی رو سے آپ ﷺ یہود کے پاس گئے اور مصارف کے حصہ کا مطالبہ کیا۔ یہود نے سازش کی اور ایک آدمی عمرو بن جحاش کو عبداللہ بن ابی منافق یہود کا حلیف تھا۔ اسی نے حضور ﷺ سے سفارش کی کہ انہیں اور کوئی سزا نہ دی جائے صرف جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی بات کو قبول کر لیا۔

اس ارادہ سے مکان پر چڑھایا کہ اوپر سے پتھر پھینک کر آپ کو ہلاک کر دے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی اس صورت حال کی اطلاع ہو گئی۔ آپ ﷺ فوراً ساتھیوں سمیت واپس مدینہ چلے آئے۔

یہود کو اپنی اس سازش کی ناکامی کا دکھ ہوا۔ اب انہوں نے بغاوت کی تیاری کر کے دوسری سازش یہ کی کہ حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ ۳۰ آدمی ساتھ لے کر ہمارے پاس آئیں۔ اگر ہمارے علمائے یہود نے تصدیق کر دی تو ہم بھی اسلام لے آئیں گے۔ حضور ﷺ کو دال میں کالا معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے کہا۔

”جب تک ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں اعتبار نہیں کروں گا۔“ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

اب بگڑے ہوئے حالات سامنے تھے۔ آپ ﷺ نے پہلے بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کے لیے کہا وہ مان گئے۔ پھر بنو نضیر سے کہا لیکن وہ پھر بھی نہ مانے البتہ اپنا مطالبہ جاری رکھا اور وہی پیغام دوبارہ بھیج دیا۔ آپ ﷺ کو کسی کا اسلام لانا، بہت مرغوب تھا۔ آپ ﷺ تیار ہو بھی گئے۔ لیکن راستہ میں یقینی خبر ملی کہ یہود تلواریں سنت کر تیار بیٹھے ہیں لہذا آپ ﷺ واپس آ گئے۔

انہی دنوں بنو نضیر اور عبد اللہ بن ابی۔۔۔۔۔ نے ”اتحاد کر لیا“ اور آپس میں ایک دوسرے کی امداد کے معاہدے طے پا گئے۔ لہذا اب جنگ ناگزیر ہو گئی۔

آپ ﷺ نے ربیع الاول ۴ھ میں بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا جو چند روز تک جاری رہا۔ بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ ہتھیاروں کے علاوہ جس قدر مال اسباب اونٹوں پر لاد کر لے جاسکیں، لے جائیں۔ حضور ﷺ نے یہ شرط مان لی۔ ان میں سے بڑے بڑے رؤساء نے تو خیبر کا رخ کیا اور باقی شام کی طرف چلے گئے۔

بنو نضیر اتنے حریص واقع ہوئے تھے کہ اپنے مکانات اپنے ہاتھوں منہدم کر کے ان کے شہر اور کڑیاں تک اونٹوں پر لاد کر لے گئے اس غزوہ میں بھی فیصلہ بنو نضیر کی اپنی پیش کی ہوئی شرط کے مطابق ہوا۔ بتلائے مفتوح قوم سے کیا ناروا سلوک ہوا؟

غزوہ بنو قریظہ:

اس غزوہ کا حال پہلے امیران جنگ سے سلوک کے تحت مفصل لکھا جا چکا ہے۔ اس

غزوہ میں بھی فیصلہ ان کے اپنے پسندیدہ ثالث نے کیا تھا۔ جس کی بنا پر یہ لوگ قتل ہوئے اور اسیر بنائے گئے۔

غزوہ خیبر:

خیبر یہود کی قوت کا مرکز بن چکا تھا جی بن اخطب کا قتل اور بنو نضیر کی جلا وطنی کا صدمہ ان کو کسی صورت نہ بھولتا تھا۔ انہوں نے قبیلہ غطفان سے گٹھ جوڑ کیا قبائل عرب کو ساتھ ملایا۔ جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور بھاری جمعیت اکٹھی کر لی۔

حضور ﷺ ۳۰۰ صحابہ ﷺ کے ساتھ خیبر کو نکلے۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ ان کا مضبوط ترین قلعہ قنوص سر ہونے میں نہ آتا تھا۔ جو حضرت علی ﷺ کے ہاتھوں سر ہوا۔ یہود کا بہادر سردار مرحب بھی حضرت علی ﷺ ہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعد میں باقی قلعے بھی سر ہوئے۔ اور اس طرح بیس دن کے محاصرہ کے بعد خیبر مکمل طور پر فتح ہوا۔

اس معرکہ میں یہود کے ۹۳ آدمی کام آئے جنگ کے بعد کوئی اسیر قتل نہیں کیا گیا۔ یہود کو کامل امن دیا جا چکا تھا اور ہر قسم کی مراعات سے نوازا گیا لیکن یہود پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ فتح کے بعد حضور چند یوم یہاں ٹھہرے۔ اس دوران سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے آپ ﷺ کی دعوت کی۔ اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک لقمہ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ ﷺ کے ساتھیوں میں بشیر بن براء زیادہ کھا چکے تھے جو تین دن بعد شہید ہو گئے۔

آپ ﷺ نے زینب سے صورت حال پوچھی تو اس نے اقبال جرم کر لیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ایک گہری سازش تھی جس میں سارے یہود شریک تھے۔ آپ ﷺ نے یہود سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے ”اس لیے کہ اگر پیغمبر ہیں تو آپ ﷺ پر زہر اثر نہیں کرے گا اور اگر نہیں تو ہم آپ ﷺ سے نجات پا جائیں گے۔ آپ ﷺ چاہے تو اس سادش میں شریک تمام یہود کو قصاص کی بنا پر قتل کر سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے پھر بھی درگزر سے کام لیا۔ البتہ بشیر بن براء کے قصاص میں زینب کو قتل کر دیا گیا۔ جو یہ زہر آلود گوشت کھانے سے وفات پا گئے تھے۔ خیبر کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی ان سے معاہدہ یہ ہوا تھا۔ کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ ان کے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بعد میں انہوں نے پھر

درخواست کر دی۔ کہ انہیں اپنی زمینوں پر قابض رہنے دیا جائے جلا وطن نہ کیا جائے۔ اور پیداوار کا نصف بٹائی کے طور پر ادا کر دیا کریں گے۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست بھی مان لی۔

تو یہ تھا حضور اکرم ﷺ کا اس مفتوح قوم سے سلوک جو ہر وقت سازشوں میں مصروف رہی۔ کئی بار آپ ﷺ کی جان لینے کے منصوبے بنائے۔ اور ہر بار عہد شکنی کرتی رہی۔

پھر مسلمانوں کے انصاف کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو حصہ پیداوار وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ پیداوار کے دو حصے کرتے پھر انہیں اختیار دیتے کہ جو چاہے لے لو۔ یہود ان کی رواداری اور انصاف سے متاثر ہو کر کہتے کہ زمین آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہے۔

تو یہ تھا اسلام کا مفتوح اقوام سے سلوک۔ اور جو سلوک عصر حاضر کی مہذب اقوام اپنے مفتوحین سے کرتی ہیں اس کا حال اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۹) قوانین صلح

صلح کی کئی صورتیں ہیں مثلاً:-

www.KitaboSunnat.com

پہلی صورت:

معرکہ کارزار گرم ہونے سے پیشتر اگر حریف شرط نمبر ۲ یعنی جزیہ کی ادائیگی کی شرط قبول کر لیتا ہے تو ایسی معاہدہ قوم سے صرف جزیہ ہی لیا جائے گا۔ اس طرح اگر کوئی فریق مخالف معرکہ کارزار گرم ہونے سے پہلے یہ شرط مان لیتا ہے تو اس سے بھی اس شرط پر معاہدہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ نجران کے عیسائیوں سے ہوا۔ جس کا متن یہ ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من جانب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنام ابوہارث بشمول نجران کے دیگر پادری راہب اور کاہن:-

(۱) سب اپنی اپنی جائداد کے خود مالک ہیں۔

(۲) ان کے گرجے۔ عبادت خانے اور خانقاہوں کی حفاظت رسول اللہ کے ذمے ہے۔

(۳) ان کے پادری اور راہبوں کو ان کے طریق عبادت اور کاہنوں کو ان کے کام سے نہ ہٹایا جائے گا اور نہ ہی ان کے حقوق میں مداخلت کی جائے گی ان امور پر ایفائے عہد کی ذمہ داری بھی اللہ اور رسول پر ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیے ہوئے

معاہدے کی خود بھی پابندی کریں۔ اور ہماری خیر طلبی پر قائم رہیں۔ تب انہیں مزید کسی قسم کی زیر باری سے دوچار نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا ظلم روا رکھا جائے گا۔

(اساس طبقات ابن سعد ج ۲۔ وفود اہل الیمن)

دوسری صورت:

معرکہ کارزار گرم ہونے کے بعد جب دشمن کو اپنی شکست نظر آنے لگے۔ اور وہ خود صلح کی پیشکش کرے۔ اس صورت میں شرائط فریقین کی باہمی رضامندی سے طے ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بیشتر غزوات یہود میں ہوا۔ اور بالعموم انہی کی پیش کردہ شرائط تسلیم کی جاتی رہیں۔

تیسری صورت:

بزرگ شمشیر فتح ہو جانے کے بعد مفتوح قوم سے معاہدہ۔ اس صورت میں فاتح قوم کے اختیارات بڑھ جاتے ہیں۔ مفتوح قوم کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر پورا تصرف ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو اس ملک کو اپنی تحویل میں لے لے۔ جس طرح آج کل کی حکومتیں بندر بانٹ کرتی ہیں اور چاہے تو زمین سابقہ مالکان کے پاس رہنے دے اور ان سے بنائی کا حصہ مقررہ شرح سے لگان (خراج) وصول کرے اور زمین سابقہ مالکان کے پاس رہے۔ اور چاہے۔ تو اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہو جائے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا۔

یہ زمینوں کا معاملہ تھا۔ کئی سرایا میں اموال غنیمت بھی حضور ﷺ نے واپس کر دیے تھے اور ایران جنگ سے آپ ﷺ کی فیاضی کا حال پہلے مفصل طور پر لکھا جا چکا ہے۔

جزیہ اور خراج:

عرب کی ہمسایہ اور متحدان حکومت ایران میں دو قسم کے ٹیکسوں کا رواج تھا۔ ایک زمین کا لگان جو صرف زمینداروں سے لیا جاتا تھا۔ اور اسے یہ لوگ خراگ کہتے ہیں۔ خراج کا لفظ اسی سے معرب ہے۔ دوسرا ٹیکس جو عام لوگوں سے دفاعی ضروریات کے پیش نظر لیا جاتا تھا۔ جسے یہ لوگ گزیت کہتے تھے۔ جز یہ اسی لفظ سے معرب ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ علاقے فتح کیے۔ تو انہوں نے مفتوح قوم پر کوئی نیا بار نہیں ڈالا۔ بلکہ وہی دونوں قسم کے ٹیکس ہی مفتوح قوم پر عائد کیے گئے جو شاہ ایران اپنی رعایا سے وصول

کرتا تھا۔ بلکہ جنگ کے موقع پر جزیہ کے علاوہ ٹیکس بھی ان سے وصول کیے جاتے تھے۔

جزیہ کے عوض اسلامی حکومت تمام دفاعی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتی ہے۔ چونکہ یہ ٹیکس دفاع سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا غیر مقاتل افراد یعنی بچے بوڑھے، عورتیں معذور، صوفی اور گوشہ نشین قسم کے حضرات اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایسی زبردست اقوام جو جزیہ ادا کر کے دفاعی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ اہل ذمہ کہلاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل ذمہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

زمین کا لگان مسلمانوں سے بھی وصول کیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو لگان مسلمانوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اس کا نام عشر ہے۔ جو زکوٰۃ کی ایک مد ہے اور جو لگان مفتوح اقوام سے وصول کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے۔ گویا اسلام مفتوح اقوام پر کسی قسم کا ناجائز اقتصادی بوجھ ڈالنے کا روادار نہیں۔

زکوٰۃ اور خراج کا فرق:

تاہم جزیہ اور خراج اور زکوٰۃ میں چند بنیادی فرق بھی ہیں مثلاً:-

(۱) زکوٰۃ کی شرح جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر کی وہ شریعت کا حصہ ہے۔ اس شرح میں رو بہدول ممکن نہیں۔ جبکہ جزیہ اور خراج کی شرح مقرر کرنے کا اختیار ہر امام وقت کو ہوتا ہے۔ اور اسے یہ اختیار بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں کسی مخصوص علاقہ میں یہ شرح زیادہ رکھے اور دوسرے میں کم۔ سفیان بن عیینہ عبد اللہ بن نجیح سے روایت کرتے ہیں۔

((قلت لمجاهد ماشان اهل الشام
عليهم اربعة دنانير واهل اليمن عليهم
دينار قال جعل ذلك من قبل اليسار))
(بخاری۔ کتاب الجہاد۔ باب الجزية المواعدة)
(میں نے مجاہد سے پوچھا شام کے کافروں
سے تو (سال میں) اچار دینار لیے ہیں۔ اور
یمن کے کافروں سے صرف ایک لیا جاتا
ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا اس
لیے کہ شام کے کافر زیادہ مال دار ہیں۔)

جزیہ کی شرط کی مختلف شکلیں:

ایران اور مصر کی متعدد حکومتیں عوام سے گزیت یا جزیہ قسم کا ٹیکس بھی لے لیتی تھیں اور

پھر ان سے طوعاً یا کرہاً فوجی خدمات بھی لیا کرتی تھیں۔ اسلام میں جزیہ چونکہ دفاعی اخراجات کے عوض لیا جاتا ہے لہذا اگر کوئی قوم یا ملک اپنی فوجی خدمات پیش کر دے تو وہ جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی جزیہ ادا کرے تو اس سے فوجی خدمت نہیں لی جاسکتی۔ اور اگر مسلمان انہیں تحفظ مہیا نہ کر سکیں تو انہیں جزیہ واپس کرنا ہوگا۔ تفصیل کے لیے ذیل کے واقعات ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) جنگ اصفہان میں (۲۱ھ) اسلامی لشکر کے سالار عبداللہ بن عبداللہ تھے اور ایرانیوں کی طرف سے قاؤ و سنان سالار لشکر تھا۔ قاؤ و سنان نے عبداللہ کو دعوت مبارزت دی۔ پہلے خود تلوار کا وار کیا۔ عبداللہ نے اس پامردی سے اس کے وار کا دفاع کیا کہ بے اختیار قاؤ و سنان کے منہ سے آفریں نکل گئی اور کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ بلکہ شہر اس شرط پر حوالہ کرتا ہوں کہ باشندوں میں سے جو چاہے جزیہ دے کر شہر میں رہے اور جو چاہے نکل جائے۔ عبداللہ نے یہ شرط منظور کر لی اور صلح نامہ لکھ دیا۔ (الفاروق ص ۲۳۹)

(۲) طبرستان کے ضلعی شہر جرجان کے رئیس مرزبان نے مسلمانوں کے سالار سوید سے صلح کر لی اور معاہدہ میں بتصریح لکھ دیا کہ ”مسلمان جرجان اور دہستان وغیرہ کے امن کے ذمہ دار ہیں۔ اور ملک والوں میں جو لوگ بیرونی حملوں کے روکنے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے وہ جزیہ سے بری ہیں۔“

(۳) جرجان کی خبر سن کر طبرستان کے رئیس نے بھی جو شہسوار کہلاتا تھا۔ اس شرط پر صلح کر لی کہ پانچ لاکھ درہم سالانہ دیا کرے گا اور مسلمانوں کو ان پر یا ان کو مسلمانوں پر کچھ حق نہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۲۳۳) گویا اس صلح نامہ سے زبردستی کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔

(۴) آذربائیجان کی فتح کے بعد باب متصل کا رئیس شہر براز خود مسلمانوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں تمہارا مطیع ہوں لیکن میری درخواست ہے کہ مجھ سے جزیہ نہ لیا جائے بلکہ جب ضرورت پیش آئے تو فوجی امداد لی جائے۔ چونکہ جزیہ درحقیقت صرف محافظت کا معاوضہ ہے۔ اس لیے شرط منظور کر لی گئی۔

(ایضاً ص ۲۳۳)

(۵) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب فسطاط فتح کیا تو مقوقس والی مصر نے جزیہ کی بجائے یہ شرط منظور کی کہ فوج اسلام چدھر رخ کرے گی سفر کی خدمت (یعنی راستہ صاف کرنا، سڑک بنانا، پل باندھنا وغیرہ)۔ مصری انجام دیں گے۔ چنانچہ عمرو بن عاص جب رومیوں کے مقابلے کے لیے اسکندریہ کی طرف بڑھے تو خود مصری منزل پہ منزل پل باندھتے، سڑک بناتے اور بازار لگاتے گئے۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کے سلوک نے تمام ملک کو گرویدہ کر لیا تھا اس لیے قبلی خود بڑی خوشی سے ان خدمتوں کو سرانجام دیتے تھے۔ (الفاروق ص ۳۹۴)

(۶) شام کی فتوحات کے سلسلہ میں جنگی مقاصد کے پیش نظر اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حمص سے واپس جانا پڑا تو آپ رضی اللہ عنہ نے ذمیوں کو بلا کر کہا۔ ”ہمیں تم سے جو تعلق تھا وہ اب بھی ہے۔ لیکن اب چونکہ تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں لہذا تمہارا جزیہ تمہیں واپس کیا جاتا ہے۔“ چنانچہ کئی لاکھ کی وصول شدہ رقم واپس کر دی گئی۔ عیسائیوں کو اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے تو رات کی قسم کھا کر کہا۔ کہ جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر لیے اور ہر جگہ چوکی کا پہرہ بٹھا دیا۔

(الفاروق ص ۱۹۱)

ان واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ جزیہ کی وصولی سے مقصود مفتوح قوم کو ذلیل کرنا ہرگز مقصود نہ تھا (جیسا کہ اہل مغرب نے تاثر دیا ہے) بلکہ اس کی حیثیت محض دفاعی ٹیکس کی تھی۔ اور وہ بھی اس پر جو اسے بخوشی قبول کرے۔

جزیہ اور خراج کی شرح اور وصولی میں نرمی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دو باتوں کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔

(۱) جزیہ یا خراج کی شرح ایسی ہو کہ وہ آسانی سے ادا کر سکیں۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں پر خراج کی تعیین کے لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، بن یمان رضی اللہ عنہ اور عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ جیسے اکابر بن صحابہ رضی اللہ عنہم کو مقرر کیا۔ جو اس فن میں کافی ماہر تھے۔ جب

ان بزرگوں نے یہ حساب پیش کیا تو آپ نے ان دونوں کو بلا کر کہا کہ تم نے تشخیص میں سختی تو نہیں کی؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ نہیں بلکہ اسی قدر اور گنجائش ہے۔
(کتاب الخراج ص ۲۱)

(۲) اس پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال جب عراق کا خراج آتا تو دس ثقہ اور معتمد اشخاص کو فہ سے اور اتنے ہی بصرہ سے طلب کیے جاتے۔ حضرت عمرؓ ان کو چار دفعہ شرعی قسم دلاتے کہ یہ مالگزاری کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم کر کے تو نہیں لی گئی ہے۔ (الفاروق ۳۱۶) جنگ کے بعد تاوان جنگ کا مسئلہ بھی قدیم سے چلا آتا ہے۔ پچھلی چند صدیوں میں تاوان جنگ کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی غلامی پر بھی مفتوح اقوام کو مجبور کیا جاتا رہا۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے سیاسی غلامی کو متروک قرار دے کر اس کے بدلے مہذب اقوام نے اقتصادی غلامی کے بندھن مضبوط کر دیئے ہیں۔ اسلام نے جزیہ کی ادائیگی کے بعد نہ تاوان جنگ عائد کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ کسی طرح کی اقتصادی غلامی کی۔

مسلمان اور شکست؟

مسلمان اگر فی الواقع مسلمان ہے۔ تو وہ شکست سے نا آشنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے:-

﴿وَأَنْتُمْ أَلَا تَعْلَمُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔) (۱۳۹/۳)

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:-

﴿وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (اور جو کوئی اللہ کے راستہ میں لڑائی کرے۔ پھر خواہ مارا جائے یا غالب آجائے تو ہم اس کو بہت بڑا اجر دیں گے۔) (۷۴/۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو صورتوں کے علاوہ مسلمان کے لیے تیسری کوئی صورت نہیں۔ راہ فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اور شکست اس کے تصور میں ہے ہی نہیں لیکن

مسلمان اس وقتی شکست کو بھی برداشت نہیں کرتا تا آنکہ فتح نہ پالے۔

مسلمانوں کی طرف سے صلح:

میدان جنگ میں مسلمان کو کسی وقت بھی بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ حوصلہ ہارنا چاہیے۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ کہ اپنے یا فوج میں کمزوری محسوس کرنے لگے تو دشمن کو صلح کی پیشکش کر دے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَبْرِكُمْ أَعْمَالَكُمْ﴾ (۳۵/۴۷)

(بزدلی نہ دکھاؤ اور صلح کے لیے نہ پکارنے لگ جاؤ تم ہی غالب رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (رائیگاں) نہ کرے گا۔)

گویا مسلمان کو یہ حکم ہے کہ وہ آخر دم تک لڑائی جاری رکھے، نہ فرار کی بات سوچے اور نہ دشمن سے صلح کی۔ یا فتح حاصل کرے یا خود ختم ہو جائے بقول شاعر۔

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے
یا تخت جگہ آزادی کی یا تختہ مقام آزادی کا

غیر مسلم کی اطاعت:

آج کے ماہرین حرب لڑائی کا ایک اہم اصول ”تادم آخر“ بھی بیان کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آخری سپاہی کو آخری گولی تک لڑنا چاہیے۔ غالباً یہ اصول آیات بالا سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام کسی صورت غیر مسلم حکومت کی اطاعت کی اجازت نہیں دیتا ارشاد باری ہے:-

﴿فَلَا تَطْعَمُ الْكُفْرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ (۵۲/۲۵)

قوت کے ساتھ ان سے جہاد کرو۔

دور نبوی ﷺ میں دو موقعوں پر شکست کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ گو بعد میں فتح ہو گئی۔ تاہم ان مواقع پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جنگ احد میں شکست کے اسباب قرآن کریم نے یہ بیان کیے ہیں:-

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّوهُنَّ﴾ (اور اللہ تعالیٰ نے تو اپنا (فتح کا) وعدہ پورا

کر دیا۔ جب تم کافروں کو اس کے حکم سے بے دریغ قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے اللہ تعالیٰ نے تم کو دکھا دیا۔ پھر تم نے ہمت ہار دی اور کام میں تنازعہ پیدا کیا اور اس کی نافرمانی کی۔ بعض تو تم میں سے دنیا کے خواست گار تھے اور بعض آخرت کے طالب۔ اس وقت تم کو ان (کے مقابلے) سے پھیر (کر بھگا) دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

بِأَذْنِهِ حَتَّىٰ إِذَا فُيِسْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرْكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢/٣﴾

اس آیت میں فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کی شکست کے تین اسباب بیان کیے گئے ہیں:-

(۱) انہوں نے اطاعت امیر سے سرتابی کی۔ رسول اکرم کی بھی اور عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی بھی۔

(۲) حکم مل جانے کے بعد اجتہاد شروع کر دیا۔ پھر آپس میں جھگڑا کیا۔ اس طرح اصل مقصد کے حصول میں کمزوری پیدا ہو گئی۔

(۳) بعض لوگوں کو مال غنیمت کے حصول کی کوشش نے اصل مقصد سے غافل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد انہیں معاف بھی فرما دیا تاکہ شکستہ دل نہ ہوں اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لیں۔

اور جنگ حنین میں قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق شکست کا سبب درج ذیل تھا۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ (۲۵/۹)

(اور حنین کے دن) بھی اللہ نے تمہاری مدد کی (جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا۔ اور وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔)

گویا اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب مادی وسائل پر تکیہ کر لینا تھا۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی اکثریت کو شکست بھی ہو سکتی

ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے توکل کے خلاف تھی۔ اسلامی نظریہ کے مطابق گومادی وسائل سے بھر پور استفادہ بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جس کے سامنے بعض دفعہ مادی وسائل بیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً﴾ (اور کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چھوٹی جماعت اللہ
بِأُذْنِ اللَّهِ ﴿۲۳۹/۲﴾ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آگئی۔)

ان تصریحات سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمان کو شکست صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب وہ اصول و قوانین جنگ یا اخلاقی اقدار میں سے کسی قدر سے غافل ہو جاتا ہے پھر جب مسلمانوں میں اخلاقی اور عملی طور پر انحطاط واقع ہو گیا۔ تو ان کو بھی ایسے ہی شکستوں سے دوچار ہونا پڑا جیسے دوسری اقوام کو ہوتا ہے۔ علماء و فقہاء اسلام اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اگر مسلمان اپنے سے دو گنا جماعت کے مقابلہ سے جی چرائیں یا ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں تو انہیں اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:-

﴿الَّذِينَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ
ضَعْفًا فَإِن يَكُنْ مِنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا
مِائَتِينَ وَإِن يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفِينَ
بِأُذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (۶۶/۸)

(اب اللہ تعالیٰ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا۔
اور معلوم کر لیا کہ تم میں کسی قدر کمزوری ہے۔
پس اگر ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں
گے تو دو سو پر غالب رہیں گے، اور اگر ایک
ہزار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو ہزار
پر غالب رہیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ثابت قدم
رہنے والوں کا مددگار ہے۔)

شکست مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت بھی ہے اور چیلنج بھی۔ انہیں اپنے اسلام کی فکر کرنا چاہیے۔ شکست کے بڑے اسباب قومی یکجہتی کا فقدان، جہاد سے غفلت یا نفرت اور مال و دولت سے محبت ہیں جن کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے اور یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر تم ان باتوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے مسلمان کہلانے کی بنا پر کوئی لحاظ نہیں کرے گا بلکہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا جو مندرجہ بالا اوصاف میں تم سے بہتر ہوگی۔

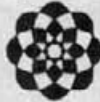
شکست کے بعد مسلمان کا کافروں کی قید میں چلا جانا ذلت پر مزید ذلت ہے اور اسلام

کی رسوائی کا سبب۔ جو نسا بھی طریق اختیار کرنا پڑے قیدیوں کو جلد از جلد چھڑانا چاہیے۔ حضور اکرمؐ نے اس کے لیے بہت تاکید فرمائی ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظریہ جنگ کے مطابق شکست ایک غیر مترقبہ حالت ہے جسے غیر معمولی مجبوری کی حالت میں ہی برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لہذا سپہ سالار کے لیے یہی مناسب ہے کہ اگر اس کی افواج حصول فتح کے لیے ناکافی ہوں تو اسے جنگ سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر اسے شکست نظر آ رہی ہو تو پیچھے ہٹ جائے اور باقی ماندہ مسلمانوں کی جانیں بچائے۔ شکست خوردہ مسلمان برابر ارادہ رکھتے تھے۔ کہ جنگ پھر کریں گے خواہ اس کے لیے کتنی ہی مدت انتظار کرنا پڑے پھر اسلام میں دنیوی جنگیں شروع ہو گئیں تو فتح و شکست کا فیصلہ جہاد کی طرح مقاصد کی حقانیت پر نہیں بلکہ فوجوں کی ہمت استقامت اور سپہ سالاروں کی تدبیروں پر ہونے لگا۔ ایسی جنگوں میں شکست بھی گناہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ خواہ مقابل حکمران مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر خدانخواستہ کوئی افتاد آ پڑے اور امیر کو بحالت مجبوری دشمن سے صلح کرنا پڑے تو اس صلح کی مدت حدیبیہ سے کم ہونی چاہیے۔ اور ساتھ ہی جہاد کی تیاری شروع رکھنا چاہیے۔ تاکہ مدت پوری ہونے پر جہاد شروع کیا جاسکے۔ اگر پھر بھی امیر کو یہ محسوس ہو کہ لڑنے کی قوت پیدا نہیں ہوئی، تو اتنی ہی مدت کے لیے معاہدہ کی تجدید ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مدت کے لیے صلح کی تو کا اہم سمجھی جائے گی۔

(کتاب الامام شافعی ج ۳ ص ۱۱۰ بحوالہ اسلام اور قانون جنگ و صلح ۱۳۹-۱۴۰)



اسلامی اور بین الاقوامی قوانین جنگ کا تقابل

پچھلے باب میں ہم نے اسلامی قوانین صلح و جنگ مختصر آبیان کر دیئے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی قوانین، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، ان کا ماخذ قرآن و سنت کے بعد صحابہ کا تعامل ہے۔

بین الاقوامی قانون کا آغاز:

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ صلح و جنگ سے متعلق بین الاقوامی یا بین المللی قانون

INTER NATIONAL LAW کیا ہے۔ اور اس کے ماخذ کون کون سے ہیں؟

سترہویں صدی عیسوی سے قبل یورپ میں بین الاقوامی قوانین صلح و جنگ کا تصور تک

موجود نہ تھا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں ۱۶۱۸ء میں جب یورپ میں جنگ ۳۰ سالہ چھڑی۔ تو

اس میں وحشت و بربریت کے وہی مظاہرے ہوئے جو دور جاہلیت میں رائج تھے اور ذاتی اغراض

و مقاصد کے تحت جنگ، جنگ میں بہیمانہ نہ طور پر قتل و غارت اور لوٹ مار، قیدیوں کا قتل یا زندگی

بھر کے لیے غلامی اور پھر ان سے انسانیت سوز سلوک نہیں کچھ یورپ میں اس وقت تک رائج تھا۔

اس وحشت و بربریت نے کچھ درد مند لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا کہ اس وحشت و بربریت کو ختم

کرنے کے لیے جنگ کے لیے کچھ اخلاقی ضوابط مقرر کیے جانے چاہئیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں

سب سے پہلی کوشش ہالینڈ کے ایک درد مند گروٹیوس Grotius نے کی۔ اس نے ۱۶۲۵ء

میں ایک کتاب (DEJURE BALLIAC PACIS) شائع کی۔ جس میں جنگ کے

اخلاقی ضوابط پیش کیے گئے تھے۔ جن کی حیثیت محض سفارشات کی تھی۔

اہل یورپ مذہب سے تو پہلے ہی بیزار تھے، مسیحیت میں انہیں مذہب کی طرف سے

ایسے قوانین کی کچھ رہنمائی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ لہذا گروٹیوس کی اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوا۔

اور یہ کتاب ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی میں بطور نصاب شامل کر لی گئی۔
بعد ازاں دوسرے مصنفین اور سیاسی مدبرین نے تصنیفات، رسائل اور مضامین کے ذریعہ گروٹیوس کے مشن کی آبیاری کی اور اسے مزید آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

بین الاقوامی قانون کے ماخذ:

آج کا بین الاقوامی قانون دو اقسام پر مشتمل ہے۔ پہلی قسم تحریری یا مدون (WRITTEN) ہے۔ جو مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہیں۔

- (۱) اخلاقی گروہ یا سیاسی مدبرین کے افکار و تصانیف جن کا اوپر ذکر ہو چکا۔
- (۲) مختلف اقوام کے آپس میں باہمی سمجھوتے اور تحریری معاہدات جن کی رُو سے جنگ کے لیے ضوابط طے کر لیے گئے ہیں۔
- (۳) مختلف امن کانفرنسوں میں پیش یا پاس ہونے والی تجاویز، جو مختلف ادوار میں جنیوا، ہیگ اور دوسرے مقامات پر منعقد ہوتی رہیں۔

بین الاقوامی قانون کی دوسری قسم غیر مدون یا بے لکھی (UN WRITTEN) ہے۔ جو مختار قوموں کے باہمی معاملات اور عملی سیاسیات سے عبارت ہے۔

ان دونوں مندرجہ اقسام میں سے کون سی قسم زیادہ معتبر یا مستند ہے اور اختلافات کی صورت میں حجت بننے کی صلاحیت کس میں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا آج تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قانونی گروہ یا قانون کے مدون کرنے والے ایک مہذب قاعدہ وضع کرتے ہیں تو فوجی گروہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور چونکہ عمل کی تمام قوتیں فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اس لیے کتابوں میں لکھا ہوا قانون کتابوں میں دھرا رہتا ہے۔ اور اصلی قانون جنگ وہ ہوتا ہے۔ جس کو فوجیں خود اپنے عمل سے میدان جنگ میں وضع کرتی ہیں۔ فوجی گروہ یہ کہتا ہے۔ کہ جنگ کو کسی ضابطہ اور قانون کے تحت لانا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ جنگ اور قانون میں ایک فطری تناقض ہے۔ جنگ قانون کی طبیعت کے عین خلاف ہے اور جنگ کا اصلی قانون وہ نہیں جو ہیگ اور جنیوا میں مرتب کیا گیا ہے بلکہ وہ ہے جسے میدان جنگ میں تو پیش اور سنگینیں مدون کرتی ہیں۔

اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کا بنیادی فرق:

اب دیکھئے اصلیت کے اعتبار سے اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون میں مندرجہ ذیل بنیادی امور میں فرق پایا جاتا ہے:-

(۱) اسلامی قانون ایک بالاتر ہستی کا عطا کردہ ہے۔ لہذا کم از کم مسلمانوں کے لیے حجت ہے لیکن مغربی قانون انسانوں کا اپنا بنایا ہوتا ہے۔ لہذا وہ نزاع کی صورت میں کسی بھی فریق کے لیے قابل حجت نہیں ہوتا۔

(۲) مسلمان اسلامی قانون کے تابع ہو کر چلتا ہے مسلمانوں کو اس میں حذف و ترمیم کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ لیکن بین الاقوامی قانون میں چونکہ ہر وقت رد و بدل ممکن ہے۔ لہذا یہ قانون خود اقوام کی مرضی کے تحت چلتا ہے۔ اور جس چیز کو کوئی ”بڑی طاقت“ پسند نہیں کرتی وہ قانون سے حذف کر دی جاتی ہے۔

(۳) بین الاقوامی قانون صرف ان حکومتوں کے لیے حجت بن سکتا ہے۔ جنہوں نے معاہدہ پر دستخط کر دیئے ہوں۔ یا تجاویز سے متفق ہوں۔ ان میں سے اگر ایک فریق اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو دوسرے کے لیے خلاف ورزی از خود جائز ہو جاتی ہے۔ جبکہ مسلمان کو متحارب فریق کی قانون شکنی سے کچھ سرکار نہیں ہوتا۔ وہ بہر حال اسلامی قانون کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔

تقابل:

اسلامی اور بین الاقوامی قوانین کا تقابل کرنے کے لیے ہم انہیں درج ذیل اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) وہ قوانین جو ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔
(ب) وہ قوانین جو نظری اعتبار سے تو آپس میں ملتے جلتے ہیں لیکن عملی اعتبار سے متصادم ہیں۔

(ج) ایسے قوانین جو دونوں میں ملتے جلتے اور موافقت رکھتے ہیں۔

اسی ترتیب سے ہم یہ تقابل ذرا تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) متصادم قوانین

(۱) جنگ کے اغراض و مقاصد:

ہم بتا چکے ہیں کہ یورپ میں ضوابط جنگ کی تدوین کا آغاز گروٹیوس کی مشہور کتاب (DEJURE BALLIAC PACIS) کی تصنیف سے ہوا تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے جنگ کے جائز و ناجائز مقاصد میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عہد جدید کے بین الاقوامی قانون نے اس سوال کو قطعاً خارج از بحث قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں مندرجہ ذیل مقاصد کو عملاً جنگ کے آغاز کے لیے جائز مقاصد سمجھا جاتا ہے۔

- (۱) اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے دنیا کی ثروت کا اجارہ حاصل کرنا۔
- (۲) اگر کوئی حریف تجارت و صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہو تو اس کا سرکچل دینا۔
- (۳) اپنے دور دراز کے مقبوضات کے راستہ میں جو ممالک واقع ہوں انہیں اپنے زیر اثر رکھنا۔
- (۴) ملکوں اور سلطنتوں کے حصے بخرے کرنا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنانا۔
- (۵) اگر کسی قوم سے دشمنی ہو جائے، خواہ کسی وجہ سے ہو تو اسے مٹا دینا یا کم از کم اس کا زور توڑ دینا۔

اس کی مثال حالیہ عراق امریکہ جنگ ہے۔ اس جنگ کے بڑے مقاصد جو سامنے آئے ہیں اول تو امریکہ خلیج کی ریاستوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ تیل کے تمام کنوؤں پر قبضہ کر سکے اور عرب ممالک میں ہر طرح اپنی من مانی کر سکے۔ اور دوسرا مقصد اسرائیل کے ناپاک پودے کو تباہ و درخت بنانا ہے۔ یہودی قوم دولت مند ہونے کے باوجود افرادی قوت کی قلت کا شکار ہے۔ پہلے پہل برطانیہ کے تعاون سے یہ ریاست وجود میں آئی۔ پھر امریکہ اس کا دست بازو بن گیا اور آج یہ عراق امریکہ جنگ بھی اسرائیل کو وسیع تر بنانے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا اور سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کے مقدس مقامات حرمین شریفین پر ناجائز قبضہ کرنا ہے۔ امریکہ خلیج کی ان پانچ ریاستوں عراق، کویت، یمن، قطر اور سعودی عرب کو گیارہ ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ بلکہ ان کے امریکہ نواز حکمرانوں کے نام بھی سوچ رکھے

ہیں۔ اس طرح امریکہ مسلمانوں کو انفرادی اور ملکی سطح پر ہر دو پلیٹ فارموں پر کمزور سے کمزور تر کرنا چاہتا ہے۔ وہ مسلمان جو کہ شہادت کی تمنا کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے ہیں اور یہی چیز یہود و نصاریٰ کی نیندیں حرام کرنے کو کافی ہے۔

عراق پر قبضہ کرنا امریکہ کی منزل نہیں بلکہ منزل کے حصول کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس جنگ میں امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ جس طرح عراق کے عوام پر میزائل اور دوسرے ایٹمی ہتھیارات سے گولہ باری کر رہا ہے یہ انسانیت کے منہ پر بدنما داغ ہے۔ ان حملوں میں بچے بوڑھے عورتیں اور نئے نئے عوام غرض کسی کی تمیز نہیں کی گئی۔ امریکہ جو کہ ایک مہذب قوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے تمام دعووں کا پول کھل گیا ہے۔ اس جنگ کا دینی دنیاوی اور اخلاقی غرض کسی طور پر بھی کوئی جواز نہیں۔

یہ ہیں وہ مقدس حقوق جن کی بنا پر جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور مغربی اقوام کا تعامل انہیں جائز قرار دیتا ہے۔

اب دیکھئے اسلامی قانون مندرجہ بالا مقاصد میں کسی ایک مقصد کو جائز قرار نہیں دیتا اور ان اغراض کے تحت کی جانے والی جنگ کو فساد فی الارض قرار دیتا ہے۔ اور اسی فساد فی الارض یا ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت لڑی جانے والی جنگوں کے خاتمہ کے لیے جہاد کو فرض قرار دیتا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اغراض و مقاصد جنگ کے لحاظ سے اسلامی قانون اور مغربی قانون آپس میں متصادم ہیں۔

جزیہ اور خراج کے بجائے اقتصادی تباہی:

اسلام مفتوح قوم سے جزیہ وصول کر کے اس ملک کے دفاعی اخراجات کا خود ذمہ دار بنتا ہے۔ اس حفاظت میں قاصر رہے تو رقم واپس کر دیتا ہے۔ جزیہ کی شرح کی تعیین لوگوں کی مالی حالت دیکھ کر زمی کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ وصولی میں جبر کا قائل نہیں اور مفتوح قوم کے معذور افراد سے جزیہ لینے کی بجائے بیت المال ان کے وظائف مقرر کرتا ہے۔

یہی صورت حال خراج کی ہے۔ اس کی شرح کی تعیین زمین کی پیداوار کو ملحوظ رکھ کر نہایت واجبی شرح عائد کرتا ہے اور وصولی میں کسی طرح کے جبر کا روادار نہیں۔ فصل کا نقصان ہونے کی صورت میں خراج لینے کی بجائے اس کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

یہ دونوں ٹیکس ویسے ہیں جو ہر ملک میں رعایا سے وصول کیے جاتے ہیں۔ حکومت خواہ اپنی ہو یا غیر قوم کی، یہ ٹیکس ہر قوم اور ہر ملک میں رائج ہیں۔ اور حکومتوں کے اخراجات کا بیشتر حصہ انہی ٹیکسوں سے پورا کیا جاتا ہے۔

اسلام نہ تو مفتوح اقوام پر کوئی ناجائز ٹیکس عائد کرتا ہے۔ نہ ہی انہیں اقتصادی طور پر کمزور یا مفلوج کرنے کا خواہش مند ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے۔ کہ ان کا زیر اثر حلقہ پھیلے پھولے۔

مغرب کی مہذب اقوام جزیہ اور خراج جیسے ٹیکس عائد نہیں کرتیں۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے جزیہ اور خراج پر اعتراضات کی بوچھاڑ بھی کی ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اس پہلو میں مفتوح اقوام کے ساتھ ان کا اپنا کردار کیسا ہے۔

جنگ عظیم اول میں 1917ء میں فرانس اور روس میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا کہ دریائے رہائن کے مغربی جانب کا تمام علاقہ جرمنی سے چھین کر فرانس کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔ رہائن کا یہ علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ لہذا فرانس نے اس خفیہ معاہدہ کو اپنے دوستوں یعنی برطانیہ اور امریکہ وغیرہ سے بھی سیغہ راز میں رکھا۔ جب اختتام جنگ کے بعد صلح کانفرنس یا معاہدہ میں تقسیم غنائم کا مسئلہ پیش ہوا تو امریکہ اور انگلستان نے ڈٹ کر فرانس کے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ آخر فرانس کے وزیر اعظم موسیو کلیمینٹو نے یہ تجویز پیش کی کہ جرمنی پر جو تادان جنگ عائد کیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت کے طور پر رہائن کا علاقہ ۱۵ سال کے لیے فرانسیسی قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس چال کو فرانس کے سیاست دان بھی نہ سمجھ سکے اور انہوں نے وزیر اعظم کی مخالفت کی تو وزیر اعظم صاحب نے جواب دیا کہ:-

”۱۵ سال کی تعین کا مقصد یہ ہے۔ کہ جرمنی کے ہاتھ سے اس کے بہترین علاقے چھین کر اس پر اتنا تادان ڈال دیا جائے کہ وہ اس کو مدت معینہ کے اندر ادا کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اور ہم پندرہ سال گزرنے کے بعد علاقہ رہائن کو ہمیشہ کے لیے ملحق کر لیں۔“ چنانچہ وزیر اعظم کی اس تجویز پر اپنوں اور بے گانوں سب کا اتفاق ہو گیا۔

دوسرا کام فرانس نے یہ کیا کہ پولینڈ کی نئی ریاست کا نقشہ کچھ اس طرح مرتب کر لیا کہ اس سے مشرقی پروشیا کا تعلق دولت پروشیا کے باقی علاقوں سے بالکل منقطع ہو گیا۔ اور ایسی

صورت پیدا کر دی۔ کہ اگر جرمنی کسی وقت بھی جنگ عظیم کے مصائب سے افاتہ پائے تو افاتہ پاتے ہی سب سے پہلے فرانس کے بجائے پولینڈ سے الجھ جائے اور یہ بات فی الواقع پوری ہو کر رہی۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز آخر کار پولینڈ ہی پر جرمن کے حملہ سے ہوا۔

پھر جب 1922ء میں فرانس کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ جرمنی ان تمام پابندیوں کے باوجود 15 سال کے اندر رہائش کو واکزار کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو اس نے اپنے شکار پر ایک ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ یہ کہ جرمنی کے ایک دوسرے زرخیز علاقہ روہر پر فوج کشی کر کے اس پر مستقل قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ 1933 کی ابتدا ہی میں فرانس نے فوجیں بھیج کر جرمنی کو اس علاقہ سے محروم کر دیا۔ جس پر اس کی صنعتی اور معاشی زندگی کا تمام تر انحصار تھا۔

ہم اس مختصر جائزہ میں زیادہ مثالیں پیش نہیں کر سکتے۔ ورنہ خفیہ معاہدات اور تقسیم غنائم کا جو باب بھی آپ کھولیں گے آپ کو یہی کچھ نظر آئے گا۔ کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہوتے ہیں اور کھانے کے اور۔ ان کی نظری سیاست جتنی دلفریب نظر آتی ہے۔ عملی سیاست اتنی گھناؤنی نظر آئے گی۔ اسلام ایسی منافقت، دو عملی اور ڈپلومیسی کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے:-

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (۳: ۷۱)
ایسی بات کہو جو کرتے نہیں۔

مغربی اقوام کو جزیہ اور خراج پر تو یہ اعتراض ہے کہ ان کی وصولی سے مفتوح اقوام کو اقتصادی طور پر کمزور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بجائے تاوان جنگ کی بھاری رقوم اور پھر اس بہانے مفتوح قوم کے زرخیز علاقوں پر جبراً قبضہ کر کے انہیں اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دینے میں انہیں کوئی خرابی نظر آتی۔

(ب) نظری اعتبار سے موافق قوانین

(۱) ایفائے عہد اور خفیہ معاہدات:

ایفائے عہد کو اسلامی نقطہ نگاہ سے ایمان کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اور ہم کسی دوسرے مقام پر ایسی کئی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے بڑے

نازک اوقات میں اور اپنا نقصان اٹھا کر بھی عہد و معاہدہ کو حتی الامکان پورا کیا ہے۔ جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے مغربی قانون بھی وعدے کی پابندی پر زور دیتا ہے کیونکہ معاہدات کی ہی اس لیے جاتے ہیں کہ فریقین ایک طے شدہ امر کے مطابق مطمئن ہو کر اپنی پالیسی وضع کریں۔ لیکن عملی حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کی مہذب دنیا نے موقع سے اٹھانے کی خاطر ظاہری معاہدات کے زیر زمین خفیہ معاہدات کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔ اور اس منافقت کا نام فن سیاست یا ڈپلومیسی DIPLOMACY رکھ لیا ہے۔ اس ڈپلومیسی اور خفیہ معاہدات کا منظر جو پہلی جنگ عظیم میں سامنے آیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے:-

یہ یاد رہے کہ ابتدا میں اس جنگ میں حصہ لینے والے صرف چھ سات ممالک تھے۔ ایک فریق جرمنی، آسٹریلیا اور ہنگری پر مشتمل تھا۔ دوسرے فریق میں برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی شامل تھے۔ یہی دوسرا فریق اپنے آپ کو حق پرست ہونے کا دعویٰ لے کر اٹھا تھا اور اتحادی کہلاتا تھا۔

اتحادی اپنے مفادات کی خاطر ترکی حکومت کا زور ختم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا عرب ممالک کو بغاوت پر اکسانے اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ چال چلی کہ بارہ عربوں کو یقین دلایا گیا کہ ”جنگ کے اختتام پر عربوں کی ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر دیں گے۔ اور انہیں بتایا کہ یہ جنگ محض عربوں کو ترکی کے شہنشاہ سے نجات دلانے کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب 11 مارچ 1917ء کو جنرل ماڈ MAUD بغداد میں داخل ہوا تو اس نے ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

”ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ حیثیت سے نہیں داخل ہوئے۔ ہم آپ کے دشمن نہیں۔ بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں۔ بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہیے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علماء فقہا کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں۔ ان کا ملک ایک مرتبہ پھر آزاد ہو۔ اور اس میں ایسے آئین و قوانین نافذ ہوں جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مطابق ہوں۔“

اور جنگ کے خاتمہ پر فرانس اور انگلستان کی جانب سے ایک مشترکہ منشور بلا د عرب میں شائع کیا گیا۔ جس میں نہایت بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ:-

”یہ جنگ جو دنیا کو جرمنی کے توسیعی عزائم سے بچانے کے لیے برپا کی گئی تھی۔ اس

کے خطرات و مصائب کو مشرق تک توسیع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس ان تمام قوموں کو جو ایک طویل زمانہ سے جو روس کی تختہ مشق بنی ہوئی تھیں، کامل آزادی دلانا چاہتے ہیں اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی وطنی حکومتیں اور ادارات قائم کیے جائیں جو ان قوموں کی اپنی رغبت و خواہش پر مبنی ہوں اور جن میں کوئی دوسرا ذخیل نہ ہو۔

ان اعلانات سے، بنوئی واضح ہوتا ہے کہ اتحادیوں نے ترکی کی حکومت کا خاتمہ کرنے اور عربوں کی بھرپور حمایت حاصل کرنے کے لیے صرف دوران جنگ ہی نہیں جنگ کے اختتام پر بھی ایسے اعلانات اور معاہدات کیے تھے۔ جو فی الواقع عربوں کے مفاد میں تھے۔ لیکن اصل حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور تھی۔ فرانس اور برطانیہ نے 1915ء اور 1916ء میں آپس میں خفیہ معاہدات کیے۔ 1916ء کے خفیہ معاہدہ لیبوسائیکس پیکو کے نام سے مشہور ہے، کی رو سے یہ طے ہوا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد:-

(۱) عراق کلیتاً برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا۔

(۲) شام پورے کا پورا فرانسیسی سلطنت کے دائرہ میں رکھا جائے گا۔

(۳) فلسطین ایک بین الاقوامی علاقہ ہوگا اور حیفا اپنے بندرگاہ سمیت برطانیہ کے اثر میں رہے گا۔

(۴) باقی رہے وہ ممالک جو عراق اور سواحل شام کے درمیان واقع ہیں۔ سوان کو دو حلقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک حصہ فرانس کے زیر اثر ہوگا اور دوسرا برطانیہ کے۔

ادھر یہ معاہدات طے پا چکے تھے اور ادھر یہ حق پرست عربوں کو بانگ دہل یہ یقین دلارہے تھے کہ وہ محض ان کے نجات دہندہ ہیں اور جنگ کے بعد انہیں ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنے میں مدد دیں گے جس پر ان کا کسی قسم کا تسلط نہ ہوگا۔

جب عربوں نے دیکھا کہ ان لفظی اعلانات کے باوجود شام کے سواحل پر فرانسیسی فوجیں مسلط ہیں اور عراق اور فلسطین میں انگریزی فوجیں پہنچ چکی ہیں۔ تب جا کر انہیں معلوم ہوا کہ حقیقتاً ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اور یہ چال محض ترکوں اور عربوں میں نفاق ڈال کر ملک چھیننے کی خاطر چلی گئی تھی۔

۱ واضح رہے کہ ایسے خفیہ معاہدات دوسرے "حق پرستوں" یعنی اٹلی اور روس سے بھی صیغہ راز میں رکھے گئے تھے۔

جب عربوں کو ہوش آیا تو انہوں نے شام میں امیر فیصل بن حسین کے تحت ایک وطنی حکومت قائم کر لی۔ ادھر فرانس اور برطانیہ میں معاہدہ سائیکس پیکو کے باوجود تقسیم غنم میں تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ برطانیہ دراصل اپنے طے شدہ حصے سے بہت زیادہ ہوس کرنے لگ گیا تھا۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا تنازعہ طویل ہو رہا ہے۔ اور اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں وطنی حکومت زور پکڑ رہی تھی تو پھر آپس میں متحد ہو گئے اور 1920ء میں بمقام سان ریمو ایک نیا سمجھوتا کر کے ”نئی بندر بانٹ“ پر اتفاق کر لیا۔ اور دنیا کو دھوکہ دینے کی غرض سے یہ ظاہر کیا کہ یہ تینوں ممالک ان کو اقوام متحدہ کی طرف سے انتداب دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ نہ جمعیت اقوام کو اس بات کا کوئی حق پہنچتا تھا، نہ اس وقت تک جمعیت اقوام کا کوئی اجتماع ہوا تھا۔ اور نہ ہی انتداب کے متعلق کوئی فیصلہ کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ مراحل پورے چھ ماہ بعد نہایت مکرو فریب سے طے کیے گئے تھے۔

دوسری طرف اہل عراق کو تلوار کے زور سے کچلا گیا۔ جو برطانوی انتداب کا نام سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے۔ جس زمین پر ”ظالم“ ترکوں نے ۱۴ ہزار سے زیادہ فوج کبھی نہ رکھی تھی۔ اس پر ”نجات دہندہ“ برطانیہ نے ۹۰ ہزار فوج مسلط کر دی۔ اور جس زمین پر ”ظالم“ ترکوں نے سالانہ دو سو سے زیادہ عربوں کو کبھی قتل نہیں کیا تھا ”وہاں حق پرست“ برطانیہ نے ایک ہی موسم گرما میں دس ہزار عربوں کو قتل کر ڈالا۔

اب برطانیہ نے اپنے ظاہری وعدوں کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ چال چلی کہ وہاں براہ راست حکومت کی بجائے ایسی نام نہاد قومی حکومت قائم کر لی جو برطانیہ کی خواہش کے تابع اور اس کے مفادات کی محافظ ہو۔ چنانچہ اہل عراق کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے ۲۳/ اگست 1922ء کو شاہ فیصل کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا اور اس کی قیمت یہ وصول کی کہ اسے ایک معاہدہ پر مجبور کیا گیا جس کی رو سے عراق بالواسطہ مکمل طور پر برطانیہ کے اثر و اقتدار کے تحت آجاتا تھا۔ اور عراقی پارلیمنٹ سے اس معاہدہ کی تصدیق و توثیق کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ آدھی رات کو یہ مسودہ مجلس وطنی میں پیش کیا گیا۔ اور ارکان مجلس کو بستروں سے اٹھا اٹھا کر پولیس کی معرفت بلوایا گیا اور جبراً ان سے ووٹ لے کر اعلان کیا گیا عراقی پارلیمنٹ نے معاہدہ کی توثیق کر دی ہے۔

پھر ان خفیہ معاہدات کا حلقہ صرف عربوں تک ہی محدود نہ تھا۔ اتحادی آپس میں بھی وقتاً

فوقاً ہوا کا رخ دیکھ کر ایسے معاہدات کر لیتے تھے۔ جنہیں دوسرے حق پرستوں سے صیغہ راز میں رکھا جاتا تھا۔ بین الاقوامی ڈاکہ زنی کی یہ اسکیم شانہ صیغہ راز میں ہی رہ جاتی اگر دوران جنگ روس انقلاب کا شکار نہ ہو جاتا۔ اپریل 1917ء میں جب راز کی حکومت کا تختہ الٹا اور بالشویکوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے سرمایہ دار حکومتوں کے گھناؤنے کردار کو بے نقاب کرنے کے لیے وہ تمام خفیہ معاہدات شائع کر دیئے۔ جو انہیں زار کی حکومت کے نہاں خانوں میں دستیاب ہوئے تھے۔ ان معاہدات کی کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس میں مخالف سلطنتوں کے کسی نہ کسی علاقہ یا ان کی اقتصادی ثروت کے کسی نہ کسی وسیع علاقے کو ان ”حق پرستوں“ نے آپس میں بانٹنے کا فیصلہ نہ کیا ہو۔

(۲) مہلک آلات جنگ کا استعمال:

جنگ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی قوت ارادی کو مفلوج کر کے اسے اطاعت پر مجبور کر دیا جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اور دشمن کے مال و جان کا نقصان کم سے کم ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے دریغ قتل و غارت یا دہشت گردی کے بعد بھی دشمن اطاعت پر آمادہ نہیں ہوتا۔ لہذا انسانیت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ دشمن کے جان و مال کی بربادی کو اصل مقصد نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔

لیکن موجودہ دور کے آلات جنگ، اور بمبار ہوائی جہاز اس لحاظ سے انتہائی وحشیانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ نہ ہی وہ مقاتلین اور محاربین میں کوئی تمیز روا رکھتے ہیں۔ اور شاید رکھ بھی نہیں سکتے۔ ایسے وحشیانہ افعال سے بربادی و ہلاکت تو اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن کبھی کوئی علاقہ فتح نہیں ہوتا۔ اس صورت حال نے مغربی اقوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایسے افعال پر پابندی عائد کریں۔ چنانچہ 1868ء اور 1907ء کی کانفرنسوں میں یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ دشمن کو ایسا جانی نقصان نہ پہنچانا چاہیے جو جنگ کے مقاصد میں کوئی مدد نہ دے مگر اس کی تکالیف میں غیر معمولی اضافہ کا باعث ہو۔ اس اصول کے مطابق حسب ذیل اشیاء کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

(۱) اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے جن کا وزن ۱۱۴ اونس سے کم ہو۔

(۲) پھینکنے والی گولیاں جو جسم میں داخل ہو کر پھیل جاتی ہوں۔

اسلامی اور بین الاقوامی جنگ کا تقابل

(۳) زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسوں۔

(۴) بیلونوں اور ہوائی جہازوں سے پھنسنے والے گولے برسانا۔

یہ تجاویز بھی بس صفحہ قرطاس کی زینت ہی بنی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں ان تمام مہلک آلات کا فریقین کی طرف سے بے دریغ استعمال کیا گیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم کے استعمال نے تو ان تجاویز کے پرچے اڑا دیئے۔

اسلام نے اس سلسلہ میں ایک زریں اصول بتا دیا ہے۔ کہ بے مقصد اور بلا ضرورت دشمن کے جان و مال سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ محض دہشت پھیلانے کے لیے ایسے افعال کا کوئی جواز نہیں۔ اور اس اصول پر عمل درآمد کی بہترین مثال فتح مکہ ہے۔ ربا دشمن کے جدید سے جدید تر مہلک آلات کے استعمال کا مسئلہ۔ تو اسلام نے اس سلسلہ میں یہ ہدایت دی ہے کہ ایسے باہمی سمجھوتے کرنے کے بعد وہ پہل کر کے عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہو سکتے ہاں اگر دشمن پہل کرے تو جوابی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ مگر وہ بھی اسی حد تک جس حد تک دشمن نے زیادتی کی ہو۔ اور اگر پھر بھی عفو و درگزر سے کام لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ارشاد باری ہے:-

﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ (۱۹۳/۲)

(جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو)

دوسرے مقام پر فرمایا:-

﴿جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (۴۰/۴۲)

(بدی کا بدلہ بدی ہے اسی کے مثل، اور جو کوئی معاف کر دے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا:-

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ﴾ (۱۲۶/۱۶)

(اگر تم سزا دو تو اتنی سزا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ صابروں کے لیے زیادہ بہتر ہے۔)

۱۔ آج سے کئی صدیاں پیشتر مالکی فقیر غلیل نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ زہریں گیسوں سے تیرا استعمال نہ کرنا چاہئیں۔ جلی کہتا ہے کہ زہریلا سامان کسی بھی حالت میں دشمنوں کے خلاف استعمال نہ ہونا چاہیے۔ (اسلام کا قانون جنگ، ص ۱۱۲ بحوالہ کتاب الاطیل شرح مختصر غلیل مصنف محمد الامیر ص ۱۶۰)

یہ ہے وہ جامع اصول جس کی مسلمانوں کی ہدایت کی گئی ہے۔ دشمن کی کارروائیاں جارحانہ ہوں یا ظالمانہ اور منتقمانہ ہر جگہ یہی اصول مد نظر رکھا جائے گا۔

(۳) مفتوحین سے سلوک:

سترہویں صدی کے آغاز تک اقوام مغرب بھی اس قدیم قدرتی حق کی قائل تھیں کہ جو شہر بروز شمشیر فتح ہو تو فاتحین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ کہ مفتوحہ شہر میں گھس کے بے دریغ قتل و غارت کریں۔ انہیں امان دینے کا بھی کوئی تصور موجود نہ تھا۔ اگرچہ جنگ سی سالہ کی وحشت و بربریت دیکھنے کے بعد یورپ کا ضمیر اسے برا سمجھنے لگا تھا تاہم بعد میں ہونے والے معرکوں میں اس کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ 1790ء میں ترکی اور روس میں جنگ چھڑ گئی روسی فوجیں فتحیاب ہو کر اس میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مقتالین و غیر مقتالین سب کو تلوار کے گھاٹ اُتارا۔ 1837ء میں فرانس نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس کی فوجیں مسلسل تین دن قتل و غارت میں مشغول رہیں۔ 1857ء میں انگریزی فوجوں نے دلی کو فتح کیا تو آزادی سے قتل عام کا بازار گرم کیا۔

بالآخر 1899ء کی ہیگ کانفرنس میں یہ طے پایا کہ بزور شمشیر فتح ہونے والے شہروں میں قتل و غارت اور لوٹ مار نہیں کی جائے گی مگر عملاً یہ طریقہ پھر بھی بند نہ ہوا۔ 1920ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے زیر سرپرستی یونانیوں نے سمرنا اور تھریس میں داخل ہو کر غیر مقاتل شہری آبادیوں کے ساتھ اسی قدیم وحشت کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا قانون بڑی طاقتوں کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ اور آئندہ بھی ایسا ہی ہونے کا امکان ہے۔ نظری اعتبار سے تو یہ قانون اسلامی قانون سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن عملاً اس کی پابندی مشکل ہے۔ کیونکہ اس قانون میں حجت بننے کی اہلیت نہیں ہے۔

(ج) موافق قوانین

(۱) غیر مقاتل افراد کے حقوق:

گروٹیوس نے اپنی تاریخی کتاب میں ایک یہ سفارش کی تھی کہ:-

جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے (نہ کہ بطور ایک قانون کے) بچوں، بوڑھوں،

عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیران جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رہنا چاہیے۔“
یہ محض ایک سفارش تھی۔ جس کو فوجی گروہ نے قبول نہیں کیا۔ دو سو برس بعد تک یورپ نے اس میں کوئی ترقی نہیں کی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں انگریزی فوجوں نے ہولناک مظالم کیے جن کے تصور سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یورپ نے وہی طریقہ اختیار کر لیا جو آج سے چودہ سال قبل اسلام نے پیش کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام اس قانون کی پابندی کو لازمی قرار دیتا ہے۔ جبکہ مغرب آج بھی اسے محض ایک شریفانہ رعایت سمجھتا ہے۔

(۲) زخمی اور بیمار افراد کی نگہداشت:

1864ء میں سویٹزر لینڈ کی حکومت نے جنیوا کے مقام پر ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کر کے بیماروں، زخمیوں اور معالجوں سے متعلق چند قوانین مرتب کیے ہیں جن کی توثیق جنیوا کی تیسری کانفرنس منعقدہ 1906ء میں جا کر ہوئی۔ یہ قوانین بھی، جنہیں مغربی اقوام نے بعد از خرابی بسیار اختیار کیا ہے۔ اسلامی قوانین کا چر بہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھو یہ بھی عملایکاری رہا کیونکہ پہلی جنگ عظیم میں فریقین نے ایک دوسرے کے ہسپتال جہاز سے بڑی بے دردی سے تباہ کیے۔ حالانکہ ان پر معاہدہ کے مطابق سرخ صلیب کے نشان بھی لگے ہوئے تھے۔

ہیک کانفرنس کے مختلف سمجھوتوں کا اصل صرف یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو بیماری یا زخم نے جنگ لڑنے سے معذور کر دیا ہے۔ ان کو علاج سے بے توجہی کے ذریعہ مزید ایذا دینا یا انہیں قتل کر دینا انسانیت کے خلاف ہے۔ بالخصوص جبکہ ان کی ایذا رسانی اور قتل سے مقاصد جنگ کے حصول میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب دیکھئے اسلام نے اپنی فوجوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے حریف کے اچھے یا بے طرز عمل سے بے پروا ہو کر اپنے ذاتی فرض کے طور پر بیماروں زخمیوں اور ایسے تمام لوگوں پر رحم و کرم سے کام لیں جو زخمیوں کی طرح معذور ہوں۔ اور یہ حکم اس وقت دیا گیا۔ جب کہ دشمن اس طرح کے رحم کے تصور سے بھی نا آشنا تھا۔

(۳) اسیران جنگ:

جنگی قیدیوں کے متعلق بھی گروٹیوس نے ہی پہلی دفعہ یہ سفارش کی تھی کہ انہیں قتل

کرنے یا غلام بنا کر بیچنے کی بجائے یا تو ان کا تبادلہ کر لیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن دوسرے اخلاقی ضوابط کی طرح اس کا اثر بھی بہت دیر بعد میں ہوا۔ 1799ء میں یورپ کے سب سے بڑے جرنیل نپولین بونا پارٹ نے یا فا کی چار ہزار ترکی فوج کو، جس نے جان بخشی کا وعدہ لے کر اطاعت قبول کی تھی صرف اس لیے قتل کر دیا کہ وہ نہ تو ان کی خوراک کا انتظام کر سکا، نہ ہی انہیں مصر بھیج سکا۔ اس کے ایک صدی بعد 1896ء میں کیوبا میں ہسپانوی کپتان جنرل ویلر نے اسیران جنگ کو باغی قرار دے کر قتل کر دیا اور ہزاروں سبتے باشندوں کو قید کر کے انہیں بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ مر گئے۔

1907ء کی دوسری ہیگ کانفرنس نے بلاشبہ اسیران جنگ کے لیے بہت سے مفید قانون بنائے۔ لیکن ان قوانین کی منظوری کا معرکہ اخلاقی اقدار کا احترام نہیں بلکہ خوفِ انتقام ہے اسیران جنگ کو یہ مراعات محض اس لیے بخشی گئیں کہ ہر فریق اپنے اسیروں کی بھلائی چاہتا تھا۔ اس کانفرنس میں جو مراعات اسیران جنگ کو دی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے:-

اسیران جنگ شخصی قید میں نہیں بلکہ حکومت کی قید میں ہوں گے۔ حکومت انہیں نظر بند رکھے گی قیدی نہ بنائے گی۔ حکومت ان قیدیوں کے درجہ اور عہدہ کے مطابق ان سے کام لے کر انہیں معاوضہ بھی عطا کرے گی جو اس کے ملک میں رائج ہے۔ اگر کوئی قیدی جنگ میں دوبارہ حصہ نہ لینے کا حتمی وعدہ کرے تو اس کو رہا کر دینا چاہیے۔ قید کرنے والی حکومت ان کے نام، پتہ اور حالات کی تشہیر کرے گی۔ اور ان کی ڈاک کا باقاعدہ بندوبست کیا جائے گا۔ قیدیوں کو مذہبی آزادی ہوگی۔ اور وفات پر ان کی تجویز و تکفین حکومت کی ذمہ داری ہے۔ افسروں کو بھی حکومت ان کے درجہ کے مطابق اپنے ملک میں مروجہ تنخواہ ادا کرے گی جو بالآخر خود ان کی حکومت ادا کرے گی۔ جب صلح کے بعد اسیران جنگ کا تبادلہ کر لیا جائے گا۔

اب دیکھئے ان مراعات میں سے کوئی رعایت ایسی نہیں۔ جو اسلام نے قیدیوں کو نہ دی ہو۔ البتہ جو زائد مراعات اسلام نے دی ہیں وہ یہ ہیں:-

- (۱) قیدیوں پر جو خرچ ہوگا۔ وہ مغلوب حکومت کے ذمہ واجب الادا نہیں ہوتا۔
- (۲) قیدیوں سے مساوی سلوک کے بجائے بہتر سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ جس کی شہادت خود دور نبوی کے اسیروں نے دی۔

(۳) موجودہ حکومتیں تبادلہ اور فدیہ کے بغیر قیدیوں کو رہا نہیں کرتیں۔ جب کہ اسلام نے انہیں ازراہ احسان اور بغیر لالچ کے آزاد کرنے کی بھی ایک شق رکھی ہے۔ اور اس پر بارہا عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ دور نبوی کے 90 فیصد امیر ازراہ احسان ہی رہا کیے گئے۔

(۴) موجودہ حکومتوں نے کاغذات سے فی الواقع غلامی اور قتل کے الفاظ کو خارج کر دیا ہے۔ لیکن عملاً ان کو حیلوں بہانوں سے بے دریغ قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں یہ فریب کاری روا نہیں۔ اس کے بجائے وہ سنگین حالات میں جبکہ ان پر کئی طرح کے شدید الزامات ہوں انہیں قتل یا غلام بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ جیسا کہ بنو نضیر کے ساتھ معاملہ ہوا۔ تاہم یہ صرف اجازت ہے حکم نہیں بہتر صورت یہی ہے کہ غفو و درگزر سے کام لیا جائے۔ اگر بنو نضیر کا فیصلہ بھی حضور اکرم ﷺ کے اختیار میں ہوتا تو شاید آپ کچھ نرمی کر جاتے۔ لیکن یہ فیصلہ یہود کے منتخب کردہ ثالث نے کیا تھا جسے طرفین نے بخوشی قبول کیا۔

(۵) موجودہ قوانین سترہویں صدی سے شروع ہو کر بتدریج یہاں تک پہنچے ہیں۔ لیکن اسلام نے یہ قوانین اس دور میں پیش کیے جبکہ امیران جنگ سے بدتر سلوک ہوتا تھا۔ جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ خود عرب کی یہ حالت تھی کہ غزوہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر اس دور میں رہا کیا گیا جبکہ کفار قریش کے قبضہ میں بیشتر مسلمان قیدی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے تھے۔

(۶) ان مہذب اقوام نے امیران جنگ کو جو مراعات بخشی ہیں، اس کا جذبہ محرکہ "خوف انتقام" ہے۔ جبکہ اسلام علی الاطلاق قیدیوں سے بہتر سے بہتر سلوک کی تلقین کرتا ہے۔



رسول اللہ ﷺ کا عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

کسی شخص کی عظمت کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دنیا میں اس فن کے نامور ماہرین سے اس کا تقابل کر کے دکھایا جائے۔ اس غرض کے لیے ہم مختلف ادوار کے مندرجہ ذیل تین نامور جرنیلوں کا انتخاب کرتے ہیں:-

(۱) سکندر اعظم یونان کا بہت بڑا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور ﷺ سے نو صدی پہلے کا ہے۔

(۲) چنگیز خان۔ مشرق وسطیٰ کا بڑا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور ﷺ سے چھ صدی بعد کا ہے۔

(۳) نپولین بونا پارٹ۔ فرانس کا فاتح اور جرنیل، اس کا دور حضور اکرم ﷺ سے بارہ صدی بعد کا ہے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان تینوں جرنیلوں کے مفصل سوانح حیات لکھ کر تقابل کریں۔ بغرض اختصار ہم ان کے کارناموں کے حالات انسائیکلو پیڈیا اُردو مطبوعہ فیروز سنز سے نقل کرتے ہیں۔ ان حالات کے علاوہ تقابل کے وقت اگر کسی تفصیل کی ضرورت پیش آئی تو وہ بحوالہ درج کر دی جائے گی۔

سکندر اعظم:

(356-323 ق م) دنیا کا عظیم فاتح یونان کی ایک ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کا بیٹا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد 336 ق م میں تخت پر بیٹھا اور آس پاس کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو فتح کیا۔ ۳۳۴ ق م میں ایران پر حملہ کرنے کا عزم کیا۔ ایک بڑی فوج لے کر ایشیا کی طرف بڑھا۔ پہلے ترکی فتح کیا۔ پھر شام کے ساحل پر قبضہ کر لیا۔ اور ایران کی بحری

طاقت کا خاتمہ کر دیا۔ مصر نے جنگ کے بغیر ہی اطاعت کر لی۔ وہاں اس نے شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی۔ پھر عراق کا رخ کیا۔ عراق اور ایران پر قبضہ کیا اور بادشاہ کو شکست دی۔ پھر وہ درہ خیبر کی راہ ہندوستان میں داخل ہوا۔ ۳۲۳ ق م میں یہاں دریائے جہلم کے کنارے رلچہ پورس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ سکندر پورے ہندوستان کو فتح کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ دریائے سندھ اور ساحل مکران کے راستے عراق کے شہر بابل پہنچا۔ یہاں اسے بخارا آیا اور وہ ۳۲۳ ق م میں عین جوانی میں فوت ہو گیا اور اس کی وسیع سلطنت بہت سے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

پاک و ہند پر اس کے نائب بھی زیادہ عرصہ قبضہ قائم نہ رکھ سکے۔ ۳۱۷ ق م تک یہاں یونانیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ پاک و ہند کی تاریخ پر اس حملہ نے کا کوئی دیر پا اثر نہیں چھوڑا۔

چنگیز خاں:

۱۱۶۲ء تا ۱۲۲۷ء اصلی نام تیموجن تھا۔ چنگیز لقب جس کے معنی ہیں کامل سپاہی۔ دریائے اولون کے کنارے ایک خیمہ میں پیدا ہوا۔ ابھی تیرہ برس کی عمر کا تھا کہ دیرینہ مختاصت FEUD پر مبنی ایک لڑائی میں اس کے باپ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اُس طرح چھوٹی عمر میں چنگیز خاں کو اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالنا پڑی۔ برسرِ اقتدار آتے ہی چنگیز خاں نے ذہانت اور فوجی چالوں سے بہرہ ور کی کا ثبوت دینا شروع کیا اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے باپ کا انتقام بھی لیا اور تمام منگول قبائل پر ذاتی تسلط قائم کر لیا۔ اس کے بعد لشکر کشی کا وہ دور شروع ہوا جس کے دوران میں منگول (بمعنی بہادر) فوجوں نے اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ جسے سن کر دور دور بسنے والوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ چنگیز کی فوجوں کی یلغار کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1237ء میں جب اسے موت نے آن دبوچا، اس وقت اس کی سلطنت کی حدود ایک طرف دریائے داگا سے بحر الکاہل تک اور دوسری طرف سائی بیریا سے خلیج فارس تک پھیلی چلی گئی تھیں مؤرخین کا خیال ہے کہ چنگیز کی کامیابی کا راز اس کی ماں ہولم کی تربیت اور اس کے جرنیلوں سوتیائی وغیرہ کی قابلیت میں مضمر ہے۔

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

نیپولین بونا پارٹ:

1769ء تا 1821ء فریسی جرنیل اور بادشاہ انقلاب فرانس کے دوران سب سے پہلے کامیابی تو لان کے محاصرے میں توپ خانے کی مدد سے حاصل کی۔ اس کے بعد اٹلی میں جمہوری فوج کے کماندار کی حیثیت سے پے در پے فتوحات حاصل کیں۔ اور قومی ہیرو بن گیا۔ 1797ء میں موسم خزاں میں پیرس واپس آ گیا اور حکومت کا تختہ الٹ کر خود قنصل اول بن گیا۔ 1804ء کو اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ 1805ء میں آسٹریا اور 1806ء میں جرمنی کو شکست دی۔ اپنی بے اولاد بیوی جوزیفائن کو طلاق دے کر شاہ آسٹریا کی بیوی ماری لویزا سے شادی کی 1812ء میں روس پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ماسکو سے پسپا ہوتے وقت اس کی تقریباً ساری فوج تباہ ہو گئی 1813ء میں پریشیا اور آسٹریا نے روس کے ساتھ مل کر اسے شکست فاش دی۔ نیپولین تخت سے دست بردار ہو گیا اور ایلینا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ مگر سوڈن کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ فرانس واپس آیا اور فوج جمع کر لی لیکن 18/جون 1815ء کو واٹرلو کے میدان میں اسے شکست ہوئی اور سینٹ ہلینا کے جزیرے میں جلا وطن کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا ماہرین حرب جرنیلوں کا تقابل

(۱) زندگی کا صرف ایک پہلو:

جیسے مذکورہ بالا تینوں جرنیل، جرنیل بھی تھے، فاتح بھی اور بادشاہ بھی اور یہ تینوں باتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ گویا یہ تینوں جرنیل ایک مخصوص پہلو میں نامور ہوئے۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کی اصل حیثیت اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ نبی بھی تھے، شارع بھی، مزگی اخلاق بھی تھے اور حج بھی۔ سپہ سالاری آپ ﷺ کی جزوی خوبی تھی۔ اس پہلو میں بھی آپ ﷺ نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا کہ باقی تمام ماہرین فن آپ کے سامنے بچ نظر آتے ہیں۔

(۲) فنون سپہ گری سے سابقہ واقفیت:

سکندر اعظم مقدونیہ (یونان) کے بادشاہ کا بیٹا تھا اور چنگیز خاں کا پڑدادا النچہ قبائلی بادشاہ یہ دونوں جرنیل فن سپہ گری سے آبائی طور پر آشنا تھے۔ نیپولین بونا پارٹ نے خود فوج میں بھرتی ہو کر یہ فن سیکھ لیا تھا۔ مگر حضور ﷺ کا بچپن پہلے بکریاں چرانے میں، پھر کچھ عرصہ تجارت

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

میں اور نبوت کے بعد جوانی اہل مکہ کے ظلم سہنے میں گزری، فنون سپہ گری سے واقفیت کہاں سے پیدا ہوئی۔ ہجرت سے پہلے آپ ﷺ صادق اور امین کے ناموں سے تو مشہور تھے مگر کسی نے آپ ﷺ کو تیر انداز یا نیزہ باز کبھی نہیں کہا تھا۔ اور جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے۔ اور آپ ﷺ کو صرف فن سپہ گری کا ہی نہیں بلکہ سپہ سالاری کی ذمہ داری ادا کرنے کا موقعہ پیش آیا۔ تو آپ ﷺ نے اس میں وہ کمال دکھایا کہ دنیا حیران ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے، کہ سکندر عین نو جوانی کے عالم میں یعنی 20 سال کی عمر میں ہی کشور کشائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چنگیز 12 سال کا تھا کہ اس کا باپ لڑائی میں مارا گیا تو وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ نپولین سترہ سال کی عمر میں بھرتی ہوا۔ گویا یہ تینوں جرنیل آغاز جوانی سے فن حرب و ضرب میں مشغول ہو گئے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کو جب یہ خدمات سرانجام دینی پڑیں تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر 54 سال تھی۔ جوانی رخصت ہو چکی تھی اور بڑھاپے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس دور زندگی میں اس فن کو ہاتھ میں لے کر یہ کمال دکھانا بھی شاید تاریخ میں اور کہیں نہ مل سکے گا۔

(۳) سابقہ فوج:

سکندر اعظم، چنگیز خاں نپولین کے سپاہی فن سپہ گری اور اس کے نظم و ضبط سے پوری طرح آشنا تھے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کو جس قوم سے واسطہ پڑا، وہ نظم و ضبط کو اپنی توہین اور آزادی میں حائل تصور کرتی تھی۔ نسلی مفاخرت ان کی گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ آپ ﷺ ہی کا کارنامہ تھا کہ آپ ﷺ نے اس قوم کے ذہن اس قدر بدل دیئے کہ جنگ موتہ ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا تو ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے معزز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے سردارانِ قریش اس جہاد میں روانہ ہوئے۔

علاوہ ازیں آپ ﷺ کے فوجی۔ قبائلی امتیاز کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جانوں کے پیاسے تھے۔ مگر آپ ﷺ نے ان میں ایسی ہمدردی، محبت اور اخوت لباہمی کے جذبات پیدا

ایک ہندو مصنف موتی الال ماتھرا اسلامی اخوت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اب میں اس تعلیم کا نتیجہ دکھاتا ہوں جس نے مسلمانوں کے اندر اخوت و اتحاد اور محبت و مروت کا ایسا گہرا رشتہ قائم کر دیا تھا۔ جس نے چند ہی سالوں میں دنیا کی جغرافیائی تقسیم کو یکسر بدل دیا تھا اور آج بھی اس کا اثر دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ پر باقی ہے۔ یعنی دنیا کے ایک حصہ کو اسلامی ممالک کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔" (سرور کونین ص ۴۴)

کر دیئے جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ قرآن کریم اس بگیتی کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:-

﴿وَإِذْ كُفِرُوا وَعُمَّتِ اللَّهُ عَلَيْهِمْ إِذْ كُنْتُمْ
أَعْدَاءً فَلَأَفَّ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران: 103)

(اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک
دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے
دلوں میں الفت ڈال دی ہے اور تم اس کی
مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔)

بلاشبہ چنگیز خاں نے بھی اپنے چچازاد بھائیوں کو ساتھ ملا کر ایک جہتی پیدا کرنے میں
نمایاں اہلیت کا ثبوت دیا۔ لیکن اس نے جن لوگوں کو اکٹھا کیا اور جتھہ بندی کی، ان کا مفاد مشترک
تھا اور وہ تھا ہوس ملک گیری۔ لیکن آپ ﷺ نے جن لوگوں کو اکٹھا کیا ان کے سامنے دنیوی مفاد
کے بجائے مصائب و تکالیف کے پہاڑ نظر آتے تھے۔ یہ لوگ مسلمان پہلے تھے اور فوجی بعد میں
بنے۔

(۴) مادی وسائل:

سکندر اعظم جب یونان سے نکلا تو 30 ہزار کی مسلح فوج اس کے ہمراہ تھی۔ چنگیز خاں
نے اپنے پڑدادا کی اولاد میں یک جہتی پیدا کرنے میں 20 سال صرف کر دیئے۔ اور جب وہ
خوارزم شاہ کے مقابلہ میں نکلا تو بیس ہزار مسلح افواج اس کے ساتھ تھیں، نیپولین کو حکومت فرانس کی
ترہیت یافتہ فوج 20 ہزار کی تعداد میں مہیا ہو گئی تھی۔ لیکن جب آپ ﷺ کو بدر میں پہلی جنگ لڑنا
پڑی تو آپ ﷺ کے پاس کیا تھا۔ صرف تین سو افراد، وہ بھی ایسے جو یہ بھی پوری نہ جانتے تھے کہ
ہمیں قریش کے قافلہ تجارت کا رخ کرنا ہے یا کفار کے اس مسلح لشکر سے پالا پڑنے والا ہے، جو
قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ پھر جب یہ حالات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ قریش کے مسلح
لشکر سے مقابلہ ہوگا۔ تو ان میں سے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ کیونکہ انہیں
اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ قرآن کریم نے اس منظر کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:-

﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ
بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ
لَكُرْهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ

(جیسے تمہارے پروردگار نے تمہیں تدبیر
کے ساتھ تمہارے گھر سے نکالا۔ اور اس
وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔
وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہوئے

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

مَاتَبَيِّنَ كَانَمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ
يَنْظُرُونَ - ﴿٨: ٢٥﴾
بیچھے تم سے جھگڑنے لگے۔ گویا موت کی کی
طرف جاتے ہیں اور وہ اسے دیکھ رہے
ہیں۔)

اب صورت یہ ہوئی کہ ایک طرف صرف 313 آدمی ہیں جو پوری طرح مسلح بھی
نہیں۔ اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ لڑنا پڑے گی تو ان میں سے اکثر دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پھر
ان کے اپنے کھانے پینے کے سامان کی قلت ہے اور سامان جنگ کی بھی۔
اور دوسری طرف صورت یہ ہے کہ لشکر کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا سے بھی زیادہ
ہے۔ یہ سب لوگ مسلح ہو کر نکلے ہیں کہ تجارتی قافلہ کو مسلمانوں کی دست برد سے بچا کر لانا ہے۔
اور اسی مدد بھیز میں مسلمانوں کا استیصال بھی کرنا ہے۔ لہذا ان کے ساتھ اسلحہ جنگ بھی واقف مقدار
میں ہے۔ گھوڑے بھی بہت ہیں۔ فوج بہادران قریش پر مشتمل ہے۔ کھانے پینے کا سامان اتنا وافر
ہے کہ روزانہ دس 10 اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔۔۔ پینے کو شراب بھی کافی ہے۔ اور جملہ آرام
و آسائش کے سامان فراہم ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ایسی بے دل نہتی اور کم تعداد کو ایسے مسلح اور کثیر دشمن سے بھڑا دینا
اور پھر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے فتح حاصل کرنا ایسی مثال ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔ اور یہ آپ ﷺ
کی زندگی کا پہلا تجربہ کارزار تھا۔

(۵) فتح و شکست:

دنیا نے بارہا دیکھا ہوگا کہ ایک قلیل جماعت ایک لشکرِ جرار پر غالب آگئی۔ لیکن ان
حدود و قیود کے ساتھ آپ ﷺ کا فتح پانا شاید دنیا بھر میں ایک ہی مثال ہو۔ آپ ﷺ ہی کے
ترتیب یافتہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنگ موتہ میں 3 ہزار مسلمانوں کے لشکر سے ایک لاکھ
عیسائیوں کا منہ پھیر دیتے ہیں اور فائز المرام واپس آتے ہیں لیکن اگر حالات کی میزان میں دیکھا
جائے تو جنگ بدر کی فتح اس سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں!

(۱) جنگ موتہ میں پہلے مسلمانوں کے تین سپہ سالار یکے بعد دیگرے شہید ہو جاتے ہیں۔
حضرت خالدؓ کا نامہ یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے قلیل لشکر کو اس لشکرِ جرار سے
بچا کر..... پسپا ہو کر نہیں بلکہ ان کو پسپا کر کے..... واپس لے آئے۔ دشمن کے کتنے

آدمی قتل ہوئے یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ مسلمان صرف بارہ شہید ہوئے تھے، جب کہ جنگ بدر میں 70 اساطین کفر موت کے گھاٹ اترے اور اتنی ہی تعداد میں گرفتار بھی ہوئے۔

(۲) جنگ موتہ میں فوج پوری طرح مسلح ہو کر اور جنگ کے ارادہ سے نکلی تھی۔ جبکہ جنگ بدر کے وقت ان کو معرکہ کا یقین بھی نہ تھا اور فوج بھی نہ تھی۔

(۳) جنگ بدر میں جس فوج نے کام کیا۔ یہ فوج اور سپہ سالار کا پہلا تجربہ تھا۔ جبکہ جنگ موتہ سے پہلے مسلمان کئی دفعہ لڑائی کا تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اور حضرت خالد اسلام لانے سے مدتوں پہلے ایک عظیم جرنیل سمجھے جاتے تھے۔

تاہم اس تقابل سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی عظمت بحیثیت جرنیل کسی طرح کم نہیں ہوتی اسی موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے آپ کو ”سَيْفٌ مِّنْ سَيُوفِ اللّٰهِ“ کا لقب دیا تھا۔ اس جنگ میں آپ ﷺ کے ہاتھ نو تلواریں ٹوٹیں تھیں۔ (بخاری کتاب المغازی۔ باب فزود موتہ)

فتح و شکست کے معیار پر اگر دیکھا جائے تو نیپولین ہمیں ایک ناکام جرنیل نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اس نے بہت کچھ فتوحات بھی کیں، لیکن اس کی 1807 کے بعد کی زندگی میں کئی مرتبہ ایسی شکست فاش ہوئی جس نے اس کی عظمت کا درجہ بہت کم کر دیا ہے۔ روس کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی جس میں اس کی بے تدبیری اور کم فہمی کی وجہ سے اس کی 5 لاکھ فوج میں نصف سے زیادہ ہلاک ہو گئی۔ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں ”واٹرلو“ کے مقام پر ایسی ہزیمت اٹھائی کہ خود بھی گرفتار ہو گیا۔ ایک جزیرہ سینٹ میں جلا وطن کیا گیا۔ بالآخر اسی مقام پر بسک بسک 6 سال بعد 1821ء میں فوت ہوا گویا اس کی آخری زندگی ناکامیوں سے پُر تھی۔

اس لحاظ سے سکندر اعظم، چنگیز خاں اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک مقام پر نظر آتے ہیں۔ خالد بن ولید بھی ایسے عظیم جرنیل تھے کہ انہوں نے کم از کم اسلام کی زندگی میں شکست نہیں کھائی اور رسول اللہ ﷺ کا مقام ان سب سے بلند ہے۔ جنہوں نے زندگی بھر میں صرف دو دفعہ شکست کا منہ دیکھ کر پھر فتح میں بدل دیا۔ جنگ احد میں نقشہ جنگ میں فوری تبدیلی کے ذریعہ اور جنگ حنین میں از سر نو نئی ترتیب سے صف بندی کر کے دشمن کا منہ پھیر دیا۔ یہ واقعات آپ ﷺ کی عظیم حربی مہارت اور حاضر دماغی کی دلیل ہیں۔

(۶) جنگی تدابیر میں جدت:

- آپ ﷺ نے ہر معرکہ میں کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی۔ جس سے دشمن پہلے واقف نہ ہوتا۔ اور بسا اوقات یہ نئی تدابیر اس کے سامان گمان میں بھی نہ ہوتیں مثلاً:
- (۱) جنگ بدر میں جنگ کے انتخاب کے علاوہ آپ ﷺ نے صف بندی اس انداز سے فرمائی۔ کہ آپ ﷺ کا لشکر اصل تعداد سے بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس تدبیر نے دشمن کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔
 - (۲) جنگ احد میں آپ ﷺ نے پہاڑی درہ پر قبضہ کر کے دشمن کی تدابیر کو ناکام بنا دیا۔ پھر جب مسلمانوں کی غلطی سے یہ درہ خالی ہو گیا اور شکست کے آثار نظر آنے لگے اور آپ ﷺ نے اپنی قیام گاہ کے لیے پہاڑی پر ایک بلند مقام تجویز فرمایا۔ اور پورے عزم و شہادت سے لڑائی جاری رکھی۔ بالآخر دشمن ناکام واپس لوٹ گیا۔
 - (۳) جنگ خندق میں آپ ﷺ نے مدینہ کے خالی حصہ کے سامنے خندق کھود کر اتحادیوں کی تمام تدابیر کو ناکام بنا دیا اور دشمن کا یہ دس ہزار کا جبار لشکر زہر کے گھونٹ پی کر ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد بالآخر ناکام واپس ہو گیا۔
 - (۴) جنگ خیبر میں آپ ﷺ نے غطفان اور خیبر کے درمیان رجب کے مقام پر بڑا ڈال کر دشمن کے اتحاد کا رشتہ منقطع کر دیا۔
 - (۵) فتح مکہ کے دوران آپ ﷺ نے رازداری Secrecy نامعلوم راستوں سے سفر اور شان و شوکت کے عظیم الشان مظاہرہ سے دشمن کے تمام قومی کو مفلوج کر دیا اور وہ مقابلہ میں آنے کے قابل ہی نہ رہے۔
- محاصرہ طائف میں آپ ﷺ نے دباہ اور منجیق جیسے قلعہ شکن آلات پہلی دفعہ استعمال کر کے ہوازن اور ثقیف کے ماہر تیر اندازوں کی تدبیریں ناکام بنا دیں۔
- غرض ہر نئے موقع پر آپ ﷺ کوئی نئی تدبیر سوچ لیتے تھے جو دشمن کو ورتہ حیرت میں ڈال دیتی اور ان کی تدبیریں ناکام ہو جاتی تھیں۔ جنگی تدابیر میں ایسا مسلسل ارتقاء اور جدت ایسی خصوصیت ہے جس میں دنیا کا کوئی جرنیل آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

سپہ سالار اور فوج کے باہمی تعلقات:

رسول اللہ ﷺ کو اپنی فوج سے پوری ہمدردی تھی۔ فوج کے دکھ سکھ اور کام کاج میں آپ ﷺ برابر کے شریک ہوتے تھے جنگ احد میں صحابہ ﷺ کو دکھ پہنچا تو آپ کو بھی دکھ پہنچا اور حنین کی شکست کے آثار نظر آئے تو آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ آپ ﷺ بھی اپنی جان بچانے کی فکر کریں بلکہ میدان میں کھڑے ہو کر لاکارا۔ منتشر اور پریشان صحابہ ﷺ کو مجتمع کیا صحابہ کوئی زندگی ملی جس کی وجہ سے دونوں مقامات پر جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔

ان جنگوں سے پیشتر ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ اس سے بھی زیادہ مروت و ایثار کا مظاہرہ فرما چکے تھے۔ مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم مل چکا تھا۔ اور وہ سب یکے بعد دیگرے مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق ﷺ ہر روز مصر ہوتے کہ حضور ﷺ بھی مدینہ چلے جائیں۔ مگر ہمیشہ یہی جواب ہلاتا کہ ”ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا اور مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوچ کا حکم نہیں ملا ہے“۔ آپ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ سب مسلمان بغیر وعافیت مدینہ پہنچ جائیں تب آپ ادھر کا رخ کریں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس وقت مکہ کو الوداع کہا جب باقی مسلمان مدینہ پہنچ چکے تھے۔ صرف آپ ﷺ اور ابو بکر صدیق ﷺ باقی رہ گئے تھے۔ اور جس رات آپ ﷺ ہجرت کے لیے گھر سے باہر نکلے تو سازشی قریشیوں کا مسلح پہرہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے گھر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

اس معیار پر نیپولین بونا پارٹ کو دیکھئے۔ وہ بلاشبہ اپنے سپاہیوں کے کردار سے انفرادی واقفیت رکھتا تھا۔ فوج کے اکثر سپاہیوں کے اُسے نام تک یاد تھے۔ وہ اُن سے کام لینا بھی خوب جانتا تھا لیکن آڑے دنتوں میں اسے صرف اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی تھی۔

مصر میں انگریزوں کے مقابلہ میں عکد کے مقام پر اسے شکست ہوئی تو وہ اکیلا وہاں سے فرار اختیار کر کے فرانس چلا آیا۔ اسے یہ فکر لاحق نہیں ہوئی کہ اس کی فوج کس حال میں ہے۔ وائرلو کے مقام پر اسے شکست ہوئی تو وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی اور جہاز پر سوار ہونے کو تھا کہ گرفتار ہو گیا۔

رسول اللہ کی فوج آپ ﷺ کی صرف اطاعت گزار ہی نہ تھی جان نثار بھی تھی۔ فوج اور

سپہ سالار کے درمیان انس و محبت اور عزت و احترام بھی موجود تھا۔ صحابہ کرام ﷺ کی اطاعت گزاری کا یہ حال تھا کہ لشکر قریش اُحد کے میدان سے کام کو ناتمام چھوڑ کر گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ ﷺ کو ان کے تعاقب کا حکم دیا۔ اس جنگ میں ستر ممتاز صحابہ شہید ہو چکے تھے۔ زخمیوں کی تعداد کافی تھی۔ مدینہ میں گھر گھر صف ماتم بکھچی ہوئی تھی۔ فوج جنگ کی تکان زخمیوں کی تکلیف اور ذہنی طور پر سخت پریشان تھی۔ اس حال میں جب آپ نے حکم دیا تو ستر صحابہ کرام ﷺ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ (بخاری، کتاب المغازی، غزوہ اُحد)

اب سکندر اعظم کی بات سنئے۔ وہ یلغار کرتا ہوا جب ہندوستان پہنچا تو سندھ کے راجہ پورس پر فتح پانے کے بعد وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک مزید ڈیڑھ ماہ میں راستہ کے علاقے فتح کرتا رہا۔ بیاس تک پہنچ گیا۔ وہ آگے بھی بڑھنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے فوج کی منت سماجت کی لیکن وہ نہیں مانی۔ آخر اس نے فوج کو اس بات کا بھی لالچ دیا کہ وہ ایشیا سے حاصل شدہ دولت سب فوج میں تقسیم کر دے گا۔ لیکن فوج نے پھر بھی اپنے سپہ سالار کی اطاعت نہیں کی۔ فوج فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ دل مسرور و شادمان تھے، بے شمار دولت کا لالچ بھی دیا جا رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود فوج کا انکار اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سکندر کو صرف اپنی فتوحات سے دلچسپی تھی فوج سے ہمدردی نہ تھی۔ فوج کو اپنے گھروں سے نکلے ہوئے اور بال بچوں سے علیحدہ ہوئے مسلسل آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سکندر چاہتا تو پیچھے سے مکہ بھی منگوا سکتا تھا، راستے میں بھی فوج تیار کر سکتا تھا۔ اگر وہ سپاہیوں کے احساسات کا خیال رکھتا اور ان میں سے نصف افواج کو بھی واپس وطن بھیج دیتا تو اس طرح اُسے مایوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

باآخر سکندر کو فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو بری راستے سے اور دوسرے کو بحری راستے سے وطن واپس پہنچنے کا حکم دے دیا۔ خود بحری راستے جب عراق پہنچا تو بابل کے مقام پر بخار کے عارضہ سے بین جوانی کے عالم میں مر گیا۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس بخار کا سبب بھی اس کے آگے بڑھنے کی ہوس کی ناکامی اور فوجوں کا منہ توڑ جواب ہی تھا۔

(۸) کشور کشائی:

اگر کشور کشائی اور ملک گیری کے پہلو سے دیکھا جائے تو ہمیں سکندر اعظم کا مقام سب سے آگے نظر آتا ہے جس نے ۳۲۵ ق م سے ۳۲۶ ق م میں یونان سے لے کر دریائے بیاس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(۱) اس نے مسلسل ۹ سال اسی ملک گیری میں صرف کیے۔ اس کی ملک گیری کی ہوس اتنی شدید تھی کہ اس نے تمام دنیا کو مسخر کرنا چاہا۔ اور اس کی یہ آرزو ناممکنات سے تھی لہذا وہ اس آرزو کا پانچواں حصہ بھی پورا نہ کر سکا۔ اور یہی حسرت دل میں لیے مر گیا۔

(۲) اس کا ح ^{مط} نظر صرف جہاں گیری تھا۔ قبضہ کے استحکام کی طرف اس نے کم ہی توجہ دی اور جہاں بانی یا مفتوحہ علاقوں میں امن اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال تک بھی اس کے دل میں کبھی نہ آیا۔ مورخین اس کے متعلق یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ وہ بادل کی طرح آیا اور برس کر چلا گیا، یا آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح واپس چلا گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس کے حملہ کے صرف تین سال بعد تک (یونانی یاغدار کا کچھ) اثر باقی نہ رہا۔ جتنے انسانوں کو اس نے تہ تیغ کیا تھا اتنے اور پیدا ہو گئے۔ اس کا کوئی جانشین بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ قبضہ بحال رکھ سکتا۔ لہذا یونانی تہذیب کا ذرہ بھر اثر ہمیں ہندوستان پر دکھائی نہیں دیتا۔

اب دیکھیے کہ اسلام کا اصل مقصد کشور کشائی نہیں بلکہ اسلامی نظام حیات کا نفاذ اور اس کی تحریک کو پر دان چڑھانا ہے اور یہ مقصد کشور کشائی کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر گئے اور اہل مکہ آپ ﷺ کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، تب بھی اسلام مکہ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ قریش مکہ ایک حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو صلح حدیبیہ کے بعد واپس لائے تو ان کے ذریعہ تقریباً تین سو آدمی تحریک اسلامی میں شامل ہوئے۔ جبکہ ابھی مکہ قریش کے زیر اقتدار تھا۔

اسلام کشور کشائی کی طرف صرف اس وقت توجہ دیتا ہے جب کہ کوئی ملک یا قوم تحریک کے مقاصد میں رکاوٹ کا باعث بن رہی ہو۔ اس صورت میں بھی اس کا اصل مقصد جہاں بانی ہونا

ہے رسول اللہ ﷺ کی سپاہیانہ زندگی ۲ھ سے شروع ہو کر ۹ ہجری پر ختم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے جو علاقہ فتح کیا وہ خیبر تھا جو ۷ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد فتح کیا گیا۔ یعنی آپ ﷺ کی سپاہیانہ زندگی کے ۷ سالوں میں سے پانچ سال بعد صرف خیبر کا محدود علاقہ فتح ہوا جب کہ اسلام اس وقت تک اپنی ترقی کی کئی منازل طے کر چکا تھا۔ اگر کشور کشائی ہی اسلام کا مطمح نظر ہوتا تو آپ ﷺ ابتدا ہی میں مدینہ کے مضافات کو بزور شمشیر فتح کر کے انہیں اپنی ریاست کے ساتھ ملانے کی کوشش فرماتے۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے محض کشور کشائی کوئی قابل تعریف فعل نہیں۔ کیونکہ فتح کے بعد ایک اسلامی حکومت پر بہت سی ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں، دو در فاروقی میں جب عراق و ایران کا سارا علاقہ فتح ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ”کاش! ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا کہ نہ وہ ہم پر حملہ کر سکتے نہ ہم ان پر چڑھ کر جا سکتے۔“ (الفاروق ص ۲۳۸)

جب محض کا علاقہ مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ تو سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ہر قل کے پایہ تخت پر فوج کشی کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے کچھ فوجیں اس طرف بھیج بھی دیں۔ لیکن دربار خلافت سے حکم پہنچا کہ اس سال اور آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس ارشاد کے موافق فوجیں واپس بلائی گئیں۔“ (الفاروق ص ۱۸۸)

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے جب خراسان فتح کر لیا تو حضرت عمر کو خط لکھا کہ خراسان اسلام کے قبضہ میں آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتوحات کی وسعت کو چنداں پسند نہیں کرتے تھے۔ خط پڑھ کر فرمایا کہ ہمارے اور خراسان کے درمیان میں آگ کا دریا حائل ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ احنف کے مردانہ وار حوصلوں کی اگرچہ تعریف کی اور فرمایا کہ احنف شرفیوں کا سر تاج ہے۔ تاہم جواب یہی لکھا کہ جہاں تک پہنچ چکے ہو وہاں سے آگے نہ بڑھنا۔ (ایضاً ص ۲۵۱)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی انتہائی خواہش تھی کہ مصر کو فتح کیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ آڑے آتے تھے۔ بالآخر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے اصرار پر راضی ہو گئے اور چار ہزار فوج ساتھ کر دی۔ اس پر بھی ان کا دل مطمئن نہ تھا۔ عمرو رضی اللہ عنہ سے کہا خدا کا نام لے کر روانہ ہو لیکن مصر پہنچنے سے پہلے اگر میرا خط پہنچ جائے تو اٹلے پھر آنا۔ عریش پہنچے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط مل گیا۔ اگرچہ اس میں پیش قدمی سے روکا گیا تھا۔ لیکن چونکہ شرط یہ حکم تھا، عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب تو ہم مصر

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

کی حد میں آچکے۔ (ایضاً ص ۲۵۳)

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی نقطہ نگاہ سے کشور کشائی کوئی اچھی بات نہیں۔ تو دور نبوی کے آٹھ سالوں میں اسی لاکھ مربع میل کا وسیع رقبہ کیسے اسلام کے زیر نگین آ گیا۔ پھر یہ وسعت دور فاروقی میں پچیس لاکھ مربع میل تک کیونکر پہنچ گئی۔ جو پوری آباد دنیا کا چوتھائی حصہ بنتی ہے۔ تو اس سوال کا جواب ہم ایک عیسائی کی زبان سے پیش کرتے ہیں۔

کشور کشائی کی وجوہ:

جب رومی شکست کھا کر دمشق اور حمص وغیرہ سے نکل کر انطاکیہ پہنچے تو ہر قتل سے فریاد کی کہ عرب نے تمام علاقے کو پامال کر دیا۔ ہر قتل نے ان میں سے چند ہوشیار اور معزز آدمیوں کو دربار میں بلا کر پوچھا کہ ”عرب تم سے زور میں جمیعت میں اور سروسامان میں کم ہیں پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟“ اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ البتہ ایک تجربہ کار بڑھے نے عرض کی کہ ”عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے بہت اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں۔ بدکاریاں کرتے ہیں۔ اقرار کی پابندی نہیں کرتے۔ اوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ ان کے کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا جو کام ہوتا ہے ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔ (الفاروق ص ۱۸۹)

یہ تو اس بات کا جواب تھا کہ مسلمان وسائل کی کمی کے باوجود کیسے فتیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھے تو آپ کہ معلوم ہوگا کہ اسلام میں کچھ ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ کہ علاقے فتح نہ کرنے کے باوجود خود بخود فتح ہوتے چلے جاتے ہیں:

جب کوئی قوم یا ملک کسی دوسرے علاقہ کو فتح کرتا ہے تو فاتح اور مفتوح قوم میں امتیاز بدستور قائم رہتا ہے۔ مثلاً انگریز قوم نے اگر ہندوستان کو فتح کیا تو اہل ہند خواہ کتنا ہی اپنے آپ کو انگریزوں کے رنگ میں رنگ دیں۔ وہ انگریز کبھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ ہی انہیں انگریزوں جتنے حقوق برطانیہ دے سکتا ہے۔ یہی حال جرمن، فرانس یا دوسری اقوام اور ان کے مقبوضات کا ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک تحریک ہے۔ وہ کسی قوم یا ملک کے باشندوں کا نام نہیں۔ اب دیکھئے کہ

۱۔ واضح رہے کہ اتنی قلیل مدت میں سکندر اعظم کے سوا اور کسی جرنیل نے اتنا وسیع علاقہ فتح نہیں کیا۔

اسلام عرب سے اٹھا۔ ان لوگوں نے ایران کو فتح کیا۔ اب اگر اہل ایران اپنے آپ کو عربوں سے زیادہ اسلام کے رنگ میں رنگ دیں تو یہ عربوں سے بھی زیادہ معزز بن سکتے ہیں۔ رہا حقوق کا مسئلہ تو اسلام لاتے ہی سب مسلمان ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ اسلام کی یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر عرب کے اکثر قبائلی علاقوں کے سرداروں کی حکومت بھی انہی کے پاس رہی اور مسلمانوں کے برابر حقوق بھی مل گئے اس طرح مفتوحہ علاقے اسلامی ریاست کے سلسلہ کی ایک کڑی تو سمجھے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں حاکمیت اور حکومت کا تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔

انہی باتوں کا اثر تھا کہ ایک صدی کے بعد اسلام نصف آباد دنیا پر پھیل گیا۔ پھر جب مسلمانوں میں اسلامی روح نہ رہی۔ اور جہاد میں دنیوی اغراض و مقاصد اور جنگ کا مقصد ہوس ملک گیری بن گیا۔ تو مسلمانوں کو شکستیں بھی ہونے کے واقعات سامنے آگئے۔ اور فی الحقیقت اسی وقت ان کے انحطاط کا بیج پڑ چکا تھا۔

(۹) فتح کے بعد قتل و غارت:

اسلامی نقطہ نظر سے فتح کا مقصد محض فتنہ و فساد کو دور کرنا ہوتا ہے۔ لہذا فتح کے بعد وہ قتل و غارت اور لوٹ مار، مفتوحہ شہروں کو جانا اور کھیتوں وغیرہ کو برباد کرنا اور اس جیسے دوسرے تمام افعال کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن دنیوی اغراض کے تحت لڑنے والی قوموں کا فتح سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ مفتوحہ علاقہ کی دولت پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ اس ملک سے زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ اٹھایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر قبضہ کو طویل سے طویل تر مستحکم بنایا جائے۔ تاکہ فوائد مذکورہ حاصل ہوتے رہیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے وہ:

(۱) تمام مقاتلین کو یا تو تہ تیغ کر دیتے ہیں۔ یا غلام بنا لیتے ہیں۔ تاکہ مفتوحہ ملک کی فوجی طاقت کو کچل دیا جائے۔

(۲) تمام علاقہ کی دولت سمیٹنے کے بعد شہروں کو آگ لگا دیتے ہیں تاکہ مفتوحہ قوم معاشی لحاظ سے اتنی کمزور ہو جائے کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

(۳) غیر مقاتلین کا قتل عام اس لیے کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص ان کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ نہ کھڑا ہو اور قبضہ تادیر بحال رہ سکے۔

اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں۔ تو چنگیز خاں سب سے بڑا سفاک اور ظالم نظر آتا ہے۔ اس نے کوئی علاقہ فتح نہیں کیا جہاں اس نے اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔
مثلاً:-

- (۱) ۶۱۶ء میں جب وہ بخارا میں داخل ہوا تو باشندوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔ جو بچے رہے قتل کیے گئے کچھ قیدی بنائے گئے۔ بخارا جیسا عظیم الشان شہر جلا دیا گیا جو صرف کھردر کی صورت میں باقی رہ گیا۔ (تاریخ ۴۲ حصہ دوم ص ۳۶۱)
 - (۲) رے کو فتح کرنے کے بعد اسے تاخت و تاراج کر ڈالا پھر ہمدان کو لیا اور قزوین کو فتح کر کے چالیس ہزار باشندے تہ تیغ کر دیئے۔ (ایضاً ص ۳۶۱)
 - (۳) خوارزم کو فتح کیا تو پہلے شہر کو لوٹا۔ پھر اسے ویران کیا۔ اس پر بھی جوش انتقام کم نہ ہوا تو دریا کے بند کو، جس کے ذریعہ شہر میں پانی آتا تھا، کھول دیا جس سے سارا شہر مع آبادی تباہ ہو گیا۔ (ایضاً ص ۳۶۳)
 - (۴) ترمذ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں کو قتل کر دیا۔ پھر ترمذ کی طرح بلخ اور طالقان بالیاں کی آبادی کو بھی ختم کر دیا۔ پھر اس کے بعد غزہ اور غور پر قبضہ کر کے پوری آبادی کو قتل کر دیا۔ (ایضاً ص ۳۶۳)
 - (۵) چنگیز خاں نے پنجاب تک جلال الدین کا تعاقب کیا۔ وہ تو ہاتھ نہ آیا اور تاتاری پنجاب اور ملتان کو تخت و تاراج کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تاتاری خراسان، فارس، آذربائیجان، ازبکستان، اران، کوچ اور قفقاز کے سارے علاقے زیر و زبر کرتے ہوئے روس کے علاقے تک پہنچ گئے۔
- اب سکندر اعظم کا حال سنئے۔ جس کی قوم کو اس دور میں دنیا کی مہذب ترین قوم ہونے کا فخر حاصل تھا۔ شام کے قدیم تجارتی مرکز صور کو اس نے چھ ماہ کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا۔ تو ۸ ہزار بے گناہ انسانوں کو بے گناہ قتل کیا اور ۳۰ ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ (الجہاد فی الاسلام)
- ایران میں پیش قدمی کرتے وقت اس کے سپاہیوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ ملک کو تباہ کیا اور فتح حاصل کرنے کے بعد ایران کے بحری بیڑے کو تباہ کر دیا۔ پھر عراق و ایران میں جو قتل و غارت، لوٹ مار اور تباہی مچائی یہ سب واقعات تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

اس سلسلے میں نیپولین بونا پارٹ کا کردار اس ایک واقعہ سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۷۹۹ء میں چار ہزار ترکی فوج نے اس شرط پر نیپولین کی اطاعت قبول کی تھی کہ ان کی جان بخشی کی جائے۔ یہ مفتوحہ تھی بلکہ نیپولین سے امان یافتہ تھی۔ لیکن نیپولین نے انہیں امان دینے کے باوجود اس بنا پر قتل کروا دیا کہ وہ ان کے لیے خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ نہ ہی انہیں مصر روانہ کر سکتا ہے۔ اس پہلو سے جب ہم حضور اکرم ﷺ کے کردار پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دنیا کے تمام جرنیلوں سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔

(۱۰) مفتوحہ علاقوں میں نظام عدل کا قیام:

فتح کے بعد سب سے اہم مسئلہ مفتوحہ علاقہ میں نظام عدل کا قیام ہے۔ دنیوی فاتحین کے لیے یہ نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ لیکن ایک اسلامی سپہ سالار کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہی یہ ہے۔ اور اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو جہاد کا مقصد ہی نظام عدل کا قیام ہے۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے اصل کامیابی دشمن کو میدان جنگ میں شکست دینا نہیں بلکہ مفتوحہ علاقہ میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنْتُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۴۱:۲۲)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر قبضہ دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ اچھی باتوں کا حکم دیں اور بُری باتوں سے روکیں گے۔)

آیت بالا میں نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق تو صرف مسلمانوں سے ہے مگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام پوری اطاعت گزار رعایا کو محیط ہوتا ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے چار چیزوں کا اہتمام ضروری ہے۔ قیام امن، تعلیم، احتساب اور فحاشی کا سدباب۔

دور نبوی عرب کا سارا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آچکا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے سات صوبوں میں تقسیم کیا۔ ہر صوبہ میں ایک والی مقرر کیا جاتا تھا ایک عامل اور ایک قاضی والی گورنر اور سپہ سالار دونوں کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ گویا داخلی امن اور دفاعی امور دونوں کا وہ ذمہ دار ہوتا تھا۔ عامل بیت المال کے انتظام پر مامور تھا۔ اور قاضی جج یا صوبہ کے چیف جسٹس کے فرائض

سراجمام دیتا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مملکت اسلامیہ میں وسعت ہوئی دس صوبے بنائے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گیارہ صوبے تھے۔ دور فاروقی میں والی کے فرائض کو دو الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ داخلی امن کے لیے محکمہ پولیس تشکیل دیا گیا۔ اور دفاع وغیرہ کے لیے محکمہ فوج۔

ایک اسلامی ریاست میں تعلیم کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی اسلامی نظریہ حیات کی روح رواں ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا تھا۔ ویسے تو آپ ﷺ ہر وقت اور ہر کسی کو تعلیم دیتے رہتے تاہم اصحاب صفہ پر آپ ﷺ کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ اصحاب صفہ دراصل اس دور کی یونیورسٹی تھی۔ یہ حضرات چوبیس گھنٹے مسجد نبوی میں رہ کر آپ ﷺ کی تعلیم اور کردار دونوں باتوں سے مستفیض ہوتے تھے۔ اسی یونیورسٹی سے سینکڑوں معلم، مبلغ، داعی اور قاری تیار ہوتے جو دوسرے علاقوں میں تعلیمی فرائض سراجمام دینے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم کو بہت ترقی دی اور تمام والیوں اور عاملوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ لوگوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیں۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ایک بار فرمایا کہ اے اللہ! میں اپنے تمام علاقوں کے عاملوں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے انہیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ کتاب و سنت کی تعلیم دیں۔ تمام افسروں کا تقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھتے کہ وہ عالم اور فقیہ بھی ہوں۔ ملکی افسروں کی فہرست میں بڑے بڑے ممتاز علماء کے نام پائے جاتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے علاوہ زبان و ادب اور حساب و ریاضی کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی۔ حساب دان تیار ہوئے حساب کے کاغذات نقشہ جات، دفاتر، محاصل کا باقاعدہ حساب اور سن سہجری کا اجراء آپ ﷺ ہی کے عہد میں ہوا۔

احساب سے مراد یہ ہے کہ رعایا کے اعمال و افعال پر کڑی نظر رکھی جائے آیا اس میں دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔ یا مکر و فریب اور بددیانتی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ خود رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ منڈی تشریف لے گئے۔ گندم کا ایک ڈھیر برائے فروخت پڑا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے اندر ہاتھ داخل کیا تو نمی محسوس ہوئی آپ ﷺ نے گندم کے مالک سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہے؟“ مالک نے کہا رات شب نام کافی بڑی تو یہ گیلی ہو گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو پھر تم نے اسے باہر کیوں

نہیں کیا۔“ پھر فرمایا: ”جس کسی نے ہم سے دھوکہ کیا اس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔“

(مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب قول النبی من غش فلیس منا)

اسی طرح ایک دکان دار کو دیکھا وہ ذرا کم تول رہا تھا آپ ﷺ نے فرمایا زِنْ وَاَرْجَحْ (تول تو ذرا جھکتا تول) یہ منڈی کی بات تھی آپ ﷺ جرنیلوں کی کارکردگی پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک مہم میں خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالار بنایا۔ انہوں نے چند ایسے آدمیوں کو قتل کر دیا جنہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ حضرت خالدؓ سے سخت برہم ہوئے اور پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو خالدؓ نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے جان بچانے کی خاطر یہ کلمات کہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا؟ ”کیا تم نے ان کا دل چیر کے دیکھ لیا؟ پھر آپ ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔ ”اے اللہ! میں خالدؓ کے اس کام سے بری الذمہ ہوں۔“ بعد ازاں آپ نے مقتولین کا خون بہا بھی ادا کر دیا۔

(حوالہ جات پہلے دیئے جا چکے ہیں)

اور بھی ایسے کئی واقعات ہیں جنہیں احتساب کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذور فاروقی میں حضرت عمرؓ نے باقاعدہ احتساب کا الگ محکمہ قائم کیا۔ فحاشی کے سد باب کے لیے وعید سزائیں اور حدود سب طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ جرائم کی روک تھام کے لیے عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ پہلی عدالت خود رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی جن کے فیصلے مسجد نبوی میں ہوتے تھے۔ چوری اور زنا کے کئی جرائم میں آپ ﷺ نے مجرموں کو سزائیں دیں۔

ذور فاروقی میں قضا و عدل کا الگ محکمہ ہوا۔ جہاں انصاف مفت حاصل ہوتا تھا اور جلد بھی۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا۔ کہ حضرت عمرؓ اپنا ذرہ پکڑے بازار میں گشت کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی جھگڑا یا جرم ہوتا دیکھا۔ موقعہ پر شہادتیں لیں۔ اور اسی مقام پر سزا سنا کر اسے نافذ بھی کر دیا۔ مفت اور بلاتا خیر انصاف سے جرائم میں حیران کن کمی واقع ہو گئی۔ تجربہ شاہد ہے کہ انصاف میں تاخیر جرائم کو کم کرنے کی بجائے اس میں پیہم اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

عقیدہ آخرت اور ارکان اسلام کی ادائیگی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ جو انسانوں کو ایسے تمام گناہوں سے رکنے کا موثر سبب بنتا ہے جن تک قانون کی دسترس نہیں۔ اس طرح فحاشی کے

تمام محرمات اور منکرات کا خاتمہ یا ان میں معتد بہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی مملکت کی ذمہ داریاں جو اسے مفتوحہ علاقوں میں سرانجام دینا پڑتی ہیں۔ اب بتائیے جو جرنیل فتح کے بعد خود بے گناہ شہریوں کا قتل عام کرتا ہو۔ لوٹ مار سے یا دوسرے طریقوں سے مفتوحہ علاقہ کی معیشت کو مفلوج کر دیتا ہو۔ فتح کے بعد فوجیوں کو مفتوحہ علاقوں کی عورتوں کی عصمت دری کی عام اجازت دیتا ہو، اور خود ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہو۔ وہ مفتوحہ علاقہ کی فلاح و بہبود کا خیال تک بھی دل میں لاسکتا ہے۔؟

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جنگ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری ملی تو آپ... نے ایک پُراثر تقریر فرمائی۔ جس کا آخری حصہ یہ تھا:

”مسلمانوں! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بناؤں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح کام کروں کہ تم چین سے سوؤ تو یہ میری سعادت ہے۔ اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو یہ میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ لیکن باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔ (الفاروق ص ۱۶ اشلی نعمانی)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ مفتوحہ علاقوں میں اسلام کس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کی تعلیم کیا ہے۔؟

www.KitaboSunnat.com

سکندر اپنے دور کی مہذب ترین قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں میں فلاح و بہبود کا کونسا کام کیا تھا؟ چنگیز کو عظیم جرنیل کے بجائے عظیم ڈاکو اور لیبر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ لوگ جرنیل ضرور تھے مگر انتظامی صلاحیتوں سے عاری تھے، البتہ نیولین میں انتظامی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے اندرون ملک کچھ اصلاحات بھی کیں مگر مفتوحہ علاقوں میں اس کی باری ہی نہیں آئی۔ جتنے علاقے اس نے فتح کیے یا زیر اثر بنائے، اس کی ناقص جنگی پالیسی اور سیاسی تدبیر کے فقدان کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کی آخری زندگی انتہائی ناکامیوں اور مایوسیوں میں گزری۔ بالآخر گرفتار ہوا اور چھ سال بعد مر گیا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں قیام امن، انتظام و انصرام اور بدی کے استیصال کے پہلو سے اگر تمام دنیا کے جرنیلوں کو دیکھا جائے تو رسول اللہ کی ذات ہمیں سب سے بلند نظر آتی ہے۔

(۱۱) ایفائے عہد:

مناسب موقع دیکھ کر معاہدات کو پس پشت ڈال دینا اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانا دنیا کا عام دستور ہے۔ اور دنیا کا کوئی جرنیل بھی اس معاملہ میں اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ امتیاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔ کہ وہ نقصان برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے۔ مگر عہد سے انحراف کسی قیمت پر جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ایفائے عہد بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَسَانٌ مِّنْهُنَّ﴾ (۲۳:۱۷)
(اے عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔)

اور نقض عہد کو ایک بدترین جرم قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم میں بے شمار آیات ہیں۔ جن کا درج کرنا یہاں ممکن نہیں۔

عہد ایک شخص کا دوسرے شخص سے ہو یا ایک شخص کا کسی قوم سے یا کسی قوم کا دوسری قوم سے۔ وہ بہر حال عہد ہے اور اس کا پورا کرنا عین فرض ہے۔ پھر جب یہ عہد کسی دوسری قوم یا قبیلہ یا ملک سے طے پا جائے تو سیاست خارجہ کی کامیابی کا انحصار اس ایفائے عہد پر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی عظمت یہ ہے کہ زندگی بھر دشمن آپ ﷺ سے بد عہدی اور غداری کرتے رہے۔ لیکن آپ ﷺ نے جو ابی کاروائی کے طور پر کبھی نقض عہد کو برداشت نہیں کیا۔ یہود کی بد عہدی تو زباں زد ہے۔ انہوں نے میثاق مدینہ کی ہر ہر بار خلاف ورزی کی۔ ان کی غداریوں اور عہد شکنیوں کے واقعات بے شمار ہیں۔

دوسرے قبائل نے بھی بد عہدی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد بنو بکر کی حمایت کر کے قریش مکہ نے معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کی۔ بنو نضلہ نے تبلیغ اسلام کی خاطر آپ ﷺ سے آدمی طلب کیے تو آپ ﷺ نے دس عالمان دین ساتھ روانہ کیے۔ انہوں نے غداری کر کے انہیں شہید کر دیا۔ یہی کام بنو عکمل و قارہ نے کیا۔ انہوں نے تبلیغ اسلام کے نام پر دس عالمان دین کو غداری سے شہید کر دیا اور بمر معونہ کا واقعہ تو بڑا ہی دردناک ہے جس میں ۷۰ ممتاز قاریان اور عالمان دین کے مقابلہ میں قبیلہ رعل اور ذکوان کی جمعیت لاکھوں شہید کر دیا گیا۔ جس کا رسول اللہ ﷺ کو بہت ہی زیادہ دکھ ہوا۔

اب اس کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے ایفائے عہد کے واقعات بھی سن لیجئے کہ کیسے نازک موقعوں پر آپ ﷺ نے ایفائے عہد پر اپنے ہر طرح کے مفادات کو قربان کر دیا۔

(۱) اسی بڑے معونہ کے حادثہ میں ایک صحابی عمرو بن امیہ بیچ نکلے لیکن بعد میں گرفتار ہو گئے۔ عامر بن طفیل، جس نے ان قاریان کو شہید کروایا تھا..... نے عمرو رضی اللہ عنہما بن امیہ کو دیکھ کر کہا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ لہذا میں یہ منت پوری کرنے کی خاطر عمرو بن امیہ کو چھوڑتا ہوں۔

عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہما کو راستے میں اسی قاتل قبیلہ کے دو افراد مل گئے تو آپ نے ان کو قتل کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حضور ﷺ ان دو آدمیوں کو امن دے چکے تھے۔ جس کا عمرو بن امیہ کو علم نہ تھا۔ اب حالات کا تقاضا یہ تھا کہ بنو عامر سے جتنی بھی ہو سکے ان کی غداری کی وجہ سے ان پر سختی برتی جاتی۔ لیکن آپ ﷺ نے اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہوئے ان دونوں آدمیوں کا خون بہا ادا کر دیا۔ (الہدایہ والنہایہ ص ۳۷)

(۲) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو حسیل رضی اللہ عنہما کسی سفر میں کفار کے ہتھے پڑھ گئے۔ انہوں نے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا تب ان کی جان چھوٹی۔ جنگ بدر میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے واقعہ بیان کیا۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے انہیں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی اور فرمایا ”ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہم کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد دیکار ہے۔“ (مسلم کتاب الجہاد والسیر باب الوفاء بالعہد)

(۳) صلح حدیبیہ کی شرائط لکھی جا چکی تھیں لیکن ابھی معاہدہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ کہ قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو کے لڑکے ابو جندل رضی اللہ عنہما قید سے فرار ہو کر پابہ زنجیر مسلمانوں کے سامنے گر گئے۔ وہ اپنے زخم دکھا دکھا کر رسول اللہ ﷺ سے التجا کر رہے تھے کہ آپ مجھے واپس نہ کیجئے، مسلمان پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، تڑپ اٹھے، بیعت رضوان مکمل ہو چکی تھی۔ اس حال میں آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے محض ایفائے عہد کی خاطر ابو جندل کو واپس کر دیا۔ اور فرمایا۔ ”ابو جندل رضی اللہ عنہما صبر اور ضبط سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی

راہ نکالے گا صلح کی شرائط اب طے ہو چکیں اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔“ (ابن ہشام)

(۴) مکہ میں رہ جانے والے مظلوم مسلمانوں میں سے ایک عتبہ بن اسید (ابولصیر) تھے۔ یہ بھی کفار قریش کے مظالم سے تنگ آ کر مدینہ بھاگ آئے، ساتھ ہی قریش کے دو آدمی پہنچ گئے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے ابولصیر رضی اللہ عنہ سے واپس جانے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا۔ آپ مجھے کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ پھر مجھے کفر پر مجبور کر دیں۔ اب ایک طرف کفر کا خطرہ سامنے تھا، دوسری طرف ایفائے عہد۔ آپ ﷺ نے عتبہ سے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اس کی کوئی راہ نکالے گا اور عتبہ کو کافروں کی حراست میں دے دیا۔ راستہ میں عتبہ نے ایک گنجان کو قتل کر دیا۔ دوسرا مقرر ہو کر پھر مدینہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ اور شکایت کی۔ ساتھ ہی ابولصیر بھی آپ ﷺ کے پاس پہنچ گئے اور کہا، ”آپ ﷺ نے عہد کے مطابق مجھے واپس کر دیا تھا۔ اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔“ (طبری ج ۱ ص ۱۰۰)

(۵) غرض ایسے نازک موقعوں پر آپ ﷺ کے ایفائے عہد کے واقعات بے شمار ہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کی اس خوبی کا اعتراف کرتے تھے، جنگ احزاب کے موقع پر جب بنو نظیر کے سردار جی بن اخطب نے بنو قریظہ کو عہد شکنی پر برا بھینچتے کیا تو بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد نے یوں جواب دیا۔

((فانسی لم ارمن محمد الا صدقاً (میں نے محمد کو ہمیشہ سچ کہنے والا اور وعدہ ووفاء))
پورا کرنے والا پایا ہے۔)

کعب بن اسد کی اس شہادت کے باوجود کہ صدق اور وعدہ ووفائی بہت بڑی خوبی ہے۔ جو محمد میں پائی جاتی ہے۔ جب اس کی اپنی باری آئی بالآخر عہد شکنی ہی کی۔

(طبری۔ ج ۱ ص ۱۰۰ خندق)

پھر یہ خوبی آپ ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ﷺ کے جانشینوں نے بھی عہد کی پوری پوری پابندی کر کے مثال قائم کر دی۔

دور فاروقی میں شام کی فتوحات کی سلسلہ جاری تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کا

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

محاصرہ کر رکھا تھا۔ ایک دن اہل دمشق کوئی جشن منا رہے تھے۔ حضرت خالد بن ولید ؓ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند جانبازوں کے ہمراہ فصیل پر کند لگائی۔ اوپر چڑھے اور قلعہ کے دروازے کھول دیے۔ خالدی فوج فاتحانہ انداز میں قلعہ میں داخل ہو گئی۔ اہل دمشق نے دوسری جانب حضرت ابو عبیدہ ؓ سے مصالحت کی درخواست کر دی۔ جو انہوں نے نئی صورت حال سے لاعلمی کی بنا پر قبول کر لی۔ چنانچہ محض ایفائے عہد کی خاطر حضرت ابو عبیدہ ؓ نے مفتوحہ علاقہ اہل دمشق کو واپس دے دیا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۱۳۸)

شام کی فتوحات کے دوران عیسائیوں نے صلح کے لیے اپنے قاصد جارج کو حضرت ابو عبیدہ ؓ کے پاس بھیجا۔ وہ شام کے وقت پہنچا۔ نماز باجماعت کا پر کیف منظر دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔ بعد میں حضرت عیسیٰ کے متعلق چند سوال کیے جن کا حضرت ابو عبیدہ ؓ نے شافی جواب دیا۔ نتیجتاً جارج مسلمان ہو گیا۔ اور چاہا کہ یہیں رہ جائے لیکن حضرت ابو عبیدہ ؓ نے محض اس خیال سے کہ رومیوں کو بد عہدی کا گمان نہ ہو اسے مجبور کیا اور کہا کہ کل یہاں سے جو سفیر جائے گا اس کے ساتھ چلے جانا۔ (الفاروق ص ۱۹۶)

(۱۲) امان یا پناہ:

امان یا پناہ بھی ایفائے عہد ہی کی ایک قسم ہے۔ مسلمانوں کا ایفائے عہد دشمنوں میں بھی اس قدر زبان زد تھا کہ دشمن نے بعض دفعہ مسلمانوں کی کسی واقعہ سے لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر امان حاصل کی۔ اور عظیم فائدے حاصل کیے، اور مسلمان جو پناہ دے چکے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ ان سے ٹکرو فریب سے امان حاصل کی گئی ہے، اپنا نقصان اٹھا کر بھی اس عہد کو پورا کیا۔

غلام کی امان:

فوزستان (ایران) کی فتوحات کے سلسلہ میں ایک مقام جندی شاور کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا ہوا تھا کہ ایک دن شہر والوں نے خود شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے اور نہایت اطمینان سے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ مسلمانوں کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ سب پوچھا تو شہر والوں نے کہا کہ: ”تم ہم کو جزیہ کی شرط پر امان دے چکے ہو۔ اب کیا جھگڑا رہا۔“ سب کو حیرت تھی کہ امان کس نے دی؟ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک غلام نے لوگوں سے چھپا کر امن کا رقعہ لکھ دیا

ہے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ایک غلام کی امان جھٹ نہیں ہو سکتی۔ شہر والے کہتے تھے کہ ہم آزاد غلام نہیں جانتے۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ ”مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے اور جس کو اس نے امان دی تمام مسلمان امان دے چکے۔“
(الفاروق ص ۲۳۱)

دھوکہ کی امان:

عراق و ایران کی جنگوں کے سلسلہ میں غارق کے مقام پر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور جاپان سالار لشکر کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ جاپان شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ مگر جس مجاہد نے اسے گرفتار کیا تھا وہ اسے پہچانتا نہیں تھا۔ جاپان نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عوض دونو جوان غلام دینے کا وعدہ کر کے امان لے لی۔ اتنے میں کسی دوسرے نے اسے پہچان لیا اور پکڑ کر سردار لشکر کے پاس لے گئے۔

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسے دشمن کا چھوڑ دینا اگرچہ ہمارے حق میں بہت مضرت ثابت ہوگا مگر ایک مسلمان اسے امان دے چکا ہے۔ اس لیے بدعہدی جائز نہیں۔ چنانچہ وعدہ کے مطابق اسے رہا کر دیا گیا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۱۳۲)

(۱۳) فراست یا دور اندیشی:

حالات جنگ (حرب - WAR) یا میدان جنگ (قتال - BATTLE) میں بعض دفعہ ایسے حالات پیش آجاتے تھے کہ جرنیل اپنی کسی مجبوری یا مصلحت کی وجہ سے صلح پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن دشمن ایسی شرائط پیش کر دیتا ہے۔ جو بظاہر تو بہن آمیز اور ناگوار ہوتی ہیں۔ اس وقت اپنی مصالحتوں اور شرائط کے نتائج کا صحیح موازنہ کر کے مناسب اقدام کرنا جرنیل کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہوتی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ناراضگی کے باوجود کفار کی کڑی اور توہین آمیز شرائط کو کیوں قبول کیا اور اس کے نتائج کیسے شاندار رہے۔

سکندر اعظم اور چٹلیز خان کو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان کی تمام تر زندگی مار دھاڑ

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

میں گزری۔ البتہ نپولین کی زندگی میں ایک مرتبہ ایسا واقعہ بھی پیش آ گیا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اکتوبر ۱۸۱۳ء میں اتحادیوں نے نپولین کو لپزگ (LAPIZG) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ جس کے نتیجے میں جرمنی کی ریاستوں (جن کا نپولین نگران بنا ہوا تھا) سے اتحاد ٹوٹ گیا۔ ہالینڈ آزاد ہو گیا اور بویریا اتحادیوں سے مل گیا۔ نپولین کو دریائے رائن عبور کر کے فرانس کی سرحد پر آنا پڑا۔ اب نپولین کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود فرانس کی حفاظت کیسے ہو؟

ایسے نازک حالات میں ۱۸۱۳ء میں اتحادیوں نے نپولین کو صلح کی پیشکش کی جسے فرینک فورٹ (FRANKFORT) کی شرائط کہتے ہیں۔ اس پیشکش کی رو سے فرانس کو اپنی اصلی اور قدرتی حدود کے اندر مقید رہنا پڑتا تھا۔ اتحادیوں نے یہ پیشکش کی تھی کہ فرانس کی سرحد ایک جانب کوہ ایلپس اور پائرنس (PYRENESS) تک ہوگی اور دوسری جانب دریائے رائن تک۔ اگر نپولین ان شرائط کو مان لیتا تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی اور اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ مگر اس وقت بھی اس کے سر پر فرانس کی وسیع سلطنت کا بھوت سوار تھا۔ لہذا اس نے ان ذلت آمیز شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادیوں نے فرانس پر دھاوا بول دیا۔ نپولین نے گوڈٹ کر مقابلہ کیا مگر چند ہفتوں کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ لڑائی بیکار ہے۔ دشمن کی فوجیں بیرس کے دروازوں تک پہنچ چکی تھیں لہذا ۱۶ اپریل ۱۸۱۴ء کو قصر شاہی سے ایک اعلان جاری کیا جس کی رو سے وہ فرانسیسی تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اور اتحادیوں نے اسے جزیرہ ایلینا میں بھیج دیا۔ (جدید تاریخ یورپ۔ ایم ٹی ایس الدین)

اگر اس وقت نپولین غرور و نخوت کے بجائے دور اندیشی سے کام لیتا تو اسے یہ بڑے دن دیکھنا نصیب نہ ہوتے۔

(۱۴) تربیت یافتہ جانشین:

کسی جرنیل کی عظمت کا پہلو یہ بھی ہے کہ اپنے سالاروں کی تربیت کیسے کرتا ہے۔ اور اپنے بعد کتنے اور کیسے جانشین چھوڑ کر جاتا ہے؟ اس لحاظ سے سکندر اعظم کو دیکھئے تو اس کے جانشینوں میں ہمیں صرف سلوکس کا نام نظر آتا ہے۔ جس نے ایشیا میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کو پائیداری نصیب نہ ہو سکی۔ چنگیز نے اپنے مفتوحہ علاقے اپنے چار بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ چنگیز ہی کا ایک پوتا ہلاکو خاں تھا۔ جس نے بغداد کو فتح کرنے کے بعد وہ مظالم ڈھائے کہ

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

دادا کی وحشت و بربریت کو بھی مات کر دیا۔

نیپولین کی ۱۸۰۷ء سے بعد کی زندگی، ناکامیوں اور مایوسیوں کی پروردستان بن گئی
لہذا وہ اپنے سالاروں کی کیا تربیت کرتا؟

اب رسول اللہ ﷺ کے جانشینوں کا حال سنئے۔ ان میں سے ایک خالد بن ولید ہیں۔

جنہوں نے:

☆ جنگ موتہ میں تین ہزار فوج سے دشمن کی ایک لاکھ فوج کا منہ پھیر دیا۔

☆ عراق و ایران کا بیشتر اور شام کا نصف حصہ فتح کیا۔

☆ اسلام لانے کے بعد زندگی بھر کبھی شکست کا مزہ نہیں دیکھا، آپ ﷺ کی ہمیشہ یہ آرزو

رہی کہ میدان جنگ میں شہادت نصیب ہو مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

☆ خالد ﷺ کی معزولی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ لوگ سمجھتے لگ گئے تھے کہ فتح اور خالد

ﷺ بن ولید لازم و ملزوم ہیں۔

☆ خالد ﷺ کا کردار اتنا بلند تھا کہ عین معرکہ حق و باطل میں حضرت عمر ﷺ کی طرف سے

معزولی کا حکم ملتا ہے تو کسی قسم کا ملال لائے بغیر حضرت ابو عبیدہ ﷺ بن الجراح کی

ماتحتی میں ہی جوش و خروش سے جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک خود حضرت عمر ﷺ ہیں جو دربار خلافت میں بیٹھ کر تمام جنگوں

کے نقشے خود تیار کرتے تھے۔ سپہ سالاروں کے بارے میں بڑی دور اندیشی سے کام لیتے اور انہیں

مسلل ہدایات جاری کرتے رہتے تھے۔ ان سے کام لینا جانتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ

کے حکم سے سرتابی کرے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اپنے دور میں حضرت عمر ﷺ خود سپہ سالار اعظم

تھے۔

پھر ان میں سے ایک حضرت عمرو بن عاص ﷺ ہیں جنہوں نے شام کا بہت سا علاقہ

بھی فتح کیا۔ جنہیں حضرت عمر ﷺ مزید پیش قدمی سے روکتے ہی رہے۔ لیکن آپ نے کسی نہ کسی

خیلے بھانے ان کی اجازت لے کر پورے مصر کو فتح کر ڈالا۔ اور فاتح مصر کہلائے۔

پھر ان میں سے ایک ابو عبیدہ بن الجراح ﷺ ہیں جن کی عظمت کے لیے یہ بات کافی

ہے کہ حضرت عمر ﷺ جیسے مدبر سیاست دان نے خالد ﷺ بن ولید کو معزول کر کے سپہ سالاری کا

رسول اللہ ﷺ عظیم ترین سپہ سالار کیوں تھے؟

تاج انبیا نہیں پہنایا اور جنہوں نے شام کی فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان میں سے ایک سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو قادیسیہ کو فتح کرنے کے بعد مدائن کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ راہ میں دریائے دجلہ پورے زور و شور سے بہ رہا تھا دشمن نے پل توڑ کر بے کار کر دیا اور کشتی بھی موجود نہیں تھی۔ سب سے پہلے آپ نے بے تکلف دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی فوج بھی دریا میں داخل ہو گئی دریا موج اور زخار تھا۔ لہریں اور موجیں آ آ کر گھوڑوں سے ٹکراتی تھیں۔ لیکن مسلمان رکابوں میں رکابیں ملائے باتیں کرتے دریا کے اس پار تک چلے گئے۔ جب ایرانیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سمجھے کہ یہ انسانی بہت سے بالاتر کوئی چیز ہے اور دیواں آمدند! دیواں آمدند (یعنی دیو آ گئے) کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔

غرض کہاں تک شمار کیا جائے۔ انہی جرنیلوں میں مغیرہ بن شعبہ بھی ہیں، عقبہ بن موسیٰ بھی، طارق بن زیاد فاتح اندلس بھی اور محمد بن قاسم فاتح سندھ بھی، اور ان سب جرنیلوں کی نمایاں خوبی رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر ہے کہ جو نسا علاقہ فتح کیا، وہاں امن اور عدل و انصاف کا نظام قائم کیا، رعایا کی فلاح و بہبود کا پورا خیال رکھا۔ ان سے معاہدات کی پابندی کی اور وہاں علم و تہذیب کی روشنی فروزاں کر کے ان کو اپنا ہمدرد اور دوست بنایا ہے۔ اپنے دشمن پیدا نہیں کیے۔ مسلمانوں کے دشمن اس وقت پیدا ہونے لگے۔ جب مسلمانوں نے خود جہاد کی روح کو ختم کر کے اسے عام دنیوی جنگوں میں بدل دیا۔ پھر اس کے نتائج بھی وہی ہونا چاہئیں تھے۔ جو عام دنیوی جنگوں سے پیدا ہوتے ہیں۔



چند ضمنی مباحث

باب نمبر

اسلام اور بانی اسلام

پر
چند اعتراضات کا جائزہ

(۱) اشاعتِ اسلام اور تلوار

مستشرقین کا یہ پروپیگنڈہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ کہ ”اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے“ اور اس اعتراض کے کافی وثائق بھی دیے جا چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض نہ عقلی اعتبار سے درست ہے نہ نقلی اعتبار سے۔ مزید برآں تاریخی واقعات بھی اس اعتراض کے تائید کی بجائے تردید کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر سا جائزہ پیش کریں گے۔

(۱) اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر:

نقلی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔
ارشاد باری ہے۔

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (۲۵۶:۲) (دین میں کوئی جبر نہیں۔)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿إِفْأَنْتَ تَكْرَهُ السَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مَوْمِنِينَ﴾ (۹۹:۱۰) (کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔)

اللہ تعالیٰ عوام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ﴾ (جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔) (۲۹:۱۸)

ایسی واضح ہدایات کی موجودگی میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ آپ کے صحابہ نے اس حکم کی خلاف ورزی کی ہوگی اور ان واضح احکام کے بعد کسی کو اسلام لانے پر

مجبور کیا ہوگا۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

﴿وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه ما منه﴾ (٦:٩) اس کو اس کی جگہ واپس پہنچادو۔

غور فرمائیے کہ تلوار یا داؤ کے استعمال کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے۔ جب ایک مشرک کسی مسلمان کی پناہ میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسے مجبور کرو یہاں تک اسلام لے آئے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اسلام کی تبلیغ پورے طور پر کر دو۔ مانے نہ مانے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ پھر اگر وہ نہیں مانتا تو بھی تمہیں اس پر زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے بجائے تمہیں یہ چاہیے کہ ایسی صورت میں اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچادو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اسبق ایک عیسائی تھا۔ آپ ﷺ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ کیونکہ آدمی سمجھ دار اور ہوشیار تھا۔ آپ نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ ہم مسلمانوں کے کام میں تم سے مدد لیں گے۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ آپ اسے کوئی اچھا منصب عطا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اس پر اسلام پیش فرماتے تو وہ انکار کر دیتا اور آپ ﷺ کو براہ فی الدین کہہ کر چپ ہو جاتے۔ (الجبہادی الاسلام ص ۱۶۳)

(۲) عقل کی کسوٹی پر:

عقلی اعتبار سے یہ مفروضہ اس لیے غلط ہے۔ کہ تلوار کے زور سے کسی سے کوئی بات منوائی نہیں جاسکتی اور اگر بھبر و اکراہ کوئی شخص ایک بات مان بھی جائے تو اسے اس بات پر قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلمان ہوئے۔ وہ دل جان سے اسلام کے فدائی اور شیدائی بن گئے۔ بلاشبہ کچھ لوگ مرتد بھی ہوئے۔ لیکن ان کا شمار ایک فی ہزار بھی نہیں۔ اور یہ تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اگر تلوار کے ذریعہ کوئی بات منوائی جاسکتی ہے۔ تو قریش مکہ نے حضور اکرم ﷺ اور دوسرے مسلمانوں سے اپنی بات کیوں نہ منوائی۔ جبکہ انہوں نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور بھی صرف کر لیا تھا یا

جن مشہور فاتحین نے بہت سے علاقے فتح کیے۔ ان میں سے کوئی ایسا بھی مفتوح علاقہ بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جس نے فاتح قوم کے نظریات کو محض تلوار کے زور سے دل جان سے تسلیم کر لیا ہوگا۔

تاریخی حقائق کی کسوٹی پر:

اگر تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلنے کے نظریہ کو درست سمجھ لیا جائے تو مندرجہ ذیل سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

(۱) ابتداءً جو لوگ مسلمان ہوئے اور ۱۳ سال تک مکہ میں ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہے انہیں کون سی تلوار نے مسلمان کیا تھا؟

(۲) مدینہ پہنچ کر جنگ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے پاس کون سی تلوار تھی؟ تلوار اگر تھی تو وہ قریش کے پاس تھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جنگ بدر تک کے چودہ سال میں صرف ۳۱۳ مجاہدین اسلام سامنے آتے ہیں لیکن ایک سال بعد جنگ احد میں یہ تعداد سات سو تک جا پہنچتی ہے۔ یعنی ایک سال میں تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ اضافہ کون سی تلوار نے کیا تھا؟

(۳) جنگ احد میں بھی تلوار دشمن کے پاس تھی جو تعداد میں چار پانچ گنا بھی تھا اور مسلح بھی۔ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تلوار والوں سے بہت سی تعداد مسلمانوں سے آملتی ہے۔ اور دو سال بعد جنگ خندق کے موقع پر مجاہدین کی تعداد ۳ ہزار یعنی جنگ احد سے چار گنا ہو جاتی ہے۔

(۴) صلح حدیبیہ میں تلوار کا مسئلہ ہی سامنے نہیں آیا۔ لیکن مسلمانوں کی جمعیت میں ۱۱ تعداد اضافہ ہو گیا۔

(۵) یہودیوں سے جو جنگیں ہوئیں ہیں۔ ان میں بھی تلوار یہودیوں کے پاس تھی۔ جیسا کہ ان کا اپنا بیان ہے۔ ان کی مشہور جنگ خیبر تھی۔ جس میں مسلمان صرف چودہ سو تھے اور یہود ۱۰ ہزار۔ اس کے نتیجہ میں بھی بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

(۶) فتح مکہ میں یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ قریش مکہ کو عام معافی تو مل چکی تھی۔ پھر انہیں اسلام لانے پر کون سی تلوار نے مجبور کیا۔

(۷) محاصرہ طائف میں محاصرہ اٹھا لینے کے بعد اہل طائف کو اسلام لانے کی کیا مجبوری آگئی تھی؟

مندرجہ بالا پہلوؤں پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ یہ مفروضہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ لیکن ایک حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور وہ یہ کہ ”اسلام نہایت کثرت سے پھیلا ہے“۔ اب ہمیں ایسے اسباب تلاش کرنے چاہیں۔ جو اس کثرت اشاعت کا باعث بنے۔ ہمارے خیال میں یہ اسباب اسلام کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

اشاعت اسلام کے اسباب

(۱) معاشرتی مساوات:

کوئی شخص یا کوئی قوم جس وقت اسلام آتی ہے۔ اسی وقت سے اسے سابقہ مسلمانوں کے سے جملہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کثرت اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ بنی۔

جرمن قوم اگر کوئی علاقہ فتح کرے۔ تو مفتوح قوم کتنا ہی جرمن قوم جیسا اپنے عادات و اطوار کو ڈھال لے۔ اور اپنے آپ کو فاتح قوم کے رنگ میں رنگنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھے۔ پھر بھی وہ جرمن قوم میں شمار نہیں ہو سکتی اور نہ ہی جرمن قوم اسے اپنی قوم جیسے اور جتنے حقوق عطا کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ یہی حال دوسری فاتح اور مفتوح قوموں کا ہے۔ لیکن مسلمان اگر کسی علاقہ کو فتح کریں۔ اور مفتوح علاقہ اسلام لے آئے تو فاتح و مفتوح کے درجہ میں چنداں فرق نہیں رہتا۔ مفتوح علاقہ اسلامی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس پر نہ کوئی جزیہ نہ خراج اور نہ ہی حکمران کی تبدیلی غرضیکہ اسلامی حکومت ایسے مفتوح علاقے میں کسی قسم کی انتظامی تبدیلی نہیں کرتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حکمران اپنے ذاتی اوصاف کی بنا پر اسلامی حکومت میں پہلے سے بھی زیادہ معزز بن جائے۔ اور ہمیں تاریخ سے ایسے کئی واقعات مل جاتے ہیں۔ کہ کئی حکمرانوں اور قوموں نے اسلام اسی وجہ سے قبول کیا تھا۔

یزدگرد کے مقدمتہ الحیش کے سالار کا نام سیاہ تھا۔ یزدگرد نے تین سو بڑے بڑے

رئیس اور پہلو ان اس کے ہمراہ کیے کی اصطلاح کی طرف جا کر اسلامی فوج کا مقابلہ کرے جب اسلامی فوجیں تتر پتر تھیں تو سیاہ اپنے سرداروں کے ساتھ ان اطراف میں مقیم تھا۔ ایک دن اس نے تمام ہمراہیوں کو جمع کر کے کہا کہ ”ہم لوگ جو پہلے کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ (عرب) ہمارے ملک پر غالب آجائیں گے۔ اس کی روز بروز تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ خود اسلام قبول کر لیں“۔ چنانچہ اسی وقت سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

(فتوح البلدان ص ۳۷۴)

یہی صورت حال شام اور مصر کے اطراف میں بھی تھی۔ اور لوگ عہد فاروقی میں کثرت سے مسلمان ہوئے۔ جو کہ اسلام کی فیوض و برکات کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے۔ تلوار کے زور سے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو بھی مسلمان نہ بنا سکے۔ دوسروں کو کیسے بنا سکتے تھے؟

اسی معاشرتی مساوات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام ذات پات میں تمیز کا قائل نہیں۔ نہ گورے کو کالے پر کچھ فوقیت ہے، نہ عربی کو عجمی پر بال رضی اللہ عنہ حبشی کو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ”سیدنا“ کہہ کر پکارتے ہیں۔ مسجد میں آقا و غلام گورے اور کالے، چٹے اور اونچی ذات والے، امیر اور غریب سب ایک ہی صف میں ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اسلام کو شرف حاصل رہا ہے کہ پہلے بھی اور آج بھی معاشرہ کا نچلے درجہ کا طبقہ، جسے اونچے درجے کا طبقہ عموماً دکھتے کرتے ہیں، ہمیشہ اسلام کے دامن میں آکر پناہ لیتا رہا ہے۔ اچھی چندوں کی بات ہے۔ اخبارات میں ایک خبر جو اس طرح کے عنوان سے شائع ہوئی تھی:۔

”جنوبی بھارت میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آکر ۱۳۰۰ نے

اسلام قبول کر لیا“۔ (نوائے وقت - ۴ جولائی ۱۹۸۱ء)

بتائیے ان ہریجنوں کو کون سی تلوار نے اسلام لانے پر مجبور کیا تھا؟ پھر ۱۵ جولائی کو اسی اخبار نوائے وقت میں ہندوستان کی وزیراعظم مسز اندرگانندھی نے کہا تھا ”مجھے تکلیف ان لوگوں کے اسلام لانے پر نہیں بلکہ اسباب پر ہے؟

اور یہ ”اسباب“ جن پر وزیراعظم صلابہ کو افسوس ہوا۔ وہ تو ان کے مذہب کا جزو الاینٹک ہیں۔ ہندومت برہمن کو تو بالائے مخلوق سمجھتا ہے لیکن شودر کو انسان بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ شودر برہمن کا پیدائشی غلام ہے۔ اور غلامی کا یہ پھندا کسی صورت اس کی گردن سے اتر نہیں

سکتا۔۔ انہی ”اسباب“ کو اسلام نے ختم کیا۔ اور انہی اسباب کے خاتمہ کی وجہ سے اسلام ہر دور میں پھیلتا رہا اور ہندوستان میں بھی پھیلا۔

اب یہاں سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان ہریجنوں نے ہندومت کی ذات پات کے اس انسانیت کش تقسیم سے تنگ آ کر آخر اسلام ہی کیوں قبول کیا۔ کوئی دوسرا مذہب کیوں نہ قبول کر لیا۔ اس بات کا جواب نوائے وقت ۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء کی مندرجہ ذیل خبر سے آپ کو مل جائے گا۔ خبر کا عنوان ہے ”پانڈیچری میں ڈیڑھ ہزار برہمن مسلمان ہو گئے۔“

”پانڈیچری۔ ۳۰ جولائی (ن۔ ۱) ہریجنوں کے لیڈر مسز سی کرشنا مورتی نے مشرف پر اسلام ہونے کے بعد اخباری نمائندوں کو بتایا کہ عیسائی مذہب قبول کرنے سے سماجی حیثیت بلند نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمان ہونے سے ہمارا سماجی مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ حتمی ہے اور اس میں کوئی سیاسی مصلحت نہیں۔ واضح رہے کہ اس سے قبل تامل ناڈو کے موضع میناکشی پورم میں ہریجنوں نے اجتماعی طور مذہب اسلام قبول کر لیا ہے۔“ (نوائے وقت۔ حوالہ مذکور۔ ص ۸)

(۲) قانونی مساوات:

قانونی مساوات سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ کا کوئی ممتاز سے ممتاز فرد حتیٰ کہ صدر مملکت بھی قانون کی دسترس سے بالاتر نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے۔ جو اسلامی ریاست کے علاوہ اور کہیں پایا جانا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس ریاست میں اقتدار اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔ باقی سب لوگ ایک ہی سطح پر اس کے محکوم اور اطاعت گزار بندے۔ ایک دفعہ خود حضور اکرم ﷺ نے اپنے آپ کو پیش کر کے یہ اعلان کر دیا۔ کہ ”جس کسی نے مجھ سے کوئی بدلہ یا قصاص لینا ہو وہ آج لے سکتا ہے۔“ پھر جب آپ ﷺ کے قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ کی ایک عورت فاطمہ مخزومی نے چوری کی تو آپ ﷺ سے اس جرم کی سزا موقوف کرنے کی سفارش کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

”پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ہی یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی کمزور جرم کرتا تو اسے سزا دیتے اور اگر شریف وہی جرم کرتے تو ان کی سزا موقوف کر دی جاتی یہ تو فاطمہ مخزومی کی بات ہے۔ خدا کی قسم! اگر میری اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“ (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مقام النبی بمسکة زمن الفتح)

خلافت راشدہ کے عہد میں کئی بار ایسا ہوا۔ کہ خلیفہ وقت کو مدعی یا مدعا علیہ کی صورت میں عدالت میں پیش ہونا پڑا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اکثر فیصلہ ان کے خلاف صادر ہوا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے انتخاب کے بعد خطبہ جو ارشاد فرمایا۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ ”تمہارا کمزور میری نگاہوں میں قوی ہے۔ اور قوی میری نگاہوں میں کمزور ہے۔“ جس کا مطلب واضح الفاظ میں یہ تھا۔ کہ تمام قانونی طاقتیں کمزور کے ساتھ ہیں جب تک کہ اسے ظالم سے اس کا حق نہ دلاو دوں اور طاقتور کو قانون کی طاقت سے ظلم سے روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔

چنانچہ ان خلفاء نے ایسا نظام عدالت رائج کیا جہاں مفت اور بلا تاخیر انصاف حاصل ہوتا تھا۔

”دور فاروقی میں شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے حضرت معاذ بن جبل کو رومیوں کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ شہنشاہ کا دربار اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر آپ نے فرمایا:۔“ ”تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں گے۔ چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اس کو ترجیح نہیں۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے دور خلافت میں ان کی اپنی زرہ چوری ہو گئی۔ جو آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کیا کہ یہودی سے اپنی زرہ چھین کر اسے کیفر کردار کو پہنچا دیتے۔ بلکہ قاضی شریح کی عدالت میں اس یہودی پر دعویٰ دائر کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گواہ ان کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے غلام تھے۔ قاضی شریح نے آپ کا مقدمہ صرف اس بنا پر خارج کر دیا کہ یہ شہادتیں اسلامی ضابطہ عدل کے تقاضے پورے نہیں کرتیں۔ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت اپنے آقا کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ حالانکہ عدالت کو خوب معلوم تھا کہ مدعی اور گواہ سب عادل اور ثقہ ہیں لیکن عدل کا تقاضہ یہی تھا کہ مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

یہ صورت حال دیکھ کر یہودی نے زرہ بھی واپس کر دی اور خود بھی مسلمان ہو گیا۔

غور فرمائیے۔ اس یہودی کو اسلام لانے پر کس بات نے مجبور کیا تھا؟ اور یہ بھی سوچئے کہ کیا وہ اکیلا ہی مسلمان ہوا ہوگا؟ اور یہ بھی کہ مسلمان ہوا تو اس نے زرہ کیوں واپس کر دی؟ ایسے واقعات دراصل انفرادی نتائج کے حامل نہیں ہوتے بلکہ ایک جہان کے افکار و نظریات میں تلاطم برپا کر دیتے ہیں۔

(۳) کردار کی پاکیزگی:

ہمارے خیال میں اشاعت اسلام کا تیسرا بڑا سبب مسلمانوں کے کردار کی بلندی اور پاکیزگی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کا سب سے بڑا ذریعہ تبلیغ ان کا اپنا عمل و کردار تھا۔ ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے پاک تھی۔ دشمن ان کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

دمشق اور حمص میں شکست کے بعد عیسائی انطاکیہ پہنچے اور وہاں جا کر ہرقل شہنشاہ روم سے فریاد کی کہ اہل عرب نے تو تمام شام کو پامال کر دیا۔ ہرقل نے ان میں چند تجربہ کار اور معزز آدمیوں کو دربار میں بلا کر کہا کہ ”عرب تم سے زور میں، جمعیت میں ساز و سامان میں الغرض ہر لحاظ سے کم ہیں۔ پھر تم ان کے مقابلے میں کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟ اس پر سب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اس پر ایک تجربہ کار بڑھے نے عرض کی کہ:-

”عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں۔ وہ رات کو عبادت کرتے اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ ان کے کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے۔ اور ہمارا جو کام ہوتا ہے وہ ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔“

(الفاروق ص ۱۸۹)

اس بڑھے عیسائی کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل پک کر تیار ہو چکا ہے اور عنقریب اسلام کی جھولی میں جانا چاہتا ہے۔ محمد بن قاسم سندھ اور ملتان کے علاقہ میں تھوڑی ہی مدت رہا۔ وہ عظیم جرنیل ہونے کے علاوہ جہاں بانی کی صفات سے بھی مالا مال تھا۔ ہندو حکومت اور سندھی بت پرستوں سے مذہبی رواداری نے سندھیوں کے دلوں کو کچھ اس طرح موہ لیا تھا کہ جب محمد بن

قاسم سندھ سے واپس گیا تو یہی سندھی اس کی تصویریں بنا بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ وہ اسے رحمت کا فرشتہ سمجھتے تھے۔ پھر جب انہیں محمد بن قاسم کی دردناک موت کا حال معلوم ہوا تو سارے ملک نے سوگ منایا۔ (تاریخ اسلام۔ حمید الدین ص ۳۰۸)

یہ سندھی لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پھر آخر وہ کیا چیز تھی۔ جس نے انہیں محمد بن قاسم کا اس قدر گرویدہ بنا دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے بھی انہیں مسلمان بنانے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے خود اسلام کے قریب تر آ رہے تھے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ کیا یہ تلوار کا کرشمہ تھا؟

(۴) معاملات کی صفائی:

اسلام میں اکل حلال کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ جائز و ناجائز کی بڑی تفصیل کرتا اور ناجائز ذرائع سے کمائے ہوئے مال کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن دین اور معاملات کی صفائی بلخصوص ایسے حالات میں ایک امتحان بن جاتی ہے۔ جب کہ کسی محنت یا حق کا معاوضہ تو پیشگی وصول کیا جا چکا ہو۔ اور اس حق یا محنت کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کا اختیار بھی کلیتاً معاوضہ وصول کرنے والے کے ہاتھ میں ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص یا ادارہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تمیز کرتا ہے، تو وہ فی الواقع قابل تعریف ہے۔ اور دوسرے لوگ اٹل کے کردار کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شام کی فتوحات کے سلسلہ میں کچھ جنگی مصلحتوں کے پیش نظر مسلمانوں کو حمص سے واپس جانا پڑا مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اہلیان حمص سے جزیہ وصول کر چکے تھے اور ان کی دفاعی حفاظت قبول کر چکے تھے آپ نے ان لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا۔ ”ہم کو جو تعلق تمہارے ساتھ تھا۔ وہ اب بھی ہے، لیکن چونکہ اس وقت تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس لیے جزیہ جو خدمت کا معاوضہ ہے۔ تم کو واپس کیا جاتا ہے۔“ چنانچہ کئی لاکھ وصول شدہ رقم واپس کر دی گئی۔

عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ خدائے تم کو واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ انہوں نے کہا۔

”تورات کی قسم! جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے اور ہر جگہ چوکی کا پہرہ بٹھادیا۔“ (الفاروق ص ۱۹۱)

اب دیکھئے یہودی حمص پر عیسائیوں کا قبضہ گوارا نہیں کر سکتے اور ان پر مسلمانوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ عیسائی خود بھی ہر قتل کے بجائے مسلمانوں کے چلے جانے پر آنسو بہاتے ہیں۔ تلوار کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب ان لوگوں کے دلوں کو کس چیز نے مسحور کر دیا تھا؟

(۵) عفو و درگزر:

جب کسی دشمن پر پوری طرح قابو پایا جائے۔ اس وقت اس کے جرائم سے چشم پوشی کر کے اسے معاف کر دینا بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ یہ بھی اشاعت اسلام کے اسباب میں سے ایک بڑا اہم سبب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ:-

(۱) غزوہ ذات الرقاع سے واپسی پر ایک بدو درخت سے لٹکی ہوئی تلوار سونت کر کھڑا ہو

گیا۔ جب کہ آپ ﷺ سورہے تھے۔ آپ ﷺ اٹھے تو اس بدو نے، جو کہ آپ ﷺ

کے دشمن قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، کہا۔ اب تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ ﷺ

نے کہا۔ ”میرا اللہ“ یہ سنتے ہی اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ آپ

ﷺ نے تلوار سنبھالی۔ بعد ازاں اسے معاف کر دیا (یہ واقعہ تفصیل سے گزر چکا

ہے) اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود ہی مسلمان نہیں ہوا بلکہ اس کا قبیلہ بھی مسلمان ہو گیا۔

اشاعت اسلام کا یہ کام اس وقت ہوا جب تلوار نے اپنا کام چھوڑ دیا تھا۔

(۲) صلح حدیبیہ کے وقت ابتدائی سفارتی بات چیت کے دوران چند نوجوانان قریش ۲۰۰

کی جمعیت اکٹھی کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ جنہوں نے مسلمانوں سے

شکست کھائی اور وہ گرفتار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے خیر گالی کے طور پر ان سب کو چھوڑ

دیا۔ صلح حدیبیہ میں بھی تو این آمیز شرائط قبول کر کے لڑائی پر صلح کو ترجیح دی جس کا اثر یہ

ہوا کہ بے شمار قبائل از خود مسلمان ہو گئے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

(۳) فتح مکہ کے دوران آپ ﷺ نے اپنے ازلی دشمنوں پر پوری طرح قابو پالینے کے بعد

عام معافی کا اعلان کیا۔ تو اس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام اتنی تیزی سے پھیلا کہ اس سے پہلے

اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ اور ایسے کئی دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سختی، جبر یا تلوار وہ کام کبھی نہیں کر سکتی جو نرمی اور غنودہ ریزر سے از خود سرانجام پا جاتا ہے۔

قول فیصل

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں۔ جو اسلام کی اشاعت کا باعث بنیں۔ لیکن بایں ہمہ حقیقت یہی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کو بھی ایک گونہ ضرورت تعلق ہے۔ گو یہ دسواں حصہ ہی کیوں نہ ہو۔ معاندین اسلام جو اس بات پر سارا زور صرف کر دیتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، وہ بھی ایک انتہا تک پہنچ گئے ہیں۔ دوسرا گروہ اس الزام کی مدافعت میں سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے۔ کہ اسلام کی اشاعت محض اس کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر ہوئی۔ ہمارے خیال میں اسلام کے حامیوں کا یہ گروہ بھی دوسری انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ مانا کہ اسلام میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن ان خوبیوں کو آشکار کرنے اور ”حق“ کو بروئے کار لانے کے لیے بھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قوت اسلام کو تلوار کے ذریعہ مہیا ہوئی اگر اشاعت اسلام میں تلوار کا کچھ بھی حصہ نہ تھا تو جہاد کی ترغیب کیوں دی گئی۔

اشاعت اسلام میں تلوار کا حصہ:

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ (۱) امر بالمعروف (۲) نہی عن المنکر۔ امر بالمعروف کو ماننا یا انکار کر دینا مخاطب کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے کو عقیدہ تو حید یا آخرت یا اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اور وہ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو اس پر جبر کیا جا سکتا ہے۔ نہ تلوار سے ڈرایا دھمکایا جا سکتا ہے۔ اور جہاں تک نہی عن المنکر کا تعلق ہے۔ تو یہ فریضہ تلوار کے سوا پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام محض عقائد و نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید قانون ہے۔ جو مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا اور اس قانون کے نفاذ کے لیے قوت چاہتا ہے۔ اگر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہو۔ زنا، چوری، ڈاکہ، قتل و غارت کی وارداتیں ہو رہی ہوں۔ لوگوں کا امن و چین غارت ہو رہا ہو۔ تو اسلام حرکت میں آئے گا اور تلوار ہاتھ میں لے کر اس کی اصلاح کرے گا خواہ یہ علاقہ مشرکین کا ہو یا اہل کتاب کا اور خواہ اس میں مسلمان ہی رہتے ہوں۔

حضور ﷺ کی کئی زندگی میں چونکہ اسلام کے پاس قوت نہیں تھی۔ لہذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں طرح کے کام زبانی تبلیغ سے سرانجام دیئے جاتے رہے۔ قرآن جیسا معجزانہ کلام، حضور اکرم ﷺ کا سا بلند کردار، آپ ﷺ کے جان نثاروں کی قربانیاں خود حضور اکرم ﷺ کا اپنی جان تک تبلیغ میں کھپا دینا۔ اور بہترین طریق تبلیغ، ان سب طرح کی کوششوں کے باوجود یہ تو نہ ہو۔ گا کہ قریش مکہ ایمان لے آتے۔ بے شک وہ اسلام کی حقانیت کے دل سے معترف ہو چکے تھے۔ لیکن اسلام ضابطہ اور کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا تھا جو انہیں گوارا نہ تھیں۔ انہیں اپنے بعض مفادات سے بھی دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ جس کے لیے وہ قطعاً تیار نہ تھے۔ جو مزے انہیں اپنی خود پسند اور بے ضابطہ زندگی میں حاصل ہو رہے تھے۔ اسلام لانے کی صورت میں ان میں سے اکثر سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔

تلوار کا کام فقط یہ ہوتا ہے کہ وہ بگڑی ہوئی طبیعتوں کو راہ راست پر لے آتی ہے۔ وہ ہدایت کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے۔ پھر جو طبائع نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ ان کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور جب تک معصیت اور ظلمت کے یہ پردے چاک نہ ہوں۔ تبلیغ خواہ کتنی ہی دل نشیں انداز میں ہو غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر تلوار کا اشاعت اسلام میں کچھ حصہ نہ ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔

تلوار کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ تبلیغ کے بیج کے لیے زمین کو نرم کر دیتی ہے۔ اسلام کی تلوار نے حق کی دشمن اور باطل قوتوں کا قلع قمع کر کے اسلام کے بیج کے لیے زمین کو ہموار اور نرم بنا دیا۔ اسلام کے بیج میں اتنی اہلیت اور قوت ہے کہ اگر اسے فضا سازگار میسر آ جائے تو پھیل پھول کر تناور اور سد بہار درخت بن سکتا ہے۔

(۲) جہاد فی سبیل اللہ اور عام جنگوں میں فرق

مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ عام دنیا کی جنگوں اور جہاد میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کا مقصد کشور کشائی اور اپنی ہمسایہ قوموں کو مشغول بنا کر ان سے مالی مفاد حاصل کرنا ہے۔ اس دلیل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ سونا اور پیتل ایک ہی چیز ہے۔ کیونکہ دونوں چیزیں دھات سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا رنگ بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام میں کشور کشائی مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات نظام عدل کا قیام ہے۔ یہ رھام عدل بعض دفعہ کشور کشائی کے بغیر بھی میسر آجاتا ہے۔ اور کشور کشائی کے بعد بھی یہ قائم نہ ہو۔ تو اسلامی نکتہ نظر سے ایسی فتح کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے۔ جہاد اور عام جنگیں، اپنے مزاج، مقاصد، طریق کار، انجام کار اور نتائج غرض ہر بات میں ایک دوسرے مختلف اور مبائن ہیں جس کی وضاحت اس کتاب میں جا بجا مناسب مقامات پر پیش کی جا چکی ہے۔ ذیل میں ہم انہیں یک جا طور پر پیش کرتے ہیں۔

(۱) مقاصد کا فرق:

دنیا میں ہمیشہ یہی چلا آیا ہے کہ بھائی بھائیوں کی مدد میں لڑے ہیں۔ قبیلے قبیلوں کی حمایت، خاندان خاندانوں کی حفاظت کیلئے حتی کہ اہل ملک، ملک کی حمایت و حفاظت میں جانیں دیتے رہے ہیں۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی قوم یا ملک کے ذاتی مفادات یا سیاسی مفادات کو دنیا میں پیدا شدہ کسی بھی واقعہ سے آج آنے لگی۔ تو وہ لڑائی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کو یا اپنے ملک کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے مفادات کو آج نہ بھی آئے تو بھی وہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم دوسروں کو مفتوح بنا کر سر بلند ہو اور دنیا میں اپنا نام پیدا کرے۔ دنیا میں جب بھی اور جہاں بھی کوئی جنگ ہوئی، انہیں میں سے کسی ایک مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ لیکن اسلام ان تینوں مقاصد میں سے کسی کو بھی درست تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جنگ کا مقصد صرف یہ قرار دیتا ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو اور اللہ کا بول بالا ہو۔ فتنہ و فساد کا خاتمہ اگر جنگ کے بغیر ہو سکتا ہے تو جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں سرے سے کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ جنگ نہیں ہوئی تو پھر فتح کیسی اور فتح مبین کیسی؟ یہ صلح اس لحاظ سے فتح مبین قرار دی گئی کہ فتنہ و فساد کو ختم اور نیست و نابود کرنے کے لحاظ سے جتنے شاندار نتائج اس صلح سے ہوئے۔ اگر جنگ برپا ہو جاتی اور اس میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو جاتی تو اس کے ایسے شاندار نتائج متوقع نہ تھے۔

پھر جس طرح بدن کے کسی پھوڑے کے زہر سے باقی بدن کو بچانے کے لیے اس کا اپریشن ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے فتنہ پرداز عناصر کے زہر سے باقی معاشرہ کو بچانے کے لیے اور اس فساد گر وہ کا قلع قمع کرنے کے لیے جنگ کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کی چیر پھاڑ کی وجہ سے اسے کوئی ظالم یا درندہ صفت نہیں کہتا کیونکہ اس کا مقصد بگاڑ کی بجائے اصلاح ہوتی ہے۔ اس طرح اسلام صرف فتنہ و فساد کے خاتمہ کے لیے جنگ کو جائز بلکہ ضروری قرار دیتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی بہبود کیلئے برپا کی جاتی ہے۔ پھر جس طرح ڈاکٹر فی نفسہ مریض کا ہمدرد خیر خواہ اور اس کے لئے رحم کے جذبات رکھتا ہے بعینہ اسلام فی نفسہ ایک صلح پسند دین ہے۔ جنگ سے وہ حتی الامکان گریز کرتا ہے مگر جہاں اس کے بغیر چارہ نہ رہا ہو صرف اسی وقت اسے ضروری سمجھتا ہے۔

(۲) طریق کار میں فرق:

دنیا کی عام جنگوں میں جنگ جیتنے کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اندھا دھند کشت و خون، شہنوں، بے دریغ بمباری، دشمن کی املاک کی بربادی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عہد شکنی کرنا اور خفیہ معاہدات یہ سب کچھ مقصد کے حصول کے لیے جائز سمجھے جاتے ہیں۔ اگر افواج سے اخلاق یا کسی ضابطہ جنگ کی پابندی کا ذکر کیا جائے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بھلا جنگ کا ضابطہ اخلاق سے کیا تعلق؟ ضابطہ اخلاق سے کوئی بات طے نہ ہونے سے ہی تو جنگ برپا ہوتی ہے۔ پھر جنگ کے دوران اس ضابطہ اخلاق کے کیا معنی؟ لیکن اسلام مجاہدین کو جنگ لڑنے کا مکمل ضابطہ پیش کرتا ہے۔ اور اس پر کاربند رہنے کی سختی سے ہدایت کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے ایسی جنگ جس میں اس کے مقررہ ضابطہ کی پابندی نہ کی گئی ہو، جہاد فی سبیل اللہ نہیں کہلا سکتی۔ پھر اس ضابطہ اخلاق کا بھی اصل الاصول یہ ہے کہ دشمن کا جانی یا مالی نقصان صرف اس حد تک جائز اور درست جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اور یہ نقصان بھی ان حدود و قیود کے تحت ہو۔ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

انجام کار جنگ کا فرق:

فتح کے بعد بالعموم فاتح اقوام دشمن کے شہر کو نذر آتش کر دیتی ہیں۔ قتل عام کا بازار گرم کرتی ہیں۔ اور جوش انتقام میں ہر طرح سے وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لیکن اسلام ایسی تمام حرکات کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اگر اصل مقصد فتنہ و فساد کا خاتمہ تھا۔ جو فتح کے ذریعہ حاصل ہو گیا۔ اب اس کے بعد ایسی حرکات کا کوئی جواز نہیں۔ جنگ کے بعد ایسا فتنہ و فساد اسلامی

مقصد جنگ کے اصل مقصد کے عین متضاد ہے۔

فتنہ و فساد کا خاتمہ ہی تو جنگ کا اصل مقصد ہے۔ اگر جنگ کے بعد بھی یہ فتنہ کھڑا ہو جائے تو جنگ کرنا ہی بے مقصد اور عبث فعل بن جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عام دنیا کی جنگیں فتنہ و فساد اور ظلم کے وجود کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے نتیجے میں فتنہ و فساد ہی لاتی ہیں۔ جبکہ اسلام میں جنگ ایسی جنگوں کو ختم کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے۔ انتقامی کارروائیوں سے اس لیے روکا گیا ہے کہ وہ آئندہ کسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

نتائج میں فرق:

جنگ و جدال کے نتیجے میں انسان اپنے دشمن بدخواہ اور حاسد کو پیدا کر لیتا ہے۔ دوست اور جاں نثار ساتھی پیدا نہیں کر سکتا۔ تلوار کا زخم نفرت اور عداوت ہی پیدا کرتا ہے محبت اور ہمدردی عطا نہیں کر سکتا۔ لہذا مفتوح قوم کو جس وقت بھی اپنے پاؤں پر سنبھلنے کا موقع ملتا ہے تو وہ فاتح قوم سے انتقام لینے کی تیاریاں شروع کر دیتی ہے۔ اور اس طرح دنیا میں فتنہ و فساد کا ایک لانتنا ہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔

لیکن اسلامی جنگوں کے نتائج اس سے برعکس نکلتے ہیں۔ یہاں دشمن کے بجائے دوست اور ہمدرد پیدا ہوتے ہیں نفرت کی بجائے عقیدت اور محبت بڑھتی ہے۔ طائف کا محاصرہ اٹھانے کے بعد وہ لوگ انتقام کے موقع کی تلاش نہیں کرتے بلکہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی بظاہر تو بن آمیز شرائط کے باوجود اور قدرت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی صلح جو یانہ پالیسی خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے عظیم جرنیلوں کے ذہنوں کے رخ موڑ دیتی ہے۔ اور وہ اسلام کے سچے خدمت گزار بن جاتے ہیں۔ سہیل بن عمرو جو قریش مکہ کے نمائندہ اور صلح حدیبیہ کے ایک فریق تھے، اسی واقعہ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے اور خطیب اسلام کہلاتے ہیں۔ فتح مکہ میں فتح کے بعد صرف اہل مکہ ہی اس ”اخلاقی ضرب“ سے اسلام کے ہمنوا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ تمام قبائل عرب اسلام قبول کر کے اس کی قوت میں اضافہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ بتائیے کہ دنیوی جنگ نے بھی کبھی ایسے نتائج پیدا کیے ہیں؟

دور نبوی ﷺ کی تمام جنگوں میں سے صرف غزوہ خیبر اور غزوہ مکہ پر کشور کشائی کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ باقی جنگیں یا دفاعی مقاصد کے لیے لڑی گئیں یا سرحدوں کی حفاظت کے

لیے۔

اسلام کو کشور کشائی سے جس قدر رغبت ہے۔ یہ تفصیل بھی باب ۶ زیر عنوان کشور کشائی کے تحت گزر چکی ہے۔ اسی طرح اس اعتراض کی بھی وضاحت پیش کی جا چکی ہے کہ کیا مسلمانوں نے بھی عام دنیا کی طرح مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے کشور کشائی کی تھی۔ مفتوحہ علاقوں سے مالی منفعت کے حصول کا مسئلہ یوں سمجھئے۔ کہ ایک دنیا دار بھی دنیا کماتا ہے۔ جس میں وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے جس سے وہ دنیا کا مال حاصل کر سکے اور ایک دیندار تمام شرعی پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر دنیا کماتا ہے۔ دنیا کا مال پہلے شخص کو بھی مل جاتا ہے۔ جو اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو بھی جو اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اس مقام پر حصول مال میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسرے شخص کا کمایا ہوا مال بھی دنیا داری نہیں بلکہ عین دین سمجھا جائے گا۔ بالکل یہی صورت حال عام دنیوی مقاصد کے تحت لڑی جانے والی جنگوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے بعد تحصیل مال کی ہے۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے۔ اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

(۳) اسلام اور جنگ جوئی

اسلام پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے جہاد کو فرض قرار دے کر ایک مستقل جنگ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لہذا اسے ایک امن پسند مذہب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عرب قبائل ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رہتے تھے۔ اسلام نے آکر صرف یہ تبدیلی پیدا کی کہ ان جنگ جو قبائل کو کارخ اندرونی خلفشار باہمی جنگوں سے ہٹا کر بیرونی دنیا کی طرف موڑ دیا۔ لیکن ان کی جنگجوئی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ جیسے وہ اسلام لانے سے پیشتر برسر پیکار رہتے تھے ویسے اسلام لانے کے بعد رہے۔

انہیں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ:-

﴿وَأَقْتُلُواْ هُمۡ حَيْثُ نَفَقْتُمُوْهُمۡ﴾ (۱۹۱:۲) (ان (کفار و مشرکین) کو جہاں پاؤ قتل کرو)

علاوہ ازیں اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا داعی ہے۔ قرآن میں ہے:-

﴿وَقَاتِلُوْهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوْنُ فِتْنَةٌ وَّ

نہ ہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔)

﴿يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (۱۹۳:۲)

لہذا اسلام نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک دارالاسلام جہاں اسلامی حکومت قائم ہو۔ اور دوسرے دارالحرب۔ جہاں غیر مسلم حکومت ہو۔ آسان الفاظ میں یوں کہیے کہ ایک حصہ عالم اسلام ہے۔ اور دوسرا عالم جنگ۔ دارالاسلام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دارالحرب یا غیر مسلموں سے برسر پیکار رہ کر انہیں دارالاسلام میں شامل کرتا چلا جائے۔ یہ ہے ان عقلی اور نقلی دلائل کا خلاصہ جن سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام کوئی امن پسند یا صلح جو مذہب نہیں بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ہر وقت برسر پیکار رہنا چاہتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس اعتراض کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے متدرجہ ذیل دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:-

(۱) مشرکین اور اہل کتاب کا فرق:

جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ اہل کتاب کے سامنے تین شرطیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلی یہ کہ وہ اسلام لائیں۔ اگر یہ نامنظور ہو تو وہ

(۲) اطاعت گزار بن کر دارالاسلام میں رہیں اور جزیہ یا اس کی متبادل کوئی صورت قبول کریں۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر

(۳) جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

لیکن مشرکین کے لیے اطاعت گزار بن کر رہنے کی بھی کم از کم حجاز میں گنجائش نہیں۔ ان پر تین ہی شرائط پیش کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ توبہ کے آغاز میں مذکور ہے یعنی (۱) اسلام قبول کر لیں اگر یہ منظور نہ ہو تو (۲) دارالاسلام چھوڑ کر چلے جائیں اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر (۳) جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ گویا ان کے لیے شرط نمبر ۲ اطاعت گزار بن کر رہنے کی بجائے حجاز چھوڑ کر چلے جانے کی ہے۔

مشرک کی عام تعریف یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ کسی کتاب کا قائل نہ ہو۔ اور خدا کے متعلق واضح عقیدہ نہ رکھتا ہو۔ اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اسلام کی نظر میں تمام غیر مسلم ایک سطح پر نہیں۔ وہ اہل کتاب سے نسبتاً نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن مشرکین

کے معاملہ میں سخت ہے۔ مندرجہ بالا دونوں آیات (جو کہ ایک ہی طویل آیت کے ٹکڑے ہیں) مشرکین سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس سختی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے۔ جو فتنہ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کی نظر میں چونکہ سب سے بڑا فتنہ شرک ہے لہذا شرک کو ختم کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ گویا شرک کی موجودگی ہی جنگ کے لیے آئینی دستاویز ہوتی ہے۔

(۲) اقامت پذیریری:

بلحاظ ٹوٹن دارالاسلام کی تین اقسام ہیں:-

(۱) حرمین یعنی حرم مکہ اور حرم مدینہ۔ ان مقامات میں صرف مسلمان ہی رہ سکتے۔ اہل کتاب یا مشرک یہاں اقامت اختیار نہیں کر سکتے۔

(۲) جزیرہ العرب یا حجاز۔ اس میں اہل کتاب معاہدہ کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ جب تک کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہیں۔ ہاں اگر بناوٹ یا جنگ کریں تو انہیں دارالاسلام کے کسی دوسرے مقام میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مشرکین کو اس خطہ میں برداشت نہیں کیا گیا۔

(۳) باقی دارالاسلام میں اہل کتاب تو اطاعت گزار بن کر پوری آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ لیکن مشرکین کو گوارا ہونے کی حد تک برداشت کیا گیا ہے کہ وہ جزیرہ دے کر اس علاقہ میں رہ سکتے ہیں۔ (اسلام کا قانون جنگ، ص ۱۵۸)

مشرکین پر سختی کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ ہر وقت اسلام پر کسی آفت کے پڑنے اور اندریں صورت بد عہدی کے منتظر رہتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خود سورہ توبہ میں اعلان کر کے ان کو چار ماہ سوچنے کی اجازت دی اور ان سے طے شدہ معاہدات کو کالعدم قرار دے دیا۔ اگر یہ اقدام نہ کیا جاتا تو حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اٹھنے والا ارتداد کا فتنہ شاید دس گنا زیادہ طاقت سے ابھرتا۔ اور اسلام کی تاریخ بھی کوئی اور ہی رنگ اختیار کرتی۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم اصل اعتراض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس کا پہلا حصہ ہے کہ اسلام میں جو جنگ جو قبائلی داخل ہوئے تھے۔ اسلام نے صرف ان کا رخ بیرونی دنیا کی طرف پھیر دیا تھا۔ لہذا ان کی جنگجو فطرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ اعتراض کئی وجوہ سے غلط

ہے۔

سابقین الاولین کی امن پسندی:

پہلی وجہ یہ ہے کہ پیشکِ عرب کے اکثر قبائل فطرتاً جنگجو واقع ہوئے تھے۔ لیکن ان کے سب افراد جنگجو نہیں تھے۔ بلکہ ان میں کثیر طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو اس قتل و غارت کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ وہ کمزور تھے، نہتے تھے۔ معاشرہ میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ فطرتاً بھی قتل و غارت اور ظلم و فساد سے نفرت کرتے تھے۔ پھر اثر میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا۔ جو صلح و امن پسند تھا اور قتل و غارت اور ظلم و جبر سے نفرت کرتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے حلف الفضول کے واقعہ میں اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔ ایسے ہی لوگ ابتداءً اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ چونکہ قتل و غارت اور ظلم و فساد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے ختم کرنے کی صورت صرف یہی تھی کہ ایسے شریکوں کا جنگ کے ذریعہ قلع قمع کیا جائے لہذا جب کمزور مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت ملی تو بہت سے لوگوں کو یہ بات ناگوار تھی۔ ارشاد باری ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ﴾ (تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں لگم۔) (۲۱۶:۲) ناگوار ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِذَا قُلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (مومنو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔) (۳۸:۹)

اور دوسری نبوی کی سب سے پہلی جنگ بدر مسلمانوں کی ”جنگِ جوئی“ کی کیفیت اس

انداز میں بیان کی گئی ہے۔

﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ ۖ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَمَا نَسَأَ يَأْتِي الْقَوْمَ إِلَى الْمَوْتِ﴾ (جیسا تمہارے پروردگار نے تمہیں تدبیر کے ساتھ تمہارے گھر سے نکالا اور اس وقت مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ وہ لوگ حق بات میں اس کے ظاہر ہونے کے

﴿وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾ (۶۵:۸) بعد تم سے جھگڑنے لگے گویا موت کی طرف دھکیلے جانے لگے ہیں۔ اور وہ موت کو سامنے دیکھ رہے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ:-

((يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ)) (۶۵:۸) (اے نبی ﷺ! مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو۔)

ان تمام آیات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کم از کم جنگ بدر تک کے اکثر مسلمان جنگ سے نفرت کرتے تھے۔ اور اسے ناگوار سمجھتے تھے۔ یہی لوگ اسلام کا ابتدائی اور قیمتی سرمایہ تھے۔ اگر یہ لوگ فطرتاً جنگ جو ہوتے تو ان احکامات و ارشادات کی کیا ضرورت تھی؟ اصل بات یہی ہے۔ اسلام کے یہ ابتدائی جاں نثار صلح جو اور امن پسند تھے۔ ظلم و فساد کے خاتمہ کے لیے جب ان پر جنگ جیسا ”ناگوار فریضہ“ عائد کر دیا گیا تو انہوں نے اسے طوعاً و کرہاً سرانجام دیا۔

جارحانہ اقدامات؟

اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ جنگ جو لوگ ہمیشہ وہی کہلائے جاسکتے ہیں۔ جو جارحانہ اقدامات کریں۔ اس معیار پر غور کرنے کے لیے ہمیں دور نبویؐ کی جنگوں کے اسباب پر سرسری نظر ڈالنا ہوگی۔

- (۱) غزوہ بدر، احد اور احزاب خالص مدافعتانہ جنگیں تھیں۔
- (۲) غزوہ خیبر اور غزوہ مکہ دشمن کی طرف سے عہد شکنی کی وجہ سے پیش آئیں۔
- (۳) سریہ موتہ اور غزوہ تبوک، سفیر کے قتل اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے پیش آئیں۔
- (۴) غزوہ حنین (اوطاس اور طائف) میں دشمن نے خود لاکھاڑا تھا۔ اور مسلمانوں کو جس بے سرو سامانی کی حالت میں یہ جنگ لڑنا پڑی اس کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمائیے:-

فتح مکہ کے فوراً بعد ہوازن اور ثقیف کے جنگجو اور تیر انداز قبائل نے مقابلہ کی ٹھانی اور ایک بڑے لشکر کو حنین کے مقام پر لاؤالا۔ عورتیں اور بچے بھی ہمراہ لے آئے کہ کسی کو بھاگنے کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کو مجبوراً جن حالات میں یہ جنگ لڑنا پڑی وہ یہ ہیں کہ آپؐ نے عبد اللہ بن ربیعہ سے۔۔۔۔ جو ابو جہل کے ماں جائے بھائی تھے۔۔۔۔ تین ہزار درہم قرض لیے

(مسند احمد ج ۳ ص ۳۶) اور صفوان بن اسید جو کہ ان کا رئیس اعظم تھا اور ابھی تک اسلام نہیں لایا تھا۔ اس سے اسلحہ جنگ مستعار لیا۔ اس نے سوزر ہیں اور اس کے لوازمات پیش کیے۔

(موطا۔ ابوداؤد۔ باب الضمانہ)

(۵) یہود سے جو غزوات ہوئے۔ مثلاً غزوہ بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قریظہ سب یہودیوں کی

عہد شکنی اور کھلی بغاوت کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔

غور فرمائیجئے کہ ان میں کون سی جنگ کو جارحانہ جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب:

دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحیں فی الواقع فقہائے اسلام نے وضع کی ہیں۔ لیکن انہیں عالم اسلام اور عالم جنگ کے معنوں میں پیش کرنے میں کئی مغالطے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:-

(۱) اسلام غیر مسلموں کے سارے علاقے کو ”عالم جنگ“ قرار نہیں دیتا۔ ہم چوتھے باب میں واضح کر آئے ہیں کہ غیر جانبدار ممالک سے جنگ کی اجازت نہیں۔ یعنی ایک ایسی مسلم حکومت جو امن و امان سے رہتی اور رہنا پسند کرتی ہے۔ اس سے لڑائی کا کوئی جواز نہیں۔ خواہ وہ حکومت اہل کتاب کی ہو یا مشرکین کی۔ ارشاد باری ہے:-

﴿لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقْسَا تِلُوْكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتُقْسَطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسَطِيْنَ﴾
 (اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا۔ جو تم سے دین کے سلسلہ میں نہیں لڑتے۔ اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔)

(۸:۶۰)

اس آیت میں غیر جانبدار ممالک سے لڑائی سے منع ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہتر سلوک کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

گویا ”دارالحرب“ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک غیر جانبدار علاقہ جو فی الحقیقت دارالحرب نہیں ہے۔ دوسرے حربی علاقہ جہاں جنگ کا امکان ہے۔

(۲) حربی علاقہ میں ایسے ممالک بھی ہو سکتے ہیں جن سے صلح و تجارت وغیرہ کے معاہدات

طے پائے ہوں۔ اور ان کی مدت صلح عموماً دس سال ہوتی ہے۔ جب تک ایسے ممالک بغاوت یا بدعہدی نہ کریں ان سے جنگ کا کوئی امکان نہیں۔ نہ ہی اس کی اجازت ہے۔

(۳) اس کے بعد جو ممالک بچ جائیں وہ فی الواقع ”دارالحرب“ ہیں لیکن اس پر بھی ”حالات جنگ“ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ حالات جنگ اور چیز ہے اور خطرہ جنگ اور چیز اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے آج کل روس اشتراکیت کا علمبردار ہے اور امریکہ جمہوریت اور سرمایہ کاری کا۔ یہ دونوں قسم کے نظریات چونکہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہذا ان دونوں ملکوں میں جنگ کا خطرہ ہر وقت موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عین ممکن ہے۔ کہ ان دونوں ممالک میں ایک طویل مدت تک حالات جنگ پیدا نہ ہوں۔

یہی صورت حال پاکستان اور بھارت کی ہے۔ پاکستان دو قومی نظریہ کا علمبردار ہے اور بھارت ایک قومی نظریہ کا حامی ہے نظریات کے اس تضاد نے ہر وقت جنگ کا خطرہ پیدا کر دیا ہے لیکن حالات جنگ مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں حالات جنگ صرف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی ملک اپنے حقوق سے تجاوز کرنا چاہتا ہے۔ جو حریف ملک کے لیے ناگوار ہوتے ہیں۔ مثلاً روس اپنا حق سمجھتا ہے کہ گرم پانی تک اس کی رسائی ہو۔ لہذا افغانستان پاکستان اور ایران وغیرہ پر اس کا تسلط قائم ہونا چاہیے۔ لیکن حریف ممالک روس کے اس ”حق“ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ روس نے افغانستان میں اپنا یہ حق استعمال کرنا شروع کر دیا تو جنگ چھڑ گئی۔ اور پاکستان اور ایران کے لیے حالات جنگ پیدا ہو گئے۔

مغربی اقوام کے نزدیک طاقت ہی سب سے بڑا حق ہے۔ ان کے نزدیک جنگ کے آغاز کے لیے جو مقدس حقوق جائز سمجھے گئے ہیں۔ ان کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ انہی حقوق میں سے کسی ایک حق کا استعمال کر کے وہ حالات جنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اسلام اس طرح کے حقوق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس وقت تک حالات جنگ پیدا نہیں ہو سکتے جب تک ان صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ جن کی تفصیل باب چہارم میں پیش کی جا چکی ہے۔ اسلام میں لڑائی کے جواز کا عام قانون ظلم اور فتنہ استحصال ہے۔ کوئی ملک اسلامی

ریاست پر چڑھ کر آجائے اور سرحدوں پر یورش کرے یا سفارتی آداب کی خلاف ورزی کرے۔ یا مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکے تو یہ سب ظلم اور فتنہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی ملک اشاعت اسلام میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے یا صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ان پر مظالم ڈھاتا ہے تو اس طرح حالات جنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی۔ کہ اسلام صرف مدافعتیہ جنگ ہی کا قائل نہیں۔ بلکہ وہ ظلم و جور کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے خواہ یہ ملک کے اندر ہو یا باہر۔ اب اسے کوئی مصلحانہ جنگ کہہ لے یا جارحانہ جنگ۔ اسلام نے بہر حال جنگ کرنے اور اس سے رک جانے کے اصول متعین کر دیئے ہیں اور مسلمانوں کو انہیں اصولوں پر کاربند رہنا لازم ہے۔

(۴) پیغمبر اسلام ﷺ پر اعتراضات کا جائزہ

اسلام پر چند بڑے بڑے اعتراضات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم چند مزید اعتراضات کا جائزہ لیں گے جو پیغمبر اسلام پر کیے گئے ہیں:-

(۱) لوٹ مار کا سبق:

سب سے پہلے اور اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کرتے اور انہیں لوٹنے کے لیے دستے روانہ کرتے رہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ خود مسلمانوں کو لوٹ مار کا سبق دیتے رہے۔

اس اعتراض کا جواب ہم مناسب مقام پر پیش کر چکے ہیں۔ تاہم قارئین کی سہولت کے لیے دوبارہ چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں:-

(۱) اگر آپ ﷺ کا مقصد محض لوٹ مار سکھانا تھا۔ تو قریش کے قافلہ ہی کی ناکہ بندی کیوں کی گئی۔ تجارتی قافلے تو یمن سے بھی جاتے تھے اور نجد سے بھی پھر عراق اور شام کی طرف بھی آتے تھے۔ مدینہ سے بھی یہودیوں کے تجارتی قافلے جاتے تھے۔ اگر محض لوٹ مار کا مقصد ہوتا تو دوسرے قافلوں سے کیوں کبھی تعرض نہ کیا گیا۔

(۲) آپ نے کوئی ایسا دستہ روانہ نہیں کیا۔ جنہیں لوٹ مار کا حکم دیا گیا ہو۔ یا مسلمانوں نے کبھی قریش کے کسی تجارتی قافلہ کو لوٹا ہو۔ لے دے کر یہ سر یہ نخلہ کا ایک واقعہ ایسا ملتا

ہے۔ جسے بھیجا تو تفتیش احوال کے لیے گیا تھا مگر اس دستہ کے امیر عبداللہ بن جحش ؓ کے سامنے ایک تجارتی قافلہ آگیا تو آپ نے از خود اس پر حملہ کر کے اسے لوٹا۔ پھر جب مال غنیمت حضور اکرم ؐ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو آپ ؐ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عبداللہ بن جحش ؓ کو سخت سزائیں بھی کی کہ اس نے وہ کام کیوں کیا جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ (اس کی تفصیل اپنے مقام پر گزر چکی ہے۔) دشمن کے اسباب ثروت کی ناکہ بندی کر کے اس پر کاری ضرب لگانا جنگی تدابیر میں سے ایک اہم تدبیر ہے۔ جسے ہر ملک اور ہر قوم استعمال کرتی ہے۔ اور کامیاب جرنیل کی ایک دانشمندی کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ کامیاب طریقہ سے ناکہ بندی کر کے دشمن کی اصل قوت (سرمایہ) پر کاری ضرب لگائے تو پھر اسلام اور بانی اسلام ہی کو مطعون کرنے کا کیا جواز ہے؟

(۳) عتبہ بن اسید ؓ نے فی الواقع مقام عیمیس پر ایک جتھہ بنا کر قریش کے تجارتی قافلوں کو لوٹا بھی تھا۔ لیکن یہ صورت حال صلح حدیبیہ کی شرط نمبر ۲ کے نتیجہ میں پیش آئی تھی۔ جس کی ذمہ داری سے آپ بری الذمہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش نے خود مدینہ جا کر حضور اکرم ؐ سے درخواست کی تھی کہ شرط نمبر ۲ کو منسوخ قرار دیا جائے چنانچہ بعد میں قریش کو اس ”مصیبت“ سے نجات مل گئی۔

(نووی شرح مسلم۔ کتاب الجہاد باب صلح حدیبیہ)

(۲) دوسرا اعتراض، خفیہ سازشیں:

رسول اللہ ؐ پر دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ آپ ؐ اپنے دشمنوں کو خفیہ سازشوں کے ذریعہ مکر و فریب سے کام لے کر ختم کر دیتے تھے حالانکہ وہ ”معاهد“ تھے۔ مثال کے طور پر کعب بن اشرف اور ابورافع کا نام پیش کیا جاتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب بھی زیر عنوان گوزیلا جنگ (باب نمبر ۲) میں دیا جا چکا ہے۔ مختصر اشارات دوبارہ درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) یہ لوگ معاهد ضرور تھے۔ لیکن بغاوت کے جرم نے ان کے معاہدہ کی حیثیت کو ختم کر دیا۔

بغادت کے علاوہ اور کئی طرح کے جرائم میں ملوث تھے۔ مسلمانوں کے دشمنوں کو برا بھانتہ کرنا۔ مسلمانوں کی تضحیک اور تمسخر اڑانا۔ بانی اسلام کو گالیاں دینا ان لوگوں کا شعار تھا۔ ان حرکات سے معاہدہ از خود ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے جرائم کے علاوہ اکیلا جرم بغادت ہی ایسا ہے جسے کوئی حکومت معاف نہیں کرتی۔

(۲) آپ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل، ابوسفیان، امیہ بن خلف وغیرہ تھے۔ جنہوں نے مدینہ میں بھی پانچ سال تک یلغار کی اور آپ ﷺ کو چین نہ لینے دیا۔ لیکن انہیں آپ ﷺ نے خفیہ طریقہ سے ٹھکانے لگانے کے متعلق کبھی نہ سوچا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ کھلے دشمن تھے۔ لیکن یہود کے مندرجہ بالا افراد زیر زمین سازشیں کرتے اور کھلے میدان میں آنے سے احتراز کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی شرارتوں سے نجات کا ذریعہ یہی ہوتا ہے۔ کہ انہیں جاننا زورس کے سپرد کر دیا جائے۔ جو جس طرح بھی بن پڑے ان کو ٹھکانے لگا دیں۔ ہر حکومت کے لیے ایسی کاروائی ناگزیر ہوتی ہے۔ اور اس میں ہر طرح کے فکر و تدبیر کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ ایسے گوریلا سپاہیوں اور اسی طرح جاسوسوں کے لیے عام قانون یہ ہے کہ اگر وہ گرفتار ہو جائیں تو انہیں ”اسیران جنگ“ کی سی مراعات حاصل نہیں ہوتیں۔ اور اگر مارے جائیں تو متعلقہ حکومت اس کی باز پرس نہیں کر سکتی۔

(۳) یہ لوگ معاہدہ ضرور تھے۔ مگر ان کے انفرادی جرائم کی سزا پوری قوم کو نہیں دی جاسکتی تھی۔ کہ ان سے کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جاتا۔ جبکہ ان کی قوم انہیں ایسی حرکات سے منع کرنے سے قاصر ہو۔ لہذا اس انفرادی اقدام کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

(۴) یہ الزام بھی سراسر غلط ہے کہ آپ ﷺ نے خود سازشیں تیار کر کے جاننا زورس کو مکرو فریب سکھا کر انہیں اس مہم پر آمادہ کیا تھا۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے محمد بن مسلم نے خود اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ ”اجازت دیں جو چاہوں کہہ لوں“۔ تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی۔

اس اجازت سے خفیہ سازشیں تیار کرنے یا مکرو فریب کے سکھانے کا پہلو کیسے نکل سکتا ہے؟ اس طرح ابورافع کو ٹھکانے لگانے کے لیے عبد اللہ بن عقیق رضی اللہ عنہ نے خود اپنی خدمات پیش کی

تھیں۔ ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو تدبیر بھی اختیار کی وہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے ان صحابہ نے اس مہم کو سر کرنے میں خدع فی الحرب سے کام ضرور لیا ہے۔ دغا سے کام نہیں لیا۔ خدع اور دغا کا فرق ہم جنگی نقشہ میں تبدیلی کے عنوان کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض، عہد شکنی:

یہ اعتراض براہ راست بانی اسلام پر نہیں البتہ خلفائے راشدین پر کیا جاتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود کو خیبر میں قیام پذیر رہنے کا معاہدہ کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے انہیں جلا وطن کر دیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کر کے انہیں وہیں رہنے کی اجازت دی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں وہاں سے جلا وطن کر دیا۔

جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے یہ درست ہے۔ معترضین کی ہوشیاری کا کمال یہ ہے کہ وہ یہودیوں کے خیبر سے اور عیسائیوں کے نجران سے اخراج کا واقعہ بیان کر کے اسے عہد شکنی کی مثالوں کے طور پر تو پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن جن وجوہ کی بنا پر انہیں جلا وطن کیا گیا انہیں بیان نہیں کرتے۔

اس اعتراض کی اصل وجہ اس کے بغیر کچھ نہیں کہ معترضین بھی یہودی اور عیسائی اقوام ہیں۔ اور جن لوگوں کو جلا وطن کیا گیا وہ بھی یہودی اور عیسائی اقوام ہیں۔ اور جن لوگوں کو جلا وطن کیا گیا وہ یہودی اور عیسائی تھے ورنہ ان کا جواب تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔

خیبر کی فتح کے بعد یہود سے اس شرط پر صلح پر ہوئی تھی کہ وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں گے اور ان کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ معاہدہ طے پا جانے کے بعد یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کر لیں۔ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں۔“ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست بھی قبول کر لی۔ اور نصف بٹائی پر اصل معاہدہ کے تحت یہ عارضی سمجھوتہ بھی طے پا گیا۔ جس میں واضح طور پر یہ الفاظ درج تھے۔

نقر کم ما اقر کم اللہ - (بخاری - کتاب جب تک اللہ تعالیٰ تم کو یہاں رکھے گا ہم بھی الشروط - باب اذا اشترط فی المزارعة) تم کو رہنے دیں گے۔

گویا یہود کو خیبر میں رہنے دینا مسلمانوں کا اختیاری معاملہ تھا۔ لہذا کسی وقت مسلمان بغیر کسی وجہ کے انہیں نکال دیتے تو تب بھی عہد شکنی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم چند ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کی بنا پر یہود کا اخراج ضروری ہو گیا تھا۔ مثلاً:-

(۱) اس واقعہ معاہدہ کے چند دن بعد یہود نے آپ کو زہر دینے کی سازش کی۔ یہ واقعہ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے) آپ ﷺ نے یہود کا یہ جرم معاف کر دیا۔ اور صرف کھانے میں زہر ملانے والی مجرمہ عورت کا قصاص کے طور پر قتل کیا گیا۔ (غزوہ خیبر)

(۲) اس کے بعد دوسری سازش یہ تھی کہ ایک مسلمان حضرت عبداللہ بن سہیل بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو خفیہ طریقہ سے قتل کر کے انہیں نہر میں ڈال دیا اور اس کا خون بہا خود رسول اللہ ﷺ نے بیت المال سے ادا کر دیا لیکن یہود کو کوئی سزا نہ دی گئی۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دور فاروقی میں اپنی مملوکہ زمین کو دیکھنے خیبر گئے۔ تو یہودیوں نے انہیں سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا۔ جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ (فتوح البلدان ص ۳۱، ابن ہشام ص ۷۸)

ایسی معاندانہ کاروائیوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ طلب کی جس میں بالاتفاق یہود کے اخراج کا فیصلہ طے پایا۔ اس کے باوجود انہیں خالی ہاتھ نہیں نکالا گیا بلکہ جو کچھ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ یہاں تک کے کچا و ابا نہدھنے کی رسیاں بھی حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں۔ (بخاری - کتاب الشروط)

اسی طرح نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا اس کے درج ذیل الفاظ قابل غور ہیں:-

لہم مافی هذه الصحیفة جوار اللہ ان کے لیے جو کچھ عہد نامہ میں ہے اس پر اللہ
وذمة النسبی ابدأ حتی یاتنی امر اللہ تعالیٰ کی پناہ اور محمد نبی ﷺ کی دائمی حفاظت
مانصحو او اصلحو ا فی ما علیہم - ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم آئے اور وہ خیر
(کتاب الخراج ص ۳۱ فتوح البلدان ص ۷۲) خواہ رہیں اور جو کچھ ان کے ذمہ واجب ہے
اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں۔

گویا اس عہد نامہ کی دو شرائط تھیں۔

(۱) وہ حکومت اسلام کے وفادار رہیں گے۔

(۲) وہ مقررہ جزیہ ٹھیک طور پر ادا کرتے رہیں گے۔

لیکن ان لوگوں نے اس صلح نامہ کی پہلی شرط کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ امن وامان کی برکات کی وجہ سے ان کے جان و مال میں بہت ترقی ہوئی ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اور انہوں نے گھوڑے اور اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ (کتاب الخراج ص ۴۲)

اب صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ ایک طرف اسلامی حکومت کے قلب کے بالکل نزدیک تھے۔ دوسری طرف حبشہ کی عیسائی حکومت سے ساز باز کرنا شروع کر دی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے بغاوت سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی اور ان کی تیاری کا ثبوت بہم پہنچ چکا تھا۔ ان خطرناک حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف یہ کیا کہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ یعنی نجران یمن سے نجران عراق میں منتقل کر دیا۔ ان کی زمینوں کے بدلے انہیں زمینیں دی گئیں۔ دو سال کا جزیہ بھی معاف کر دیا گیا اور سفر کی جملہ سہولتیں بھی بہم پہنچائی گئیں اور متعلقہ افسران کو یہ حکم دیا گیا کہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ (کتاب الخراج ص ۴۱)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ ان سے عہد شکنی کی ہی نہیں گئی۔ نہ ہی انہیں کوئی سزا دینا مقصود تھا۔ بلکہ اس نقل مکانی سے مقصد صرف اسلامی حکومت کی حربی اور سیاسی پوزیشن کی حفاظت تھی۔ اور یہ ایک ایسا اقدام ہے جو ہر حکومت اپنی مصلحتوں کو دیکھ کر اختیار کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ خواہ منتقل ہونے والے افراد "معاہد" ہوں یا اس کی اپنی ہی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

غیر مسلموں کا اعتراف حقیقت

((الفضل ما شهد به الاعداء -)) (بزرگی وہ ہے جس کا دشمن بھی اعتراف کرے۔)

جہاں بہت سے متعصب مستشرقین اور معاندین اسلام نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ناروا الزامات عائد کیے ہیں وہاں کچھ ایسے حقائق پرست غیر مسلم بھی ہیں جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ذیل میں ہم چند ایسے ہی حقیقت شناس لوگوں کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں:-

(۱) نامور مستشرق جان ڈیوڈ پورٹ اپنی کتاب ”قرآن اور محمد سے معذرت“ کے دیباچہ میں یوں رقمطراز ہیں:-

”اس کتاب کے لکھنے کا ناچیز لیکن مخلصانہ مقصد یہ ہے کہ محمد ﷺ کی سوانح حیات کو جھوٹی تہمتوں اور ناروا الزامات سے پاک کیا جائے۔ اور آپ ﷺ نے مخلوق عالم کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کیا ہے۔ اسے اچھی طرح آشکارا کیا جائے۔ بعض مصنفین نے تعصب کے جوش میں توحید پرستی کے محافظ کی نیک نامی کو جو دھبہ لگا ہے۔ اس قسم کی غلطی کر کے صرف یہی ظاہر نہیں کیا ہے کہ ان میں خود شرافت و انسانیت اور علم و تحقیق کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے بلکہ انہوں نے انصاف پسندی کے خلاف بھی کام کیا ہے۔“

”محمد ﷺ کی صداقت کی بین دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے وہ آپ ﷺ کے عزیز ترین دوست اور اعزہ تھے۔ جو آپ ﷺ کی عادات و خصائل سے بخوبی واقف تھے اور باوجود جستجو کے انہیں آپ ﷺ میں کوئی ایسی برائی یا خامی نظر نہیں آئی جو ایک بناوٹی اور دھوکہ باز شخص میں ہو سکتی ہے۔ رسول خدا کی زندگی میں اگر کہیں ذرا سا بھی الجھاؤ ہوتا تو جو لوگ آپ ﷺ سے اس قدر قریب تھے وہ ضرور آگاہ ہوتے۔ (سرور کوئین ص ۱۶۲-۱۶۵)

(۲) ہندوستان چرچ بمبئی کے پادری فادر ولیم اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

”دنیا داری کو سب نے بُرا کہا لیکن پیغمبر اسلام نے اس فرق کو ختم کر دیا اور بتایا کہ دنیا داری بھی دینداری ہے۔ بشرطیکہ احکام الہی کے مطابق ہو۔ جنگ عام طور پر بری سمجھی جاتی ہے مگر اسلام نے جنگ کے لیے اعلیٰ اصول پیش کیے۔ ”جنگ میں ہر کام جائز ہے“ کے اصولوں کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ اسلام کے نام لیوارات کے راہب اور دن کے شاہسوار ہو کر مرتے تھے۔“ (ایضاً ص ۱۶۷)

(۳) ایک اور مستشرق ولیم اورنگ، حضور اکرم ﷺ کی فاتحانہ شان کو دوسرے فاتحین سے یوں ممتاز کرتے ہیں:-

”فوجی فتوحات نے آپ ﷺ میں کبھی غرور پیدا نہیں کیا۔ جب آپ ﷺ انتہائی طاقت ور ہو چکے تھے۔ اس وقت بھی آپ ﷺ کے اخلاق عادات اور طرز زندگی میں وہی سادگی

تھی۔ جو آپ ﷺ کی مصیبت کے زمانے کی زندگی میں تھی۔ دنیوی زندگی کے لوازمات کا آپ ﷺ کے مبارک دل میں کبھی خیال بھی نہیں گزرا۔ آپ ﷺ کی کسی بھی جگہ آمد کے وقت اگر آپ ﷺ کے استقبال میں کوئی غیر معمولی شان پیدا کی جاتی تھی تو وہ آپ ﷺ کو ناگوار ہوتی تھی۔ اگر آپ ﷺ کسی عالمگیر حکومت کے خواہاں تھے تو وہ تھی زمین پر خدا کی حکومت اور خلاص کی حکومت۔ (۴) ایک ہندو مسٹر آر سی۔ اس نوع انسانی پر بانی اسلام کے احسانات کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:-

”شری رام چندر جی مہاراج‘ بھگوان کرشن‘ گورونانک جی‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سب روحانی بادشاہ ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان میں ایک روحانی شہنشاہ بھی ہے جس کا مقدس نام حضرت محمد ﷺ ہے۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ریفارمر نے آکر دنیا میں بہت کچھ کیا ہے۔ مگر حضرت محمد (ﷺ) نے دنیا پر اس قدر احسانات کیے ہیں۔ جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ اگرچہ ہر مذہب کے لوگوں نے آپ ﷺ کے متعلق اچھی رائے دی ہے۔ مگر چند ایک ہندوؤں کے نام کا اظہار کرتا ہوں جو حضرت محمد ﷺ صاحب کے مشن کی خوبیوں کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جیسے سروجنی نانیزد و لاچت رائے‘ مہاتما گاندھی‘ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور پنڈت موتی لال نہرو وغیرہ۔

(۵) کیا اسلام بذریعہ تلوار تھا؟ کے موضوع پر رسالہ ”ست اپڈیش“ کے ایڈیٹر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

”عام خیال یہ ہے کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے۔ مگر ہم اس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زبردستی کی وجہ سے جو چیز کسی ظالم کو دی جاتی ہے وہ جلد ہی ظالم سے واپس بھی لے لی جاتی ہے۔ اگر اسلام کی اشاعت جبر کے ساتھ کی گئی ہو تو آج اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی کر رہا ہے کیوں؟ یہ اس لیے کہ بانی اسلام کے اندر روحانی شکتی تھی۔ منس ماتر (بنی نوع انسان) کے لیے پریم تھا۔ آپ کے اندر محبت اور رحم کا ایک جذبہ کام کرتا تھا اور نیک خیالات کی طرف آپ رہنمائی کرتے تھے۔“ (ایضاً ص ۱۷۴)

(۶) اسی موضوع پر ایک اور ہندو مصنف پروفیسر رام دیوبی اے یوں رقمطراز ہیں:-

”شروع میں حضرت محمد ﷺ صاحب کے صرف تمیں معاون اور مددگار تھے۔ ان کی جاتی ”قریش“ ان کی مخالف تھی۔ آخر محمد ﷺ صاحب نے ان میں جادو کی بجلی بھری۔ وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بجلی راجوں، مہاراجوں میں نہیں بھری تھی بلکہ عام لوگوں میں بھری تھی۔ یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا ہے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے لیے کبھی تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ اگر کوئی مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج ہی کسی مذہب کو پھیلا کر دکھادے۔“ (ایضاً ص ۱۷۶)

(۷) اور اسی موضوع پر خود مہاتما گاندھی اشاعت اسلام کے اسباب کا یوں تجزیہ فرماتے ہیں:-

”سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے میرے اس عقیدے میں پختگی اور استحکام آ گیا کہ اسلام نے تلوار کے بل پر سوخ حاصل نہیں کیا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی انتہائی بے نفسی عقود و مواسیق کا انتہائی احترام اپنے رفقاء و تبعین کے ساتھ گہری وابستگی، جرات اور بے باکی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ اور اپنے مقصد و نصب العین کی حقانیت پر کامل اعتماد، اسلام کی کامیابی کے تحقیقی اسباب تھے۔ یہ خصائص ہر رکاوٹ اور ہر مشکل کو اپنی ہمہ گیر رو میں بہا کر لے گئے۔“ (ایضاً ص ۱۷۸)

(۸) ایک اور ہندو مصنف، بابو برج بہاری لال بی اے ایل بی ”اسلام اور خونریزی“ کے موضوع پر اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:-

”آنحضرت ﷺ کی شان میں ناواقفیت یا شرارت سے یہ کہنا کہ آپ ﷺ کی تعلیم قتل اور خونریزی کی تعلیم تھی بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے جس شخص کا دل ننھے ننھے بچوں کے رونے سے بے قرار و بے چین ہو جائے۔ جو ہزاروں گالیاں سن کر بھی اپنی نگاہ نیچی رکھے، جو فتح مکہ کے دن صبر و تحمل اور رحم و درو اداری کا وہ بے مثل مظاہرہ کرے جس کی نظیر فاتحین عالم کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔ یعنی اپنے بدترین دشمنوں کو بھی قابو میں لانے کے بعد معاف کر دے۔ جو ظلم و تعدی کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرے۔ سب کچھ غریبوں اور مفلسوں پر نچھاور کرے جو خود اپنے ہاتھوں سے غیر مسلموں کی خدمت گزاری کرے اور ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئے۔ غیر مسلموں کے وفد اور سفارتوں کا استقبال کرے اور اپنی مسجد میں ایک غیر مسلم کی پھیلائی ہوئی گندگی کو اپنے برگزیدہ ہاتھوں سے صاف کرنے میں بھی دریغ نہ کرے کیا اس کی شان میں ایسا کہا

جاسکتا ہے؟ (ایضاً ص ۷۷)

(۹) ایک مستشرق ڈاکٹر برنگھم کے نزدیک اشاعت اسلام کے اسباب درج ذیل ہیں:-
”مجھ کو کسی وقت بھی خیال نہ ہوا کہ اسلام کی ترقی تلوار کی مرہون منت ہے۔ نہیں بلکہ اسلام کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی سادہ و بے لوث زندگی ایفائے عہدِ اصحاب و پیروؤں کی غیر معمولی حمایت توکل خدا اور ذاتی جرأت و استقلال سے وابستہ ہے۔“ (ایضاً ص ۶۲)

(۱۰) ایک اور مستشرق پروفیسر باسور تھ اسمتھ اپنی کتاب ”محمد اینڈ محمدان ازم“ میں فساد فی الارض کے خاتمہ کے لیے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق اپنے خیالات کو یوں قلمبند کرتے ہیں:-
”وہ جس طرح ایک مذہب کے پیشوا تھے اسی طرح ایک حکومت کے سب سے بڑے مدبر تھے۔ وہ قیصر اور پوپ کا مجموعہ تھے۔ ان کے پاس باڈی گارڈ نہ تھے۔ کوئی محل نہ تھا۔ تاہم ان کے ہاتھ میں ساری قوت تھی..... بلاشبہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں اگر پوچھا جائے کہ افریقہ بلکہ کل دنیا کو مسیحی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے؟ تو جواب میں اسلام ہی کہنا پڑے گا۔ اگر محمد ﷺ کو قریش ہجرت سے پہلے (خدا نخواستہ) شہید کر ڈالتے۔ تو مشرق مغرب دونوں ناکارہ رہ جاتے۔ اگر آپ ﷺ نہ آتے تو دنیا کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس کو تباہ کر دیتا۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو یورپ کے تاریک زمانے دو چند بلکہ سہ چند تاریک تر ہو جاتے۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو انسان ریگستانوں میں پڑے بھٹکتے پھرتے۔ جب میں آپ ﷺ کی جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ ﷺ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ اور آپ ﷺ کے تابعدار غلاموں نے جن میں آپ ﷺ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، کیا کیا کارنامے دکھائے تو مجھے آپ ﷺ سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔“

(۱۱) اسلامی نقطہ نظر سے جنگ اور فتح کے نصب العین پر ایک انگریز مضمون نگار کیرٹن کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون روزنامہ جنگ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا:-

”پیردان اسلام نے صرف ایک صدی میں ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، مراکش، چین اور سندھ فتح کر لیا تھا۔ اگر نصب العین کی بلندی اور مقصد کی درخشندگی، کمال قیادت کا معیار بن سکتی ہے تو پھر محمد ﷺ کے مقابلہ میں کسی اور رہنما کو قطعاً پیش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ﷺ ایک

عظیم مفکر بلند پایہ خطیب اور بے نظیر مقنن تھے۔ آپ ﷺ نے شہروں اور قلعوں کے ساتھ ساتھ کروڑوں دلوں کو بھی فتح کیا اور تقریباً بیس ممالک میں اسلامی بادشاہت قائم کی۔ لاؤ ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو جن سے انسانی عظمت کو ناپا جاسکتا ہے۔ اور پھر اس سوال کا جواب دو کہ کیا محمد ﷺ سے کوئی بڑا انسان ہو سکتا ہے۔

(۱۲) ایک ہندو مصنف ”جناب بی ایس رندھاوا (ہوشیار پور) پیغمبر اسلام پر اعتراض کرنے والوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:-

”ہانیاں مذاہب میں سے سب سے زیادہ نا انصافی اور ظلم اگر کسی پر کیا گیا ہے تو بانی اسلام پر کیا گیا ہے اور متعصب مورخین نے کوشش کی کہ پیغمبر اسلام کو ایک خونخوار اور بے رحم انسان کی شکل میں پیش کیا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلائی جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ پر تنقید کرنے والوں نے اسلامی تاریخ اور بانی اسلام ﷺ کی سیرت کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کی بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد باتوں ہی کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اگر ایسے لوگ اسلامی روایات کو سمجھ لیتے اور سچائی کے اظہار کے لیے اپنے اندر کوئی جرأت و ہمت پاتے تو یقیناً اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوتے۔“ (ایضاً ص ۳۷)

(۱۳) رانا بھگوان داس رسول اللہ ﷺ کی بہترین سیاست کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں جن میں انہوں نے عظیم فاتحین کا مقابلہ بھی پیش کیا ہے۔

”بنی نوع انسان کے مسائل صلح و جنگ اور معاہدات امن کے علاوہ انسانی معاشرہ کی خوشحالی کا دار و مدار فاتح کے تدبیر پر ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں کہ فاتحین کی خون آشامی اور وحشت بربریت بالادستی و برتری نیز عسکری قوت کے اندوہناک مظاہروں سے مفتوحہ علاقوں پر تسلط تو حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن تسخیر قلوب مفتوحین کے اقدام معجز نما کے بغیر اصولوں کی کامرانی اور مقاصد کی جاودانی ممکن نہیں ہے۔ بلا شک فاتح کی شان امتیازی، سطوت سیاسی اور شوکت اقتدار کے جابرانہ دیدہ بے سفاکانہ طریقے لوٹ کھسوٹ اور خونریز فسادات سے حکمرانی کی جھوٹی عظمت کو برقرار تو رکھا جاسکتا ہے لیکن ظلم و استبداد سے پیدا شدہ جذبہ اشتعال اور نفرت و انتقام کی آتشیں چنگاریوں کو شعلہ بداماں ہونے سے نہیں روکا جاسکتا اور فاتحانہ سفاکی اور درندگی و ہیبت کی وجہ سے انتہائی قلیل عرصہ میں فاتحانہ جلال کے فلک بوس قصر زمین پر آ رہے ہیں۔ جب ہم

مشہور فاتحین کی فقید المثال فتح مندویوں اور فاتح اقوام کی کار فرمایوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقائق واضح و آشکار ہوتے ہیں کہ فاتح میں شان رحمت کے مفقود ہونے اور کامران اقوام کی سفاکیوں کے باعث بہت جلد عظمت فتح کا پرچم پارہ پارہ ہو جاتا ہے اولاد آدم کے اولین عہد عظمت میں اقوام مشرق کی داستان عروج و زوال کے مطالعہ سے واضح ہے کہ دارائے ایران کی عظیم کشور کشائیاں ہوں، سکندر اعظم کی ذی شان کامرانیاں ہوں یا فاتحین چین کی وسیع فتوحات ہوں۔ فارس روم کا جبر و تشدد ہو یا اہل چین اور آریائی قوموں کی استبدادیت ہو۔ اس نے فاتحین کے ایوانات عظمت و جلالت کو مسمار کر دیا ہے۔“

www.KitaboSunnat.com

”لیگ آف نیشنز کے بعد عالمی جنگ کی غارتگری، انسانی حقوق کے چارٹر اور اس کے بعد ہمارے اس دور میں اقوام متحدہ کی موجودگی میں کوریا کی خونریزی، اسکندریہ پر بمباری، فلسطین میں اسرائیلی ہیبت، افریقہ میں الجزائر اور کالگو کی لرزہ خیز خون آشامیاں، کشمیر میں بھارت کا جبر و استبداد اس حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں کہ موجودہ دور کی طاقتور حکمران قومیں تعلیمات محمدیہ سے غافل ہیں اور اس غفلت کے باعث دنیا جنم زار ہوتی جا رہی ہے مساعی امن کے باوصف امن ناپید ہو گیا ہے۔“

”بلاشک اگر دنیا کے حکمران فاتح مکہ کے مقدس درس عالی پر عمل پیرا ہوتے تو اولاد آدم کے لیے یہ دنیائے ارضی بہشت بریں ہو جاتی۔ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ میں فاتحین عالم کو فقید المثال درس دے کر نوع انسان پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اور آج بھی صرف یہی طریق محمدی امن عالم کا ضامن ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قدیم ترین دشمنوں، قتل کی سازش کرنے والوں اور مدینہ طیبہ پر چڑھ کر آنے والوں کو معاف کر کے اہل مکہ کے دلوں کو مسخر کر لیا اور مفتوح قوم میں ذرا بھی جذبہ انتقام پیدا نہ ہو سکا۔ یہی اسوۂ حسنہ آج بھی دنیا کی طاقت ور قوموں اور باختیار حکمرانوں کے لیے معیار عمل ہے۔ (ایضاً ص ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶)“

(۱۳) آخر میں ہم جارج برنارڈ شاہ کے اس تبصرہ پر اقتباسات کو ختم کرتے ہیں:-

”آنے والے سو سال میں ہماری دنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔ مگر یہ موجودہ زمانے کا اسلام نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اسلام ہوگا جو عہد محمد رسول اللہ کے زمانے میں دلوں، دماغوں اور رگوں میں جاگزیں تھا۔“ (ایضاً ص ۱۵۰)

انسان کامل

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اپنے مسلمان استاد سے کسی گفتگو کے دوران کہا کہ میں آپ کے پیغمبر ﷺ کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان سمجھتا ہوں۔ استاد نے دریافت کیا کہ تم کیسے پیغمبر اسلام کو کامل ترین سمجھتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ مجھے آپ ﷺ کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آئے جو کسی ایک انسان نے دنیا کی تاریخ میں سبھا کر کے نہیں دکھائے۔ مثلاً:-

- ☆ بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس ایسا کہ خود اپنے آپ کو بھی اپنے قبضے میں نہ جانتا ہو بلکہ اللہ کے قبضہ میں سمجھتا ہو۔
- ☆ دولت مند ایسا کہ خزانے کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آرہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر چراغ نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے سے گزر جاتے ہوں۔
- ☆ سپہ سالار ایسا کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرق آسمان فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو۔
- ☆ صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پر جوش جاں نثاروں کی ہمرکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چون و چرا دستخط کر دیتا ہو۔
- ☆ شجاع ایسا کہ ہزاروں کے مقابلے میں تنہا کھڑا ہو اور نرم دل ایسا کہ انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو۔
- ☆ با تعلق ایسا کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر بیوی بچوں کی اس کو فکر غریب و مفلس کی اس کو فکر خدا کو بھولی ہوئی دنیا کو سدھارنے کی اس کو فکر غرض سارے سنسار کی اس کو فکر ہو اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو اور اس کے سوا ہر چیز اس کے لیے بے معنی ہو۔

۱ بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ دو دو ماہ گزر جاتے ہمارے گھر میں چولہا نہ جلتا اور فقط دو کالی چیز سمجھو اور پانی پر گزر اوقات ہوتی تھی۔

۲ جنگ بدر احد کی طرف اشارہ ہے۔ صلح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے۔

۳ جنگ خین کا ایک منظر۔

- ☆ اس نے کبھی اپنی ذات کے لیے اپنے برا کہنے والوں سے بدلہ نہیں لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی اور ان کا بھلا چاہا لیکن خدا کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا۔ حق کاراستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذاب الہی سے ڈراتا رہا۔
- ☆ عین اس وقت جب اس پر ایک تیغ زن سپاہی کا دھوکہ ہوتا ہوا اور وہ ایک شب سلسلہ دار زاہد کی صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے۔
- ☆ عین اس وقت جب اس پر کشور کشاف توح کا شبہ ہو وہ تیغبرازہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔
- ☆ عین اس وقت جب ہم اس کو شاہ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔
- ☆ عین اس وقت جب اطراف عرب سے آ کر اس کے صحن مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے۔ اس کے گھر میں فاقہ کی تیاری ہو رہی ہے۔
- ☆ عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لوٹنے والے غلام بن کر بھیجے جا رہے ہیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کے چھالے اور کندھوں کے نشان دکھا کر جو چکی پیسنے اور مشکیزہ بھر کر لانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے۔ ایک غلام کی خواہش کرتی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں واپس موڑ دیتے ہیں۔
- ☆ عین اس وقت جب آدھا عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگین آچکا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ دربار نبوت میں حاضر ہو کر کا شانہ نبوت لٹکا جائزہ لیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھر دری چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں۔ جسم مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف مٹی بھر جو رکھے ہیں اور دوسری طرف پانی کا مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سب دریافت ہوتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع... ہوگا۔ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں ہیں۔“ ارشاد ہوتا ہے۔ ”عمر! کیا

۱۔ جنگ بدر کے موقع پر آپ نے ساری رات اللہ کے حضور دعا و استغفار اور تضرع میں گزار دی

۲۔ عدی بن حاتم کے ایمان لانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ یہ قیدی تیغ خیمبر کے بعد آئے۔ ۴۔ واقعہ ایلاء کے دوران جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے

تم اس بات پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت۔
(محمد رسول اللہ ﷺ ص ۱۰۹، بحوالہ خطبات مدارس از سید سلیمان ندوی بعنوان ”جامعیت“)



www.KitaboSunnat.com

تہمت بالخیر

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
1	قرآن کریم، فتح الحمید، مرآة القرآن، تفہیم القرآن، تفسیر شبیر احمد عثمانی، تفسیر مظہری، روح المعانی، تفسیر خازن، تفسیر کبیر		
2	بخاری شریف	امام محمد بن اسماعیل بخاری	
3	صحیح مسلم	امام ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری	
4	نسائی شریف	ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائی	
5	ابوداؤد	سلیمان بن اشعث جہتانی	
6	مشکوٰۃ شریف	ولی الدین محمد بن عبد اللہ	
7	مسند احمد	امام احمد بن حنبل	
8	تاریخ الامم والملوک (طبری)	حافظ ابن جریر	
9	البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر	
10	سیرت ابن ہشام		
11	کتاب الخراج	امام ابو یوسف	
12	رحمۃ للعالمین (حصہ دوم)	قاضی سلیمان منصور پوری	شیخ غلام علی ایڈیٹر سنز اراہور

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
13	سیرۃ النبی (حصہ اول و پنجم)	شبلی نعمانی	ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور
14	الفاروق	شبلی نعمانی	مدینہ پبلشنگ کمپنی، ہند روڈ، کراچی
15	الجہاد فی الاسلام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلیکیشنز، لاہور
16	محسن انسانیت	نعیم صدیقی	اسلامک پبلیکیشنز، لاہور
17	رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر حمید اللہ	
18	The Battle Fields of Prophet Mohammad	ڈاکٹر حمید اللہ (پی ایچ ڈی ڈی ڈی لٹ لندن)	حذیفہ پبلیکیشنز، آرام باغ، کراچی
19	رسول اللہ ﷺ میدان جہاد میں	احسان بی اے	پاک پبلشرز لمیٹڈ، کراچی
20	مسلمانوں کا نظام حکمرانی (اردو ترجمہ)	ڈاکٹر حسن ابراہیم (پی ایچ ڈی ڈی ڈی لٹ لندن)	اشاعت لمیٹڈ، کراچی
21	اسلام اور قانون جنگ و صلح	مجید خدوری (اردو ترجمہ)	مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور
22	جہاد	غلام رسول مہر برگینڈیر گلزار احمد	مکتبہ الحقار گلستان کالونی راولپنڈی
23	غزوات مقدس	مولانا عنایت اللہ وارثی	مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار لاہور
24	رہبر کامل	مولانا عبدالحجید سوہدروی	مسلمان کمپنی سوہدرہ، ضلع گوجرانوالہ

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	پبلشر
25	ہسٹری آف یورپ (حصہ اول)	پروفیسر شمس الدین	نذر سنز لاہور کراچی
26	تاریخ ملت (جلد ششم، حصہ دوم)	مفتی انتظام اللہ شہابی	ندوۃ المصنفین دہلی
27	ماہنامہ محدث (رسول مقبول نمبر)	چند متعلقہ مضامین	ماڈل ٹاؤن لاہور
28	انسائیکلو پیڈیا (اردو)		فیروز سنز لمیٹڈ لاہور
29	عالمی معلومات	زاہد حسین	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور
30	سرور کونین ﷺ اغیار کی نظر میں	بشیر احمد سعید	کتاب مرکز بازار فاروق گنج، گوجرانوالہ
31	محمد رسول ﷺ اللہ غیر مسلموں کی نظر میں	محمد حنیف یزدانی	مکتبہ نذیریہ لاہور
32	انسان کامل	ڈاکٹر خالد علوی	یونیورسٹی بک ایجنسی

اور دیگر متفرق کتب

www.KitaboSunnat.com



مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر تصنیفات

تیسیر القرآن (اردو): سلفی منہج کے عین مطابق، منکرین حدیث اور دیگر عقائد باطلہ کا مکمل رد، اور تمام آیات کی صحاح ستہ کی صحیح احادیث کی روشنی میں تفسیر۔ (4 جلدیں)

مترادفات القرآن: مترادفات القرآن کے ذیلی فرق کو مستند کتب لغت اور قرآنی آیات سے واضح کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن کریم کی اردو میں پہلی لغت ہے۔

آئینہ پرویزیت: پرویزیت کے جواب میں ایک مدلل اور لا جواب کتاب ہے۔

شریعت و طریقت: تصوف کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، نیز وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کیا ہے؟ اور طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متضاد ایک الگ دین ہے؟

الشمس والقمر بحسبان: اس کتاب میں علم ہیئت، ہجری اور عیسوی تقویم میں دن معلوم کرنے کے طریقے اور 622ء (1ھ) سے لے کر 2522ء (1680ھ) تک کی تقابلی تقویم پیش کی گئی ہے۔

خلافت و جمہوریت: جمہوریت عصر حاضر کا سب سے بڑا ثابت ہے۔ کتاب وسنت سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں جن میں اتحاد ناممکن ہے۔

تجارت کے احکام و مسائل: لین دین کے معاملات میں کئی ایسے امور شامل ہو گئے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اکل حلال کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دور حاضر کے جدید معاشی مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں محاکمہ کیا گیا ہے۔

عقل پرستی اور انکار معجزات: قرآن مجید میں مذکور معجزات کا عقل کی بنیاد پر رد کرنے والوں کی تاویلات اور ان کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔

عذاب قبر اور سماع موتی: متعلقہ موضوع پر نہایت اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے افکار و نظریات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

احکام ستر و حجاب: اس کتاب میں تہذیب حاضر کا پس منظر، ستر و حجاب کا فرق، چہرہ اور ہاتھوں کا پردہ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات پر بحث کی گئی ہے۔

اسلام میں دولت کے مصارف: اس میں زائد از ضرورت دولت کی جائز اور ناجائز صورتیں نیز جاگیر داری کی کہاں تک گنجائش اور مزارعت کن صورتوں میں جائز ہے، کی تفصیل ہے۔

ناشر: مکتبہ اسلامیہ
سٹریٹ 20 دکن پورہ لاہور
فون: 7280943